لن ینال اللہ جل حکمہ ابدا

وسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیا

۱۹۷۴ء

تذکرہ
مولانا محمد ادریس کاندھلوی

محمد میاں صدیقی

ناشر

مکتبہ عثمانیہ، جامعہ اشرفیہ فیروزپور روڈ۔ لاہور

لقد قال اللہ جل حکمتہ ابداً

وسلام علیہ یوم ولد و یوم یموت و یوم یبعث حیاً

۱۹۷۴ء

محمد میاں صدیقی

ناشر

مکتبہ عثمانیہ جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ ۔ لاہور

تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

مصنف	مولانا محمد میاں صدیقی
طابع	اللہ والا پریس شارع قائداعظم لاہور
کاتب	احفاظ الرحیم
طبع اول	شعبان ۱۳۹۶ھ جولائی ۱۹۷۶ء
تعداد اشاعت	ایک ہزار ۱۰۰۰
قیمت	۲۰/= بیس روپے
ناشر	مکتبہ عثمانیہ جامعہ اشرفیہ لاہور

قطعہ

علم میں تھے شاہ انورؒ فکر میں اشرف علیؒ
اللہ اللہ کیا شئوں تھے حضرتِ ادریسؒ میں

درس قرآن میں وہ بیضاوی پہ سبقت لے گئے
علم کے دریا رواں تھے آپ کی تدریس میں

انیس احمد صدیقی انیس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ
فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا
وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

اے

آسمانوں اور زمین کے بنانے والے، تو ہی میرا
کارساز ہے۔ دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی، تو
(اپنے فضل وکرم سے) ایسا کیجیو کہ دُنیا سے جاؤں،
تو تیری فرماں بردار کی حالت میں جاؤں، اور
اُن لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک
بندے ہیں۔

عکس تحریر مولینا کاندھلوی

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ

وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ

اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ

الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا

لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ

حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا

عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ

عکسِ تحریر مولانا کاندھلوی

لطائف و معارف

اس آیت سے حضرت ابو بکر صدیق کی جو فضیلت نکلتی ہے

وہ بالکل نمایاں ہے واقعی واقعۂ غار میں انکی جان نثاری قابل صد

آفرین ہے یارِ غار کی مثل جو دنیا میں مشہور ہے وہ یہیں

سے چلی ہے حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ابو بکر مجھے صرف غار

کی فضیلت دیدیں اور مجھ سے تمام عمر کی عبادت اور نیکیاں لیں

تو میں اس پر راضی ہوں

امت مرحومہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس وقت آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غار صرف حضرت صدیق تھے

حتیٰ کہ مخالفین بھی اس کے مقر اور معترف ہیں بس یہ ایک

ایسی فضیلت ہے جو حضرت صدیق کی شانِ عظمت کو واضح کر رہی

اور اگر عند اللہ آپکو شرف قبولیت حاصل نہ ہوتا تو آپکی اس فضیلت

عنوانات

والدِ مرحوم کے نام

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم، بہارِ باغِ توام

برادران و پسران

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

مولانا حافظ محمد اسماعیل کاندھلویؒ کے صاحبزادگان

(۱) حافظ محمد جمیل

(۲) مولانا حافظ محمد ادریس

(۳) مولوی حافظ محمد انیس

(۴) مولوی حافظ محمد موسیٰ

(۵) مولوی محمد ایوب

(۶) مولوی زبیر الاسلام

دختران

(۷) امت اللہ

(۸) سعیدہ

(۹) مسعودہ

(۱۰) صالحہ

کے صاحبزادگان

۱ - مولوی حافظ محمد نعمان

۲ - مولانا حافظ محمد مالک

۳ - مولوی حافظ محمد میاں صدیقی

۴ - مولوی قاری محمد عثمان

۵ - مولوی قاری محمد عمران

۶ - مولوی قاری محمد احمد

دختران

(۷) عائشہ بیگم

(۸) صادقہ بیگم

---

(۱) صاحبزادگان کے متعلق انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں مختصر تعارف پیش کیا جائے گا۔ ۱۲ منہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

جو تذکرہ مطالعے کے لئے آپ کے ہاتھوں میں ہے، وہ کسی پیغمبر کا تذکرہ نہیں ایک عالمِ دین کا تذکرہ، اور سوانحی خاکہ ہے۔ اور پھر وہ بھی ایک ایسی سیدھی سادی شخصیت کا جس نے اپنی زندگی کا پورا سفر ہم میں، آپ میں، اور عام لوگوں میں طے کیا، گم نام پہاڑوں اور جنگلوں میں اس نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہیں گزارا، ہم سے، اور آپ سے اس کی زندگی کا کوئی گوشہ مخفی اور اوجھل نہیں ۔ اس کی علمی، عملی، خانگی، اور عوامی زندگی پہ کوئی دبیز پردہ نہیں۔ چند ہفتے، یا زیادہ سے زیادہ چند مہینے پہلے تک ہمارے درمیان اس نے اپنی زندگی کا سفر پورا کیا۔

وہ میرے والد تھے، استاد تھے، مربّی تھے، میری تمام تر ذہنی اور علمی تربیت اُنہی کی رہینِ منت، بلکہ اُنہی کی دعاؤں کا صدقہ ہے ۔ ان دعاؤں کا جو وہ رات کے بے کراں سناٹے میں اپنے خدا کے حضور اِس طرح دامن پھیلا کر مانگا کرتے تھے جیسے حقیقت میں کوئی چیز ابھی بارگاہِ الٰہ سے ان کے ہاتھوں میں آن گرے گی۔

عام طور پر لوگ معروف شخصیتوں کے تذکرے لکھتے ہیں مگر تذکرہ لکھتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک فرد، اور ایک شخص کی زندگی کو ان لوگوں کے سامنے پیش کرنا، اور اُس کے سوانح زندگی سے آگاہ کرنا ہے جنھوں نے براہِ راست اس کو نہیں دیکھا، اُس کے اعمال و افعال اُن کی نظر سے اوجھل ہیں، وہ اس کا ایسا سراپا تیار کرتے ہیں جس کا عملی زندگی سے تعلق بہت کم ہوتا ہے۔

بہت زیادہ پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں، گزشتہ دس پندرہ سال میں لکھی جانے والی بعض حضرات کی سوانح عمریاں میرے سامنے ہیں، اُن حضرات کو دیکھنے، جاننے، اور پہچاننے والے لاکھوں افراد موجود ہیں، وہ شخصیتیں نہ قبلِ اسلام کی ہیں اور نہ قبلِ مسیح کی، اِسی دور، اِسی عہد، اور اسی صدی کی ہیں۔ لیکن انھیں پیش کرنے کا انداز ہرگز ایسا نہیں جیسے وہ اِسی ماحول، اور اسی معاشرے کے ایک فرد ہوں، انھوں نے اِسی دَور میں زندگی گزاری، لوگوں سے معاملات کیئے، کچھ لوگوں سے استفادہ کیا، کچھ کو فائدہ پہنچایا، اُن کے اساتذہ بھی تھے، شاگرد بھی، علم و عمل اور تقویٰ میں ان سے بڑھ کر بھی لوگ تھے، اور ان کے ہم پلّہ بھی، مگر تذکرہ نگاروں نے کہیں انھیں صدّیقیت کے مقام پر فائز کیا، کہیں فرشتے کے رُوپ میں پیش کیا، اور کہیں ان کے لیے پیغمبرانہ عظمتیں ثابت کرنے کی کوشش کی۔

نہ جانے یہ رواج کیوں ہو گیا کہ جب کسی عالمِ دین اور بزرگ کا تذکرہ لکھتے ہیں تو ان حقائق کو پیش کرنے سے گریز کیا جاتا ہے جو اس کے پورے عرصہ حیات میں بکھرے ہوئے ہیں، اور جن کے بغیر اس کی زندگی ایک متحرک اور عامل انسان کی زندگی نہیں کہلا سکتی۔ حقائق، واقعات اور واردات کو اس کی ذات سے نوچ لیا جاتا ہے اور تمام تر کوشش اس بات پر مرتکز ہو جاتی ہے کہ مافوق الفطرت باتیں اس کی ذات میں ثابت کی جائیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے ایک مرید نے ان سے پوچھا تھا کہ: حضرت بارہ برس آپ کی خدمت میں ہو گئے مگر آج تک آپ کی کوئی کشف و کرامات نہیں دیکھی۔ ۔ تو جنید بغدادیؒ

نے اس کو یہ جواب دیا تھا : یہ بتاؤ کہ میرے اعمال و افعال میں کوئی بات اسوۂ رسول کے خلاف تو نہیں دیکھی ۔ !

حقیقت میں مؤمن کی معراج یہی ہے کہ اس کی زندگی اسوۂ رسول کے مطابق ہو۔

بلاشبہ سیرت نگاری کا یہ ایک مایوس کن پہلو ہے، آپ زیر نظر تذکرہ کو پڑھیں گے تو یقیناً محسوس کریں گے کہ اس میں اس طرح کی کاوشیں نہیں کی گئیں، اُن سے ملنے والے، تعلق رکھنے والے، محبت کرنے والے، اختلاف رکھنے والے، اور معاملات کرنے والے موجود ہیں۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے، اِن حضرات نے وہ سب کچھ دیکھا ہوگا، سمجھا ہوگا۔

میں جو کچھ بھی ہدیۂ قارئین کر رہا ہوں وہ سب والد مرحوم کی تصانیف، تالیفات، رسائل تقاریر، اور خطوط سے ماخوذ و مستنبط ہے۔ کوئی بات بے حوالہ نہیں کہی گئی، اور نہ سُنی سنائی باتوں پر محل تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اجمال و اختصار کے لئے معذرت خواہ ہوں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ والد مرحوم نے نصف صدی میں جو کچھ، اور جتنا کچھ علمی و دینی کام کیا ہے، اس پر لکھنا، اس کا مکمل تعارف کرانا، یہ چند مہینوں کا کام نہیں، اس کے لئے وقت، اور فرصت دونوں کی ضرورت ہے۔

یہ مختصر تذکرہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے، اس کے بعد میں ایک ایسے تذکرے کی ترتیب کا آغاز کروں گا جس میں ان کی علمی، اور عملی زندگی کا مفصل تعارف ہوگا۔

میں نے اس بات کی بھی بھرپور کوشش کی ہے کہ والد صاحب کے ساتھ مختلف تحریکوں اور مختلف علمی و تبلیغی مشاغل کے ضمن میں جن حضرات کا ذکر آیا ہے، ان کی خدمات کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا جائے۔ صرف صاحب تذکرہ کو "ہیرو" بنا دینا، اور تمام تحریکوں، اور مہموں کا مرکزی نقطہ اسی کو قرار دینا، علمی مداہنت کے مترادف ہے۔

والد مرحوم کے اساتذہ، اور ہم عصر علماء کا اجمالی تعارف بھی اس میں نہ آسکا، صرف اُن کے ذکر پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن اس غیر معمولی اجمال و اختصار کے باوجود ان کا جو علمی رتبہ تھا، یا ہے،

اُسے پورے طور ملحوظ رکھا گیا ہے۔

میں زیر نظر تذکرے میں ملحوظ چند بنیادی باتوں کی نشان دہی کر رہا ہوں، اب اس امر کی تصدیق قارئین کے ہاتھ ہے کہ میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔!

بہر حال جس خدائے بزرگ و برتر نے یہ چند صفحے لکھنے کی توفیق بخشی ہے، وہ ایک جامع اور ضخیم تذکرہ ترتیب دینے کی بھی ہمت عطا فرمائے گا۔

کلماتِ طیّبات

از : الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

یہ جو بھائی ادریس کا حادثہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی ایک گھرانے کا صدمہ نہیں بلکہ تمام علمی حلقوں کا صدمہ ہے، ہر ایک نے اسے محسوس کیا، دارالعلوم میں جب اس کی اطلاع پہنچی تو تمام طلبہ، اور اساتذہ پر غم کا ایک اثر ہوا، اسی وقت سب جمع ہوئے جلسہ کیا، ایصالِ ثواب بھی کیا، جہاں تک میرا تعلق ہے، یہ واقعہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے سے میرا ان سے جو ربط تھا، اور ان کا میرے ساتھ، وہ بہت غیر معمولی تھا، بہت ہی زیادہ محبّت، خلوص اور تعلق، ان کے یہاں آنے کے بعد بھی وہی تعلّق باقی رہا، بلکہ پاکستان آنے میں ایک مستقل خوشی کا پہلو ہوتا تھا کہ بھائی ادریس سے ملاقات ہوگی۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ موت تمام غموں، اور الموں کا نچوڑ ہے۔ اگر ہمارے تمام غموں کو یکجا جمع کیا جائے تو ان کی شکل موت ہی کی ہوگی، بہرحال موت ایک عظیم چیز ہے لیکن جہاں موت عظیم چیز ہے، اور دلوں کو دُکھا دینے والی ہے وہیں اس میں نعمت کے پہلو بھی ہیں، حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے "الموت تحفۃ المومن" موت مومن کا

تحفہ ہے، تو تحفہ، اور وہ بھی من اللہ تحفہ ظاہر ہے کہ اس کی عظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے اور وہ صرف ایک تحفہ ہی نہیں بلکہ ولایت کی بھی علامت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں یہود کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: قل یا أیھا الذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیاء للّٰہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین۔

تو تمنائے موت حقیقت میں ولایت کی علامت ہے، اور اس لئے ہے کہ حق تعالیٰ نے ایک تحفہ بتایا ہے۔ اور ولایتِ کاملہ والے زندگی کے بجائے موت کو زیادہ پسند کرتے ہیں، جس کی وجہ دوسری حدیث میں یہ بیان کی گئی: ان الموت جسر یصل الحبیب الی الحبیب، موت ایک پل ہے جو محبوب کو محبوب تک پہنچا دیتا ہے۔ تو جہاں موت میں غم و الم کے پہلو ہیں، وہاں اس میں خوشی کا پہلو بھی ہوتا ہے کہ مرنے والا اپنے محبوبِ حقیقی کے پاس چلا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے موت، خوشی کی بھی چیز ہوئی۔

ہر چیز میں اس کی ابتدا بھی قابلِ مسرت ہوتی ہے، اور انتہا بھی قابلِ مسرت ہوتی ہے۔ ولادت پر خوشیاں مناتے ہیں کہ یہ آغاز ہوتا ہے زندگی کا، موت بھی خوشی کی چیز ہے کہ اس سے اتمام ہوتا ہے نعمتوں کا۔ اس لئے کہ موت قاطع نہیں ہے۔ بلکہ متمم ہے جس حالت پر موت آتی ہے وہ حدِ کمال ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر موت کا غم کیوں کرتے ہیں۔؟ حقیقت یہ ہے کہ موت پہ کسی کو غم نہیں ہوتا، موت اگر اچھی ہو تو عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ خدا سب کو ایسی موت نصیب کرے۔ اگر موت غمی کی چیز ہوتی تو اس کی دعا کیسے کرتے۔ کسی کا انتقال ہو گیا، جمعہ کے دن، ماہِ رمضان میں، شبِ قدر میں۔ تو خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ بڑی اچھی موت ہے، موت کی جستجو کوئی غم کی چیز نہیں، اس لئے کہ اگر بندہ اللہ سے جا ملے تو یہ کونسی غم کی بات ہے جس پہ آدمی رنجیدہ ہو۔ اگر آدمی دنیا کے غموں سے آزاد ہو جائے تو خوشی کی بات ہے کہ وہ تمام خرخشوں سے چھوٹ کر پاکیزہ زندگی میں پہنچ گیا۔

موت سے اصل میں غم ہوتا ہے اس بات کا کہ ایک عزیز ہم سے جدا ہوگیا؛ اس کا رشتہ ہم سے ٹوٹ گیا۔ ایک فیض ہم سے منقطع ہوگیا۔ یہ موت کا غم نہیں، ایک عزیز کی مفارقت کا غم ہے۔

آج بھی جو ہم اپنے بھائی کا غم کر رہے ہیں، وہ درحقیقت ان کی جدائی کا غم ہے موت نے تو اُن کو بہت اُونچے مقام پر پہنچا دیا، دنیا سے کہیں زیادہ بلند مقامات اُنھیں ملیں گے۔

عالم، عالم ہونے کے ساتھ تقی، نقی، محدث، مفسر، جتنے علوم دینیہ ہیں اللہ تعالیٰ نے انھیں اس میں کمال عطا کیا تھا، اور وہ کمال رات دن کی مزاولت سے ان کی رُوح میں پیوست ہو چکا تھا، خود ان کی رُوح باکمال تھی، اور پاکیزہ رُوح کا وہاں بھی خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ ہر مؤمن کو کہا جاتا ہے: "اُخرجي أيتها النفس الطيبة كانت في الجسد الطيب اخرجي الى روحٍ وريحان وربٍّ غير غضبان"
تو جب عامۂ مؤمنین کے لئے یہ بشارت ہے تو خاصۂ مؤمنین کے لئے کتنی عظیم بشارت ہوگی۔

خدا نے اُنھیں دنیا میں بھی مقبولیت دی تھی، اور اپنے ہاں بھی انشاء اللہ مقبولیت ہی سے نوازے گا۔ غم ہے ہمارا کہ ہم سے بڑا فیض منقطع ہوگیا، ایک بڑی شخصیت ہم سے جدا ہوگئی۔ اور ہمارا یہ غم والم ہماری خود غرضی پر مبنی ہے، وہ غرض خواہ محمود ہی کیوں نہ ہو۔ تو درحقیقت ہمیں ایک عزیز کے جدا ہونے، اور اپنے اغراض و مقاصد کے فوت ہونے کا صدمہ ہے۔
امام محمد رحمہ اللہ کو ان کی وفات کے بعد کسی عارف باللہ نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا؛ حضرت مرنے کے بعد کیا گزری۔؟

فرمایا: دنیا میں علماء موت سے ڈراتے رہتے تھے کہ بڑی سخت چیز ہے، بڑی سخت چیز ہے۔ میں تو فقہ کا ایک مسئلہ سوچ رہا تھا، سوچتے سوچتے یہاں آپہنچا۔ کچھ خبر نہیں موت

کیسے آئی ؟ دوسری بات یہ فرمائی کہ : حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا، اور فرمایا : اے محمد! اگر مجھے بخشنا نہ ہوتا تو اپنا علم تیرے سینے میں کیوں ڈالتا !

گویا علم ڈالنا علامت ہے اس کی کہ اُسے بخش دیا جائے گا۔

حق تعالیٰ شانہ نے اُن کے سینے میں اپنا علم ڈالا، اور علم کے ساتھ آثارِ خشیت، تقویٰ طہارت عطا کئے۔ تو ایسا علم جو عمل کے ساتھ مقرون ہو، یہ ذریعہ ہے مقبولیت کا کہ اللہ تعالیٰ وہاں بھی مقبولیت سے نوازیں گے۔ لیکن جتنا بڑا ان کا علم و کمال تھا، اتنا ہی ہم لوگوں کو غم ہے کہ اس کمال سے محروم ہو گئے۔ یہ جدائی کا صدمہ ہے، اور رہے گا۔ جب کوئی بڑی شخصیت اٹھتی ہے تو برسہا برس تک ہر موقع پر یاد آتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اہلِ علم اہلِ کمال مرتے نہیں، جب ان کے آثار موجود، ان کا علم موجود، ان کا کمال سامنے، وہ درحقیقت ایک دوسرے روپ میں زندہ ہیں، اور ہماری تربیت اور رہنمائی کر رہے ہیں۔ اہل اللہ مرتے نہیں، اوجھل ہو جاتے ہیں۔

میں نے طالب علمی کے زمانے میں حضرت نانوتوی کا مرثیہ کہا تھا، اس کے دو اشعار یاد ہیں۔!

نہ موت است ایں کہ دانی، بل وصال است
کہ نزدِ عاشقاں افزوں کمال است
وگرنہ موتِ کامل ارتحال است
کہ از جائے بجائے انتقال است
کہ خورشیدے است زیرِ ابر پیدا
بگیتی روز روشن جاں بہ ہر جا

ان کے علم کی روشنی آج بھی موجود ہے، انھوں نے اپنے ورثے میں جہاں بحمد اللہ سعادت مند اولاد چھوڑی ہے، وہاں ان کا سب سے بڑا اثر کہ ان کی کتابیں اور اُن کی تصانیف ہیں، جن کی روشنی دنیا کو ہمیشہ منور کرتی رہے گی، حق تعالیٰ نے ان کو توفیق بخشی تھی

ان کو موفّق بنایا تھا، ان کی تمام تصانیف میں آثارِ توفیق نمایاں ہیں، تفسیر لکھی تو وہ بہترین، حدیث کی شرح لکھی تو وہ بہترین، باطل کا رد کیا تو وہ بہترین۔ غرض دین کے جتنے شعبے ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے ان سے خوب کام لیا۔ ان کو موفق بنایا، میسّر بنایا، توفیق بھی دی، اور کام بھی آسان کر دیا۔

جب میں یہاں ان کے پاس حاضر ہوتا، غالباً یہی کمرہ تھا، میں دیکھتا دو دو، تین تین ریک رکھے ہوئے ہیں، ہر طرف کتابیں پھیلی پڑی ہیں، میں کہتا: ارے بھائی ادریس! تم نے کیا کر رکھا ہے؟ کہنے لگے: "کل جدید لذیذ" ایک ڈیسک پر بیٹھتا ہوں، اتنے میں پہلے کی طرف رغبت ہو جاتی ہے، میں نے کہا! رات دن تم اسی چکر میں رہتے ہو، ادھر سے ادھر، اُدھر سے اِدھر، میری اُن سے بہت بے تکلفی تھی۔ وہاں دارالعلوم کے زمانے میں بھی میرا یہ معمول تھا کہ ہر جمعرات کو مغرب کے بعد ان کے مکان پر جاتا، میرے لئے خاص طور پر چائے بناتے، کئی کئی گھنٹے مجلس رہتی، باتیں یہی ہوتیں علمی۔

بہر حال قدرتی طور پر اس دیرینہ رفاقت کی وجہ سے جتنا صدمہ دل پر ہوا وہ بہت ہے۔ سبھی اہلِ علم نے اُسے محسوس کیا۔ حق تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے۔ آمین

حضرت قاری محمد طیّب صاحب دامت برکاتہم مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۷۵ء کو لاہور تشریف لائے۔ جس کمرے میں قبلہ والد صاحب مطالعے میں مصروف رہتے تھے، اسی کمرے میں قاری صاحب نے یہ انٹرویو ریکارڈ کرایا جسے ناچیز راقم بطور مقدمہ شامل کر رہا ہے۔!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از حضرت مولٰنا محمد مالک کاندھلوی
شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

اس صدی کے مایہ ناز شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تمام زندگی ہی علم اور دین کی خدمت میں گزری علوم اسلامیہ میں شغف وانہماک، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ہمیشہ سرمایہ حیات رہا۔ دُنیائے اسلام اُن کی علمی عظمت و منقبت سے پوری طرح واقف ہے، جس زمانے میں اپنی مشہور و معروف کتاب اَلتَّعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح طبع کرانے کے لیے دمشق تشریف لے گئے۔ اور وہاں ایک سال قیام فرمایا تو شام وعراق اور مصر کے اکابر عُلماء نے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا، اپنی تحریرات میں خصوصیت کے ساتھ اعتراف کیا کہ آپ عرب وعجم کے ایک مایہ ناز محدث و مفسر ہیں تفسیر و حدیث اور علم کلام میں آپ کی گرانقدر تصانیف اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہر فن میں آپ کا مقام بہت بلند تھا، لیکن اپنے شیخ و مربی حضرت حکیم الاُمۃ مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح تفسیر قرآن کریم اور علوم کتاب اللہ کی شرح و تحقیق کا رنگ سب پر غالب تھا، اسی جذبے اور شوق میں تفسیر معارف القرآن شروع فرمائی جو اپنے موضوع پر ایک بے مثال تفسیر ہے اور تمام متقدمین کے علوم و معارف قرآن کا ایک جامع خزانہ ہے، دورانِ تالیف ہی سلسلہ طباعت شروع فرما دیا، اخیر حیات میں ضعف و نقاہت کی کوئی حد نہیں رہی تھی، حتیٰ کہ اُٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہ تھی، لیکن اس ضعف کے باوجود تفسیر کا سلسلہ تالیف برابر جاری رہا، دن رات یہی فکر تھا کہ کسی طرح تفسیر مکمل کروں، وفات سے کچھ عرصہ قبل جب ایک مرتبہ ناچیز رمضان المبارک میں عمرہ کے لیے جارہا تھا تو مکتوب گرامی میں والہانہ انداز میں تکمیل تفسیر کے لیے دُعا کا ذکر فرماتے ہوئے یہ الفاظ تحریر تھے۔

"میرا دل ازحد پریشان ہے، سوائے تفسیر کے کسی چیز میں دل نہیں لگتا اس لیے سب سے فارغ اور یکسو ہونا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تفسیر اور شرح بخاری کو جلد مکمل فرما دے اور ان کی طباعت کا غیب سے انتظام فرما دے"

اس نوع کا والہانہ جذبہ اور شغف کسی ایک فن ہی کی ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ یہ جذبہ وتدریس وعظ وارشاد دعوت وتبلیغ اور تصنیف وتالیف کے ہر شعبہ میں نمایاں اور کارفرما تھا۔ زمانۂ علالت میں جب بھی ذرا افاقہ محسوس کرتے یہ سلسلے شروع فرمادیتے۔ اس حالت میں کر چند قدم فاصلہ طے کرنا بھی مشکل ہو چکا تھا، صحیح بخاری شریف کا درس چھوڑنا گوارا نہیں فرمایا۔ اسی زمانے میں جب ایک مرتبہ میں کراچی سے لاہور فون پر خیریت معلوم کر رہا تھا۔ اگرچہ خود کبھی بھی کسی سے فون پر بات نہیں فرماتے تھے لیکن یہ معلوم ہونے پر کہ محمد مالک بات کر رہا ہے فون پر خود تشریف لاکر بات فرمانے لگے۔ میں نے جب یہ عرض کیا کہ ایسی تکلیف میں درس بند کردیں، تو فرمایا بیٹے! بخاری کا درس بند کرنا تو اس تعب اور مشقت سے بھی زیادہ ہے۔ الغرض جس پیکر علم کی زندگی کے تمام لمحے علوم اسلامیہ کی خدمت میں مصروف تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے رب کی ملاقات کا اب دل سے مشتاق اور اس کا منتظر ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ ۱۲ رجب ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء کی صبح بعد نماز فجر داعی رب کو لبیک کہتے ہوئے عالم آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلٌّ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔

گویا اس ماہ رجب میں اتوار کا یہ دن وہ تھا کہ جبکہ ایک اور سورج طلوع ہونے کے قریب تھا تو علم وفضل اور رشد وہدایت کا معنوی آفتاب طالبانِ علم کی نظروں سے غائب ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ صدمہ صرف ہم بھائیوں اور عزیزوں ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ رنج والم اور اندوہ حزن کا یہ پہاڑ کل علماء طلباء اور علم دوست حضرات کے قلب ودماغ کو مجروح کردینے والا تھا۔ وفات کی خبر لاہور ہی میں نہیں بلکہ ایک ہی گھنٹہ میں پورے ملک میں پھیل گئی اور دُور دراز سے لوگ تجہیز وتدفین میں شرکت کے لئے جامعہ کے احاطہ میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ہر ایک کی بے چینی وبے قراری اور رنج وغم کی کیفیت ناقابل بیان تھی۔ اکابر علماء یہ کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ کہ یہ حادثہ ان کے حق میں ایسا ہے کہ اس پر تعزیت وتسلی کے مستحق صرف چند افراد خاندان

نہیں بلکہ وہ سب آج ایسے ہی رنج و غم اور کرب و بے چینی کی کیفیات میں ہیں کہ ان کے مضطرب و بے چین قلوب کے لئے سامان تسکین مہیا کیا جائے، چنانچہ اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (افسوس کہ جن کو اس وقت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یاد کیا جا رہا ہے) نے ناچیز کو تعزیتی پیغام ارسال فرماتے ہوئے تحریر فرمایا تھا۔

اس حادثہ نے ایسی کمر توڑی کہ خط لکھنے کی ہمت و طاقت بھی جواب دے گئی تین دن سے مسلسل ارادہ کرتے ہوئے آج یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ مولانا مرحوم کی طویل علالت اور غیر معمولی ضعف کی خبریں عرصہ سے پریشان کر رہی تھیں۔ ہر وقت دھیان لگا رہتا تھا۔ دعا اور تمنا تھی کہ مولانا کو اللہ تعالیٰ عمر طویل بعافیت نصیب فرمائے اور افادہ خلق اللہ جو آپ کی ذات سے قائم تھا وہ اور باقی رہے اور کم از کم میری زندگی میں یہ حادثہ پیش نہ آئے۔ مگر اللہ نے مولانا کو سبّاقِ غایات بنایا تھا۔ باوجود ہمعصری اور تقریباً ہم عمری کے مولانا مرحوم علمی عملی اخلاقی تمام کمالات میں ہم سب سے سبقت لے گئے تھے، میدانِ ہستی کے قطع کرنے میں بھی وہ ہی سابق ہو گئے فللہ الامر من قبلُ و من بعد۔ وانا الیہ راجعون۔

اس عالمی حادثہ میں کون کس کی تعزیت کرے اس کا متعین کرنا آسان نہیں۔

مولانا مرحوم کا وجود پوری امت کے لئے ایک [illegible] تھا، ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا، اب اس کا پُر کرنا کس کے بس میں ہے حقیقت یہ ہے کہ اس صدمۂ جانکاہ سے ہر مسلمان بقدر ایمان و علم متاثر ہو رہا ہے۔ سبھی مستحق تعزیت ہیں۔"

اسی طرح حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (جن کو اس وقت دامت برکاتہم کے ساتھ یاد کیا جاتا تھا لیکن افسوس کہ ان کا سایۂ عاطفت بھی اٹھ چکا) حضرت والد مرحوم کی خبر وفات سنتے ہی بیقرار ہو گئے۔ ناچیز کے نام اپنے پہلے مکتوب میں فرمایا میں مولانا مرحوم کے انتقال پر

ملال کی خبر سُن کر سناٹے میں آگیا۔ اور دیر تک اناللہ وانا الیہ راجعون کا تکرار کرتا رہا۔ مولا مرحوم ان جید علماء باعمل میں سے تھے جن پر ان کے اساتذہ کو فخر ہے۔ حضرت عثمانی نے فرط جذبات میں نظم کر کے بھیجا، جو حضرت عثمانی کے رنج وغم اور حزن وملال کی پوری ترجمانی کر رہا ہے:

قد کنت ارجوان تکون خلیفۃ   لدراسۃ الآثار والقرآن

ولکن رحلت الی الجنان بعجلۃ   وترکت اھلک فی البکا لزمان

قد کنت بحرا فی العلوم باسرھا   ولانت حقا عارف ربانی

قد کنت بدر الغیاھب ماحیا   ولانت نجم راجم الشیطان

یعنی میں تو یہ امید کرتا تھا کہ تم میرے بعد میرے جانشین رہو گے۔ احادیث وقرآن کے درس کے لیے، ؂ لیکن تم رحلت کر گئے جنت کی طرف جلدی ہی۔ اور ایک عرصہ دراز کے لیے اپنے گھر والوں کو گریہ وبکاء میں چھوڑ گئے۔ ؂ بے شک تم تمام علوم میں ایک عظیم سمندر تھے اور بلاشبہ تم عارف ربانی تھے۔ یقیناً تم رعلم ورشد کے بدر کامل تھے، جہالت کی تاریکیوں کو مٹانے والے اور بے شک تم ایک ستارہ تھے جو شیطان کو رجم کردینے والا ہو۔

حضرت عثمانی نے فرط محبت وعقیدت جس جذبہ سے اس مرثیہ کو شروع کیا اس کا یہ پہلا شعر ہی پوری پوری ترجمانی کر رہا ہے۔

ادریس لاتبعد فذکرک خالدٌ   والذکر للانسان عمر ثان

یعنی اے ادریس تم ہم سے جدا اور دور نہیں ہو رہے ہو کیونکہ تمھاری یاد اور ذکر ہمیشہ رہنے والا ہے اور انسان کا ذکر ہی درحقیقت اس کی دوسری زندگانی ہے۔

اس شعر کو دیکھتے ہی خیال پیدا ہوا کہ علم وفضل کے اس عظیم پیکر کی سوانح حیات لکھوں اپنے اس خیال کا جب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اظہار کیا تو مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جوابی مکتوب گرامی میں اس ارادہ اور عزم کی توثیق فرماتے ہوئے تحریر فرمایا۔

" والد ماجد حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ کی سوانح حیات لکھنے کا عزم فرمایا

مرے دل کی بات اللہ نے آپ کے دل میں ڈالی ۔ بہت ہی مبارک و مسعود ارادہ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان کی سوانح حیات ایک تاریخ نہیں بلکہ اہلِ علم کے لئے ایک ہدایت نامہ ثابت ہوگی ۔ مگر افسوس ہے کہ احقر ناکارہ اب بالکل ہی بیکار ہو چکا ہے ۔ دل و دماغ تو پہلے ہی سے جواب دے چکے تھے ۔ اب نظر بھی نہیں رہی مشکل سے چند سطور لکھتا ہوں ، حافظہ بھی غائب ہوگیا ہے ۔ ایسی حالت میں سوانح میں کچھ شرکت کی سعادت حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں ۔" ع ھ

میرے برادرِ محترم مولانا محمد ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہر مجلس اور ملاقات ہمیشہ علمی فوائد و مذکرات پر مشتمل ہوتی تھی ۔ ایک ملاقات میں مولاناؒ کا سنایا ہوا ایک سبق آموز واقعہ اس وقت یاد آگیا وہ لکھ دیتا ہوں ۔

امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے مشہور و معروف امام ہیں ۔ ان کو اعمش کہنے کی وجہ یہی تھی کہ ان کی آنکھ میں عمش کا مرض تھا جس کو ہمارے عرف میں چندھاپن کہا جاتا ہے ۔ مگر علمی کمالات کی شان یہی ہے کہ ظاہری اور جسمانی کمزوریاں سب ان کمالات کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہیں ۔ اپنے علمی کمالات کی بنا پر مرجع خلائق تھے ، لوگ دور دور سے سفر کرکے ان کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے پہنچتے تھے ۔ مولانا محمد ادریس صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ امام اعمش کی خدمت میں ایک طالب علم آیا جو پاؤں سے لنگڑا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے علم کا ذوق و شوق اس کو عطا فرمایا تھا ، یہ ہر وقت حضرت اعمش کی خدمت میں رہنے لگے ، جہاں کہیں جاتے یہ شاگرد ساتھ جاتے تھے ۔

آزاد منش لوگوں نے اس پر پھبتیاں کسنی شروع کیں ، کہنے لگے خوب جوڑی ملی ہے ، ایک چندھا ایک لنگڑا ۔ امام اعمش کو اس کی اطلاع ملی تو شاگرد کو سمجھایا کہ تم میرے ساتھ نہ رہا کرو خواہ مخواہ لوگ

ع ھ ناچیز نے اپنے مکتوب میں اس بات کی استدعا کی تھی کہ آنمحترم ہمیشہ حضرت والد صاحب سے قریب رہے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کا ایک طویل دور رفاقت کا گزرا تو آنمحترم نے جن علمی خصوصیات کو محسوس فرمایا ہو وہ کسی سے لکھوا کر ارسال فرمادیں تاکہ آنمحترم کے تاثرات کے ساتھ ان چیزوں کو اس سوانح میں مرتب کیا جاسکے تو اس پر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ نے یہ تحریر فرمایا تھا ۔

ایسے آوازے کستے ہیں۔

شاگرد نے عرض کیا۔

مَالَنَا نُوجَرُ وَیَاثَمُون ہمارا کیا نقصان ہے ہمیں تو ثواب ملتا ہے کہنے والے گنہگار ہوتے ہیں۔

امام اعمشؒ نے شاگرد کی یہ بات سن کر اپنی شان امامت کے مناسب جو جواب دیا وہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے بلکہ بہت سی ہدایتوں کا ایک باب ہے۔ ارشاد فرمایا۔

نَسْلَمُ وَیَسْلَمُوْنَ خَیْرٌ مِنْ اَنْ نُوجَرُ وَیَاثَمُوْنَ۔ کہ ہم بھی محفوظ و سالم رہیں وہ بھی گناہوں سے سالم رہیں، یہ اس سے بہتر ہے کہ ہمیں تو ثواب ملے اور وہ لوگ ہماری وجہ سے گنہگار ہو جائیں۔

درحقیقت یہ گہرے علم کا ایک باب ہے جس سے ایک ضابطہ کار کی یہ ہدایت ملتی ہے کہ صرف اپنے آپ کو گناہ سے بچالینا کافی نہیں۔ اس کو بھی رعایت چاہیئے کہ ہمارا کوئی قول فعل بلاوجہ لوگوں کے گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب نہ بن جائے۔"

حضرت مفتی صاحب نے یہ واقعہ نقل فرماتے ہوئے تحریر فرمایا مجھے یہ واقعہ سن کر بہت فائدہ ہوا اور ایسا یاد ہو گیا کہ آج تک وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں۔"

غرض ارادہ تو یہی تھا کہ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح حیات خود ہی مرتب کرنے کی سعادت حاصل کروں لیکن حضرت والد صاحب کی وفات کے بعد جامعہ اشرفیہ کے مہتمم صاحب و اراکین جامعہ کے بے پناہ اصرار، نیز حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند و حضرت مولانا محمد سلیم صاحب مکی صدر مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ اور حضرت پیرانی صاحبہ اہلیہ محترمہ حکیم الامتہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نیز دیگر حضرات اکابر کی خواہش اور تقاضوں کے باعث دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار سے لاہور حاضر ہونا پڑا۔ یہاں آنے کے بعد صحیح بخاری کے درس اور دوسرے علمی مشاغل نیز والد صاحبؒ کے مسوّدات کی

ترتیب و تکمیل میں کچھ ایسا مصروف ہوا کہ وقت نکالنا مشکل تھا۔ اس بنا پر ناچیز نے اپنے عزیز بھائی مولوی محمد میاں صدیقی بحمد اللہ تحریر و تقریر اور تصنیف کا اچھا سلیقہ رکھنے والے عالم ہیں) کو سوانح کی تالیف و ترتیب کے لئے کہا جس پر انھوں نے نہایت جامع اور گراں قدر یہ سوانح حیات مرتّب کی جس کو دیکھکر دل خوش ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ عزیز سلمہ نے بڑی محنت اور کاوش سے اس کو مرتّب کیا ہے۔ اور والد مرحوم کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو نہایت تحقیقی انداز میں پیش کیا۔ سوانح نگاری میں اکثر عقیدت و محبّت کے جذبات غالب آجایا کرتے ہیں لیکن اس سوانح کی یہ نمایاں خصوصیت سمجھتا ہوں کہ اس میں مبالغہ کا رنگ تو درکنار بلکہ بہت سی اہم تر باتیں قدرتی طور پر ایسے ہی انداز تواضع کے ساتھ تحریر میں آئیں جیسا کہ خود حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج تواضع و انکسار کا پیکر تھا۔

اس سوانح کی اہم تر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا دیباچہ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیّب صاحب کے وہ کلمات طیّبات ہیں جو حضرت موصوف نے اپنے سفر پاکستان کے دوران مکان پر تشریف لاکر بطور تعزیت فرمائے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کلمات من جانب اللہ حضرت قاری صاحب کی زبان سے اسی سوانح کی تمہید کے لئے صادر ہوئے۔

حق تعالیٰ مؤلّف موصوف سلمہ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے یہ علمی گرانقدر دستاویز مرتّب کر کے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کو الباقیات الصالحات بنا دیا اور اس طرح عقیدت و محبّت رکھنے والے حضرات کے اشتیاق و اصرار کی تکمیل کر دی جو عرصہ دراز سے جاری تھا۔

دل تو چاہتا تھا اس کی اشاعت بہت جلد ہو جائے لیکن اس طویل عرصہ میں مختلف قسم کی پریشانیاں اور دشواریاں حائل رہیں۔ ناچیز کے پاس احباب کے خطوط آتے رہے۔ میں ان سب احباب و مخلصین سے معذرت خواہ ہوں کہ باوجود ہر چند کوشش کے ان کے انتظار میں انتظار میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

اس معذرت کے ساتھ تمام احباب و مخلصین سے درخواست ہے کہ دعا فرمائیں حق تعالیٰ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ تصانیف کی اشاعت کی توفیق سے سرفراز فرمائے آمین یا رب العالمین

بندۂ ناچیز

محمد مالک کاندھلوی غفر اللہ لہٗ

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور پاکستان

۲۹ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ

وطن۔ پیدائش

"کاندھلہ"۔ ضلع مظفر نگر یو، پی میں شاہدرہ دہلی اور سہارنپور ریلوے لائن پر ایک بارونق قصبہ ہے۔ مظفر نگر سے ۳۴ میل، دہلی سے ۴۲ میل، اور سہارنپور سے ۵۴ میل ہے۔ مشرق میں نہر جمن شرقی، اور اس کے کنارے حدِ نظر تک باغوں کا سلسلہ ہے۔ جمنا ہی کے جد سے یہ علاقہ پنجاب کے ضلع کرنال سے کٹتا ہے۔ قصبہ کے جنوب اور مشرق کا علاقہ خاص طور پر بہت زرخیز ہے۔ آموں کے باغات محلوں اور آبادیوں تک پہنچ گئے ہیں۔

کاندھلہ، اگرچہ پرانا قصبہ ہے، مگر اس میں تاریخی اہمیت کی کوئی عمارت نہیں ہے۔
۔۔۔ریخی حوالوں سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمد تغلق رجب ۷۴۳ھ میں کاندھلہ کے قریب شکار کھیلنے آیا۔ اس وقت کاندھلہ بہت معمولی سا قصبہ تھا۔ حتیٰ کہ کوئی جامع مسجد بھی نہ تھی، اس نے جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ اور اس طرح اس کی ترقی کی داغ بیل پڑی۔

اکبر کے دَور میں کاندھلہ ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ جس وقت مسلمانوں کا عہدِ اقتدار ختم ہوا، اور اسکی جگہ ہند میں برطانوی استعمار نے لی تو کاندھلہ اپنی شہری آبادی کے علاوہ اکیاون دیہات پر مشتمل تھا۔

۱۸۴۷ء میں کاندھلہ کی آبادی ۶۲۰۰ نفوس پر مشتمل تھی۔ ۱۸۵۳ء میں دس ہزار ہوگئی[1] تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) کے وقت علاوہ ملحقہ دیہات کے خاص کاندھلہ کی آبادی چالیس ہزار کے قریب تھی جس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چودہ ہزار تھی۔

---

(۱)۔ کاندھلہ سے متعلق معلومات جناب ظہیر الدین ایم اے کے مقالے سے حاصل کی گئی ہیں جو انھوں نے ایم اے اسلامیات کے لئے والد محترم پر لکھا بعض، علاوہ شمارِ یو پی کے پرانے گزیٹیرز سے لئے گئے ہیں۔ جہانِ دانش سے بھی مدد لی گئی۔

سہارنپور، اور مظفر نگر کے اضلاع میں اگرچہ بعض قصبے کاندھلہ سے بڑے بھی تھے۔ مگر بارھویں، تیرھویں، اور چودھویں صدی ہجری میں جس قدر اہلِ علم و فضل اس قصبے کی خاک سے اُٹھے، وہ شرف کسی اور قصبے کا حصّہ نہ بن سکا۔

بقول جناب احسان دانش:

"کاندھلے میں متعدد شاعر بھی تھے، اور جیّد مولوی بھی، انگریزی کے فارغ التحصیل فضلا بھی، اور اصول و عقیدہ سے انگریزی کو گناہ خیال کرنے والے صاحبِ نظر بھی۔ نیز پُرانے فیشن کے وہ علما بھی جن کی علمیت کے باعث بڑی بڑی درس گاہیں اور دنیا بھر کے دار العلوم "کاندھلہ" کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ جس روشن ضمیر شاعر نے مثنوی مولانائے روم کا ساتواں دفتر لکھا، وہ بھی اسی قصبے کی خاک سے اٹھا تھا۔"[1]

مولانا عبد الحیؒ جنھیں شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی کی دامادی کا شرف حاصل ہوا، اور جو تحریکِ آزادی میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید کے دست و بازو بنے، وہ بھی اسی سرزمین سے تھے۔

اور اب اِس گئے گزرے دَور میں بھی مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، مولانا مفتی اشفاق الرحمانؒ مولانا حافظ محمد اسماعیلؒ، مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور، مولانا حکیم محمد صدیق کاندھلوی، مولانا محمد الیاسؒ بانی تبلیغی جماعت، مولانا محمد یوسفؒ امیر تبلیغی جماعت، مولانا محمد علی الصدیقی صدر دار العلوم شہابیہ سیال کوٹ، مولانا محمد مالک جیسے علماء اور فضلاء نے اسی سرزمین میں جنم لیا۔[2]

---

(۱)- جہانِ دانش۔ طبع لاہور ۱۹۷۳ء۔ ص: ۲۰۔ مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی م۱۳۳۴ھ — مولانا مفتی اشفاق الرحمٰن۔ مشہور تصانیف: الطیب الشذی شرح جامع ترمذی، شرح موطا امام مالک، م: ۱۹۵۴ء — مولانا حافظ محمد اسماعیل مؤلف: الفارق بین المنقاد و المارق مترجم شفائے قاضی عیاض و مواہب لدنیہ) م: ۱۹۴۲ء — مولانا محمد زکریا مشہور تصانیف فضائل نماز فضائل حج وغیرہ۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

نام و نسب۔ ابتدائی حالات

والد مرحوم کا تعلق ایک علمی گھرانے سے ہے۔ مفتی الٰہی بخش جنھوں نے مثنوی مولانائے روم کا تکملہ لکھا ہے، وہ ہمارے جدِّ امجد ہیں۔ اجداد میں مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا کمال الدین، مولانا حکیم شیخ الاسلام، اور حکیم محمد اشرف جھنجھانوی قابلِ ذکر ہیں۔

ہمارے دادا حافظ محمد اسماعیلؒ نے اپنی تصنیف "الفارق بین المنقاد والمارق" کی ابتدا میں مفتی الٰہی بخش خاتمِ مثنوی تک اپنا شجرۂ نسب یوں بیان کیا ہے:

"بندۂ ناچیز سراپا تقصیر راجی رحمۃ ربہ القدیر محمد اسماعیل بن صاحب الصدق والصفا الحاج محمد اسحاق بن صاحب العلم والفضل الاتم المولوی محمد ابوالقاسم بن جامع کمالاتِ صوری ومعنوی صاحب تالیفاتِ الکثیرہ والتصنیفات المفیدۃ المشہور بین الانام بالمفتی الٰہی بخش کاندھلوی غفر اللہ لہ۔" (۱)

والد کی طرف سے صدیقی النسب، اور والدہ کی طرف سے فاروقی النسب تھے۔ والد کی طرف سے ہمارا شجرۂ نسب بغیر کسی انقطاع کے سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔ مولانا محمد علی الصدیقی (سیالکوٹ) کے پاس بحمد اللہ یہ شجرۂ نسب محفوظ ہے۔ والد محترم کے بارے میں ناچیز راقم جو مفصل تذکرہ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور کسی حد تک اس پر کام بھی

---

(۱)۔ الفارق بین المنقاد والمارق (مخطوطہ) مصنفہ: مولوی حافظ محمد اسماعیلؒ۔ ص: ۲

(بقیہ حاشیہ) مولانا حکیم محمد صدیق صاحبؒ۔ حاذق طبیب تھے۔ مولانا محمد الیاس بانی تبلیغی جماعت ۱۳۰۳ھ۔ ۱۳۶۳ھ۔ مولانا محمد یوسف۔ مشہور تصنیف ۔امانی الاحبار شرح معانی الآثار۔ م: ۱۹۶۵ء
مولانا محمد علی الصدیقی۔ مشہور تصانیف: امام اعظم اور علم حدیث، تفسیر معالم القرآن۔ ۔مولانا محمد مالک۔ مشہور تصانیف: اصولِ تفسیر، علوم قرآن، تاریخ حرمین۔

شروع کردیا ہے۔ اس میں اس کی تفصیل دی جائے گی۔ بعض حضرات نے حوالہ بھی دیا ہے اور میں نے خود بھی کئی بار والد مرحوم کو کہتے سنا کہ: "امام فخرالدین رازی ہمارے اجداد میں سے ہیں۔" لیکن اسے تسلیم کرنے میں مجھے تأمل ہے کیونکہ میں نے امام فخرالدین رازی کے جو تذکرے پڑھے ہیں، اس میں انھیں فاروقی النسب لکھا ہے۔ میں اس بارے میں تحقیق کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ مفصل تذکرے میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

تفسیر معارف القرآن کے دیباچے میں والد صاحب۔ نے خود اپنے بارے میں مختصراً یہ تحریر کیا ہے:

"بندہ ناچیز حافظ محمد ادریس بن مولانا حافظ محمد اسماعیل کاندھلوی(۱) جو نسبتاً صدیقی، مسلکاً حنفی، اور مشرباً چشتی ہے۔"

ہمارے دادا حافظ محمد اسماعیل ریاست بھوپال میں محکمہ جنگلات کے مہتمم تھے۔ بڑے عابد و زاہد، متقی پرہیزگار تھے۔ وہیں کے دوران قیام والد محترم پیدا ہوئے۔ والد محترم کی پیدائش کے چند سال بعد دادا نے بھوپال کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کاندھلہ جامع مسجد میں حسبۃً للہ حدیث کا درس شروع کرا دیا۔(۲)

والد مرحوم نے اپنی تاریخ ولادت کے بارے میں لکھا ہے:

"ولدت للثانی عشر من شہر الربیع الثانی سنۃ سبع عشر بعد مضی الف و ثلث مأۃ فی بلدۃ بھوپال (۳) [مقدمۃ التفسیر]

یعنی میں ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ کو شہر بھوپال میں پیدا ہوا۔ یہ بات مسلم ہے کہ کاندھلہ ان کی جائے پیدائش نہیں ہے بلکہ وطن ہے۔ اپنی ایک تصنیف "مقدمۃ التفسیر" فصل ثالث میں اپنے مولد و منشا میں خود فرق کرتے ہیں کہ "بھوپال میری جائے ولادت ہے اور کاندھلہ وطن ہے۔"

---

(۱)۔ کاندھلہ میں ۱۹ شوال، شب جمعہ ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء انتقال ہوا۔

(۲)۔(۳)۔ مقدمۃ التفسیر ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

خاندان کی مذہبی روایات کے مطابق تعلیم کی ابتداء حفظ قرآن سے کرائی گئی۔ نو برس کی عمر میں حفظِ قرآن سے فارغ ہوئے۔

ہمارا خاندان خدا کے فضل وکرم سے صدیوں سے علم وفضل اور دین کا گہوارہ چلا آرہا ہے۔ مرد تو مرد عورتوں میں بھی حد سے زیادہ دینداری ہے۔ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ کی پابندی کے علاوہ میں نے بچپن میں اپنے خاندان کی بعض بزرگ عورتوں کو رمضان میں اعتکاف تک میں بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

قرآن حکیم سے اتنا شغف کہ اکثر خواتین کو اس طرح یاد تھا جیسے ایک حافظ کو، بہرکیف خاندانی روایات کے مطابق والد صاحب نے قرآن حکیم حفظ کیا۔

ہمارے دادا، مولوی حافظ محمد اسماعیل جید عالم دین تھے، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ سے بیعت تھے، مولانا اشرف علی تھانوی ان کے پیر بھائی بھی تھے، اور اس کے علاوہ گہرے ذاتی تعلقات بھی تھے۔

تعلیم و تربیت

والد صاحب جب حفظِ قرآن سے فارغ ہوئے تو انھیں لے کر حضرت تھانوی کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے اور فرمایا:

"مولوی اشرف علی! میں ادریس کو خانقاہ میں داخل کرنے کے لئے لایا ہوں، اب یہ آپ کے سپرد ہے۔"

حضرت تھانویؒ نے برجستہ فرمایا: "حافظ اسماعیل! یہ نہ کہیئے کہ خانقاہ میں داخل کرنے لایا ہوں، بلکہ یوں کہیئے کہ مدرسہ خانقاہ میں داخل کرنے لایا ہوں۔" (۱)

حضرت تھانوی کا نورِ بصیرت اس حقیقت کو بھانپ گیا تھا کہ حافظ اسماعیل کا بیٹا صرف خانقاہی نظام کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ اس سے تو قدرت قرآن وسنت کے علوم کی ایسی عظیم خدمت لے گی جو کہیں صدیوں میں کسی مردِ مومن کا نصیبہ بنتی ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی کے اس

(۱)۔ یہ واقعہ انہی الفاظ کے ساتھ میں نے بارہا والد محترم کی زبان سے سنا۔

ارشاد پر آپ کو خانقاہِ اشرفیہ کے بجائے مدرسہ اشرفیہ میں داخل کیا گیا، صرف ونحو کی پہلی کتاب، حضرت تھانوی نے خود شروع کرائی اور اس کے بعد آپ نے خانقاہِ امدادیہ کے مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز کر دیا۔ مدرسہ اشرفیہ تھانہ بھون میں آپ نے مولانا تھانوی کے علاوہ، مولوی عبداللہ صاحب تیسیر المنطق سے بھی علمی استفادہ کیا۔

مدرسہ عربیہ مظاہر علوم سہارنپور میں

حضرت تھانوی کے مدرسہ میں چوں کہ صرف ابتدائی دینی تعلیم کا انتظام تھا۔ اس لئے کچھ عرصہ وہاں گزارنے کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے آپ کو مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل کیا گیا، خود حضرت تھانوی آپ کو سہارنپور لے کر گئے اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے سپرد کر دیا۔ حدیث، تفسیر، فقہ اور دیگر مروّج علوم کی تکمیل مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے کی۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حافظ عبداللطیف، اور مولانا ثابت علی جیسے جلیل القدر علماء واساتذہ سے علمی استفادہ کیا۔ اور ۱۹ برس کی عمر میں سندِ فراغ حاصل کی۔

کس ذوق اور لگن سے آپ نے تعلیم حاصل کی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جسے آپ نے ہمارے اور اپنے اکثر احباب اور تلامذہ کے روبرو بارہا بیان کیا، فرمایا کرتے:

> "جس زمانے میں ہم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھتے تھے، اس وقت وہاں مطبخ نہ تھا، طلبہ خود اپنے کھانے کا بندوبست کرتے تھے، ہماری کوشش یہ ہوتی کہ کھانا پکانے، یا کھانے کی وجہ سے کوئی سبق ناغہ نہ ہو۔ اس لئے ہم اکثر یہ کرتے کہ اگر کوئی گھنٹہ خالی ہوتا، یا کوئی سبق، گھنٹہ ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے ختم ہو جاتا تو جلدی سے کمرے میں آکر انگیٹھی پر کھچڑی چڑھا جاتے اور دوسرے سبق میں چلے جاتے، جب سبق ختم ہو جاتا تو پھر کمرے میں آتے، کھچڑی کو انگیٹھی پر سے اُتارتے،

اور جیسی بھی ہوتی، کھا لیتے، کبھی کچی ہوتی، کبھی جل جاتی، اور کبھی بہت زیادہ پچ پچی (۱) ہو جاتی، بہر حال جیسی کیسی ہوتی کھا لیتے۔ مگر سبق ضائع نہ کرتے۔"

دارالعلوم دیوبند میں

اگرچہ آپ نے مظاہر العلوم سے سندِ فراغ حاصل کر لی، مگر آپ نے دیکھا دارالعلوم دیوبند ملک، بلکہ عالمِ اسلام کے جہابذۂ فن کا مرکز بنا ہوا ہے، وہاں کے اُفق پر پیغمبرانہ علوم کے ماہ و نجوم کا جھرمٹ ہے۔ آپ نے اِن درخشندہ ماہ و نجوم سے کسبِ نور کا ارادہ کیا، اور مظاہر علوم سے سندِ فراغت حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند چلے گئے، وہاں دوبارہ دورۂ حدیث پڑھا اور علامہ انور شاہ کاشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، میاں اصغر حسین اور مفتی عزیز الرحمٰن جیسے مایۂ ناز اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔

تدریسی زندگی:

۱۳۳۸ھ/۱۹۲۱ء سے تدریسی زندگی کا آغاز ہوا، سب سے پہلے مدرسہ امینیہ سے تعلق قائم ہوا، مدرسہ امینیہ کا یہ وہ دَور تھا جب مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم مدرسہ کی روحِ رواں تھے۔ لیکن مدرسہ امینیہ سے آپ کا تعلق صرف ایک سال قائم رہا۔ آئندہ سال دارالعلوم دیوبند کی کشش، آپ کو دارالعلوم کھینچ لائی (۲) آپ کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ جن عظیم اساتذہ کے آگے ایک سال قبل زانوئے ادب تہ کیا ہے، وہی آپ کو تدریس کی

---

(۱)۔ بہت زیادہ نرم۔

(۲)۔ والد صاحب نے بارہا فرمایا کہ: ایک سال بعد مجھے خود دارالعلوم کے مہتمم مولانا حافظ محمد احمد (ابن مولانا محمد قاسم نانوتوی) اور نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمان عثمانی (برادرِ بزرگ علامہ شبیر احمد عثمانی) نے دارالعلوم میں آنے پر مجبور کیا۔

دعوت دی۔ قدرت نے یہ شرف بخشا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ انور شاہ کاشمیری، مفتی عزیز الرحمان، اور مولانا حبیب الرحمان عثمانی جیسے جلیل القدر علماء و اساتذہ کے پہلو بہ پہلو مسندِ درس پر فائز ہوں۔

دار العلوم میں پہلے ہی سال جو اسباق دیئے گئے، ان میں ہدایہ، اور مقاماتِ حریری جیسی مشکل کتابیں تھیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ: مجھے کبھی ابتدائی کتابیں نہیں دی گئیں۔ شروع ہی سے مشکل اور اہم کتابوں کی تدریس کا آغاز کیا۔

دار العلوم دیوبند سے یہ تعلق کم وبیش نو(۹) برس قائم رہا، اس زمانہ میں حضرتؒ نے بعد نماز فجر قرآن حکیم کا درس نودرہ میں بھی دیتے جس میں متوسط اور اعلیٰ درجات طلبا شریک ہوتے آپ کا یہ درس امتیازی حیثیت رکھتا تھا جس میں تفسیر وحدیث علم کلام اور فقہ کے اہم مسائل روشنی ڈالی جاتی۔

طلباء اس کثرت سے شامل ہوتے کہ نودرہ بھر جاتا اور بہت سے طلبا باہر بھی کھڑے ہو جاتے۔ کئی طلباء تفسیری نکات کو قلم بند کرتے۔ اس درس قرآن کا دار العلوم اور اساتذہ پر خاص اثر ہوا۔ غالباً اسی اثر کی وجہ سے آپ کو دار العلوم میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں جب شیخ التفسیر کے منصب جلیلہ پر فائز تھے اور بیضاوی شریف ابن کثیر کا درس آپ سے متعلق تھا، اس وقت بھی آپ نے مکرر نودرہ میں قرآن حکیم درس دیا جو پہلے سے بھی زیادہ مقبول اور مفید ہوا۔ (۱۹۲۹ء) آپ دار العلوم چھوڑ کر حیدرآباد دکن چلے گئے۔

حیدر آباد دکن میں قیام!

حیدر آباد دکن میں کم وبیش نو برس قیام رہا، اگرچہ وہاں نہ دار العلوم سے وابستگی جیسی نعمت تھی، اور نہ علامہ انور شاہ، اور علامہ عثمانی جیسے علم و حکمت کے سرچشموں سے قرب حاصل تھا، مگر اس اعتبار سے وہاں کا زمانۂ قیام، آپ کی زندگی کا قیمتی حصہ گردانا جاسکتا ہے کہ:

"التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح" جیسی عظیم اور مایۂ ناز کتاب کی تالیف کا موقع ملا، اور اس کی ابتدائی چار جلدیں وہیں کے دورانِ قیام، دمشق جا کر طبع کرائیں۔ (۱)

تعلیق الصبیح، عربی زبان میں ہے، اور علمی نقطۂ نظر سے اتنی ٹھوس اور بلند کہ علمائے ہند کے علاوہ مصر، شام، عراق، اور حرمین شریفین کے علماء نے بھی اس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا، اور اس پر تقاریظ لکھیں۔ تعلیق الصبیح کی تالیف و اشاعت ہند سے نکل کر عرب ممالک میں آپ کے تعارف کا ذریعہ بنی۔

حیدر آباد دکن کے دورانِ قیام اور بھی کئی کتب تالیف کیں۔ وہیں کے دورانِ قیام آپ کی ملاقات قرآنِ حکیم کے انگریزی مترجم مارمیڈوک پکتھال سے بھی ہوئی۔ والد صاحب نے

میرے محترم بھائی مولانا محمد مالک کاندھلوی نے ایک تذکرہ کے دوران خود دادا مرحوم سے سنا ہوا یہ واقعہ نقل کیا کہ ریاست بھوپال کے ایک عظیم المرتبہ شیخ متبحر عالم اور بلند پایہ بزرگ قاضی محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت دادا مرحوم سے بہت ہی محبت تھی۔ معمر بزرگ بلکہ استاد ہونے کے باوجود ان کے ساتھ عقیدت و عظمت کا بھی معاملہ کرتے تھے۔ قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس علم و عرفان کا گہوارہ ہوتیں اسی لئے شغف و وابستگی تھی۔

نواب شاہ جہاں بیگم والئ ریاست بھوپال سے جو اس وقت تک والئ ریاست نہیں ہوئی تھیں کسی شرعی مسئلہ میں اختلافِ رائے ہو گیا تھا جب وہ تخت نشین ہوئیں تو راتوں رات بھوپال سے کوچ کر کے وطن پہنچ گئے۔ ریاست کے تمام عمائد و ذمہ دار دادا صاحب کی دیانت و تقویٰ اور فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں جس درجہ جد و جہد کرتے تھے اس سے بخوبی واقف تھے اس وجہ سے بیگم صاحبہ سے وزرائے ریاست نے اصرار کیا کہ حافظ محمد اسماعیل صاحب کو بلایا جائے۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے ایک وفد پیغام لے کر آیا، بیگم صاحبہ کی خواہش ہے کہ اپنے منصب پر واپس تشریف لے آئیں۔ ریاست آپ کی مخلصانہ مساعی کی شکر گزار ہے

---

(۱)۔ التعلیق الصبیح، دمشق میں ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۴ء میں طبع ہوئی۔

اور آپ کی توجہ و شفقت کی طالب ہے۔

اس پیش کش کے جواب میں دادا صاحب مرحوم نے یہ لکھ کر بھیج دیا کہ گزشتہ زمانہ میں آپ سے ایک شرعی مسئلہ میں اختلاف ہو چکا ہے۔ اب آپ والیٔ ریاست ہو گئی ہیں۔ اگر آئندہ بھی ایسی کوئی نوبت آئی اور آپ کے والیٔ ریاست ہونے کا لحاظ کر کے اگر میں نے کوئی کوتاہی کی تو میرا دین برباد ہوگا اور بصورت دیگر اندیشہ ہے کہ آپ کو ناگواری ہو۔ اور میں نہ اپنا دین ضائع کرنا چاہتا ہوں اور نہ آپ کی ناراضگی، اس لئے معذرت خواہ ہوں۔ اس طرح ریاست کے اس عظیم عہدہ سے یکسو ہو کر وطن کاندھلہ ہی میں کپڑے کی دکان شروع کر دی جس پر بیٹھے تلاوت قرآن کرتے رہتے اور جو خریدار آتا اس کو خود ہی کپڑا دیکھنے ناپنے اور قطع کرنے کیلئے فرما دیتے اور اس دوران مسلسل تلاوت کا سلسلہ جاری رہتا اسی عرصہ میں کاندھلہ میں ایک مدرسہ نصرت العلوم قائم فرمایا جس میں حضرت مولانا عبداللہ گنگوہی نے بھی درس دیا ہے اور خود جامع مسجد میں حسبتہ للہ درس حدیث کا سلسلہ جاری کر دیا۔ انھوں نے کاندھلہ کے قیام میں سینکڑوں نایاب کتابیں تفسیر و حدیث علم اسماء الرجال فقہ تاریخ اور تصوف لکھیں۔ اس زمانہ میں جبکہ فتح الباری عمدۃ القاری اور اصابہ جیسی عظیم اور ضخیم کتابیں ہندوستان میں نایاب تھیں اپنے قلم سے لکھیں۔ طیبی کا نسخہ متعدد مرتبہ لکھا۔ یہ تمام مخطوطات ہمارے یہاں آج تک محفوظ ہیں۔

کئی بار مکھپال کا ذکر کیا، اس کی تعریف کرتے، اور کہتے کہ مخلص آدمی تھا، اور اس نے بہت محنت سے قرآنِ حکیم کا ترجمہ کیا۔ کچھ عرصہ والد اور وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے گھروں میں رہے، اور اکثر دونوں میں علمی گفتگو ہوتی۔ حیدرآباد دکن میں اگرچہ زیادہ وقت تصنیف و تالیف میں صرف کیا، مگر درس و تدریس کا سلسلہ وہاں بھی برابر جاری رہا۔ حیدرآباد کے دورانِ قیام کئی بار مشکوٰۃ شریف کامل سبقاً سبقاً پڑھائی۔

حیدرآباد دکن کے زمانۂ قیام میں خاص انہماک اور شغف کتب خانہ آصفیہ جو دنیا کے علم

کی ایک عظیم لائبریری ہے، کی نادر کتابوں کا مطالعہ اور ان کے مضامین کی تلخیص واقتباس سے تھا۔ اسی سلسلہ میں حافظ فضل اللہ تورپشتی کی کتاب شرح المصابیح (جو ایک نادر مخطوطہ کتاب ہے اور ہندوستان میں صرف اس کا ایک ہی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں تھا) سے بہت سے مضامین کی تلخیص کر کے اپنی تالیف التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح میں مرتب وجمع فرمایا، حافظ تورپشتی کی یہ تحقیقات بلاشبہ شرح مشکوٰۃ کی ایک بلند پایہ امتیازی خصوصیت ثابت ہوئیں۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدینہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت انور شاہ رحمتہ کی تقاریر کے مجموعہ فیض الباری شرح البخاری میں تورپشتی کی تمام تحقیقات التعلیق الصبیح کے حوالہ سے جمع فرمائیں ان بلند پایہ تحقیقات کو علمار شام ومصر اور حجاز نے استحسان اور استعجاب کی نظروں سے دیکھا اور سراہا۔

حیدر آباد دکن کے زمانہ قیام میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی اور مولانا عبد الباری ندوی خاص احباب ورفقار میں تھے۔ مجھے اس زمانہ میں ان حضرات کا تشریف لانا اور علمی مجلسوں کی کی رونق خوب یاد ہے اور ان مجلسوں میں متعدد اہلِ علم، وکلار اور مشائخ کی شرکت بھی ہوتی تھی، اور بہت سے صحافی حضرات بھی علمی رابطہ رکھا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ابوالاعلیٰ مودودی بھی وہیں قیام پذیر تھے اور موصوف محترم بھی بڑی عقیدت کے ساتھ ملا کرتے تھے اور مولانا مودودی کے برادر بزرگ مولانا ابوالخیر مودودی بھی اسی زمانے سے والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اور لاہور تشریف آوری کے بعد ہمیشہ ملتے رہے اور یہ تعلق وفات تک بدستور قائم رہا۔

۱۹۲۹ء میں علامہ انور شاہ کاشمیری، اور [illegible] مہ شبیر احمد عثمانی، دارالعلوم کی انتظامیہ سے اختلاف کی بنا پر ڈابھیل ضلع سورت چلے گئے تھے، اور ان دونوں حضرات کی وجہ سے اور بھی اہلِ علم وفضل کا وہاں اجتماع ہو گیا تھا، ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں دو بار آپ کو مدرسہ اسلامیہ عربیہ ڈابھیل آنے کی دعوت دی گئی، مگر آپ نے قبول نہ کی، اور حیدر آباد کے قیام کو ترجیح دی لیکن جب علامہ شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم بن کر آئے تو وہاں شعبۂ تفسیر

کا اجرار کیا گیا، اور "شیخ التفسیر" کے لئے علامہ عثمانی صدر مہتمم اور قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم نے آپ کو دارالعلوم آنے کی دعوت دی۔

جس وقت آپ کو یہ دعوت دی گئی اس وقت آپ کو حیدر آباد میں ڈھائی سو روپے ماہانہ سے زیادہ مشاہرہ مل رہا تھا، اور دیوبند میں صرف ستر روپے ماہانہ کی پیشکش کی گئی کیوں کہ اس وقت وہاں اساتذہ کی تنخواہوں کا یہی معیار تھا۔ تمام احباب، اور گھر والوں نے شدید مخالفت کی اور کہا کہ ڈھائی سو روپے چھوڑ کر ستر روپے ماہانہ پر جانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ خود والد صاحب کہا کرتے کہ : تمھاری والدہ نے بھی بہت مخالفت کی، اور کہا کہ ہم یہاں ڈھائی سو روپے ماہانہ پاتے ہیں، رہائش مفت ہے، وہاں ستر روپے میں کیسے گزارہ ہوگا؟ مگر قدرت نے والد صاحب کو جس قناعت سے نوازا تھا، اس کا اندازہ دوسرے نہیں کر سکتے تھے۔ احباب اور گھر والوں سے کہدیا خواہ تنگی ہو یا فراخی میں دارالعلوم کی دعوت کو رد نہیں کر سکتا، اور پھر وہ بھی تفسیر قرآن پڑھانے کے لئے۔ بقول والدِ محترم!

"جب گھر والوں نے زیادہ ہنگامہ کیا تو میں اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر کاندھلہ آیا کہ والد صاحب سے مشورہ کروں تاکہ وہ جو رائے اور حکم دیں اس پر شرحِ صدر کے ساتھ عمل کروں، چنانچہ کاندھلہ آیا، والد صاحب کو علامہ شبیر احمد عثمانی، اور قاری محمد طیب کے خطوط دکھائے کہ ان حضرات نے دارالعلوم میں شیخ التفسیر کی جگہ کے لئے دعوت دی ہے لیکن تنخواہ وہاں کے ڈھائی سو کے مقابلے میں صرف ستر روپے ماہانہ ہوگی، آپ کی کیا رائے ہے ـــ چلا جاؤں یا عذر کر دوں۔؟ یہ بات سن کر والد صاحب سخت ناراض ہوئے فرمایا : در کارِ خیر ہیچ حاجتِ استخارہ نیست نیز فرمایا ؛ تم پوچھنے بھی کیوں آئے۔ پہلے ہی خط میں ہاں، کہدینا تھا۔"

والد محترم کی یہ بات سن کر آپ کو کلی اطمینان، اور شرح صدر ہو گیا، اور آپ نے دارالعلوم کی درخواست قبول کر لی اور اس طرح حیدر آباد دکن کو خیرباد کہہ کر ۱۹۳۹ء میں بحیثیت "شیخ التفسیر" دارالعلوم دیوبند چلے آئے

دارالعلوم میں تقریباً دس برس بحیثیت شیخ التفسیر تدریس کی خدمت بجالاتے رہے۔ لیکن تفسیر بیضاوی، اور ابن کثیر کے علاوہ ابوداؤد اور طحاوی بھی بارہا پڑھائی۔

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں

اخلاق و عادات معمولات

والد صاحب سے اگر کوئی شخص ایک بار بھی ملا ہے، تو اسے اندازہ ہے کہ ان کے مزاج میں کس قدر عجز و انکسار تھا۔ بات چیت اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور رہنا سہنا۔ ہر بات سے سادگی اور انکسار ٹپکتا تھا۔

لباس بہت سادہ پہنتے، کرتا یا صدری پھٹ جائے تو اسے سلواتے، حتیٰ کہ اکثر اوقات اسی طرح کے کپڑے پہن کر دعوت وغیرہ میں بھی چلے جاتے۔ ہم لوگوں میں سے کوئی کہتا تو جواب دیتے کہ "تم لوگوں کے تو نوابی مزاج ہو گئے، درویشی اور فقیری میں جو راحت ہے وہ کسی میں نہیں۔"

یہی حال کھانے پینے میں بھی تھا، اپنے لئے پتلا شوربہ پکواتے، بھنا ہوا سالن نہیں کھاتے پتلے شوربے کو "لمبا شوربہ" کہتے۔ اگر کبھی سالن میں مرچیں زیادہ ہو جاتیں تو اپنی پلیٹ میں سادہ پانی ڈال لیتے، اس بات کا خیال نہ کرتے کہ سالن بدمزا ہو جائے گا۔ البتہ مہمان آتے تو ان کے لئے اچھے کھانے پکواتے۔ خاص طور پر رشتہ داروں کا بہت خیال رکھتے۔ ایسے ہی کوئی شاگرد آجاتا تو اس کے لئے خود کھانا لے جاتے، کبھی اس بات کا انتظار نہیں کرتے تھے کہ گھر میں سے کوئی کھانا لے کر آئے گا۔ بعض شاگرد، اسی محبت اور سادگی کی وجہ سے کئی کئی

روز آکر والد صاحب کے پاس رہتے۔ ان میں سرفہرست مولانا طفیل احمد جالندھری اور مولانا غلام ربانی ہیں۔ مولانا طفیل احمد جالندھری عرصے سے اسلامیہ ہائی سکول اکاڑہ میں معلّم دینیات ہیں۔ جب بھی تعطیلات ہوتیں لاہور آجاتے اور کئی کئی روز والد صاحب کے پاس رہتے۔ والدہ صاحبہ بھی ہم سے کہتیں کہ تمھارے بڑے بھائی آگئے ہیں۔ والد صاحب کو بھی ان سے اولاد جیسی محبت تھی۔ مولانا غلام ربانی کشمیری آتے ان کی بھی مدارات کرتے۔ مولوی حسن جان آصف (شیادر سے) آتے وہ بھی گھر کے ایک فرد کی طرح رہتے۔ سال کے اکثر حصوں میں اسی طرح مختلف شاگرد آتے رہتے۔

مہمان جو بھی آتا اس سے خوش ہوتے۔ ہم سے بھی ہمیشہ یہی کہتے کہ مہمان خدا کی رحمت ہے جب کوئی مہمان آئے خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھیں اس قابل سمجھا کہ تمھارے یہاں آکر ٹھہرے کھانا ہمیشہ فرش پر بیٹھ کر کھاتے۔ گھر میں کبھی میز کرسی نہیں رکھی۔ کئی بار خود قصہ سنایا کہ:

"حیدر آباد دکن کے زمانۂ قیام میں تمھاری والدہ مرحومہ نے کہا کہ تمھارے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں، ان سب کو فرش پر بٹھاتے ہو، اچھا نہیں لگتا دو چار کرسیاں لے آؤ۔ پہلے تو میں خاموش رہا اور ٹالتا رہا۔ جب تمھاری والدہ نے کئی بار کہا کہ تم ان کو زمین پر بٹھاتے ہو کیا خیال کریں گے۔ تب میں نے جواب دیا کہ میں تو اسی طرح زمین پر بٹھاؤں گا۔ جس کو آنا ہے وہ آئے، دنیا نے میرا کیا خیال کیا ہے جو میں اس کا خیال کرتا پھروں۔"

چنانچہ نہ کرسیاں آئیں، اور نہ میز۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے کبھی تنگی نہیں دیکھی، مگر اس کے ساتھ جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے لے کر والد صاحب کی وفات تک، کبھی ان کو مسہری یا نواڑی پلنگ پر بھی سوتے نہیں دیکھا، ہمیشہ بانوں کے پلنگ پر سوتے تھے اور دن میں تو پلنگ پر

ملہ۔ مولانا غلام ربانی آج کل جوہر آباد میں ایک دینی مدرسہ سے وابستہ ہیں۔ مولانا حسن جان آصف اپنے وطن (...) میں علمی و دینی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

بھی نہیں لیٹتے تھے، فرش پر ہی لیٹ جاتے تھے۔ رمضان میں بھی رات کو پلنگ پر نہیں سوتے تھے۔ تراویح کے بعد نفلیں پڑھتے رہتے، اور کتابوں کے کمرے ہی میں کچھ دیر کے لیے لیٹ جاتے تھے، دو ڈھائی بجے اٹھ جاتے اور پھر اذان کے قریب تک تلاوت قرآن، درود و وظائف اور نماز میں مشغول رہتے۔ سحری میں ہم نے کبھی کھانا کھاتے نہیں دیکھا، افطار کے بعد کھانا کھاتے تھے، سحری میں صرف چائے پیتے۔ اور اگر سردی کا رمضان ہوتا تو ایک انڈا کھالیتے، اور اسی سے روزہ رکھتے۔ مرض الوفات میں "تکلیف کی وجہ سے گھر والوں نے مسہری پر لٹا دیا تو کئی بار اظہار ناراضگی کیا، اور فرماتے رہے کہ تم نے مجھے انگریزی پلنگ پر کیوں لٹا دیا۔!

اخلاق و عادات کے سلسلے میں چند سطریں برادر مکرم مولانا طفیل احمد جالندھری نے بھیجی ہیں، میں انھیں من و عن نقل کرتا ہوں:

"شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی پہلی بار زیارت اس وقت ہوئی جب بندہ مدرسہ عربیہ خیر المدارس جالندھر شہر سے درس نظامی کی ابتدائی کتب پڑھ کر، درس نظامی کی تکمیل اور خاص طور پر دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے (۱۹۴۲ء) دارالعلوم دیوبند پہنچا۔ درسی کتابوں کے علاوہ حضرت اس وقت نماز صبح کے بعد درس قرآن بھی دیتے تھے۔ جس میں عجیب و غریب نکات بیان فرماتے تھے آیات کی تفسیر اس بسط اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہتا جن مفسرین نے علمائے سلف کے مسلک سے ہٹ کر نام نہاد تحقیق کے نام پر تفسیر قرآن میں جو تحریفات کی ہیں ان کی بلا خوف لامۃ لائم علمی انداز میں تردید کرتے۔ اس دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف دارالعلوم میں کوئی بات کہنا آسان کام نہ تھا، مگر آپ مولانا آزاد کی ان باتوں کی برملا، اور نام لے کر تردید کرتے جو انھوں نے

جمہور مفسّرین کے خلاف بیان کی ہیں۔

آپ کا سب سے بڑا طغرۂ امتیاز یہ تھا کہ طلبہ اور علماء کی بہت عزّت کرتے تھے، ایک غریب سے غریب طالب علم اور مہمانِ رسول کی عزّت ان کے دل میں ایک بادشاہ اور جاگیردار سے زیادہ تھی، امراء سے طبعی طور پر نفرت کرتے تھے، کبھی از خود کسی کے پاس نہیں جاتے تھے، اور نہ زندگی بھر کسی سے اپنی کوئی ضرورت بیان کی، اگر خود کوئی آتا تو اس کی مدارات کرتے اور حسنِ سلوک سے پیش آتے۔

دارالعلوم دیوبند میں ایک مرتبہ مولوی تمیزالدین مرحوم آئے، وہ اس وقت متحدہ بنگال کے وزیر تعلیم تھے، ان کے اعزاز میں جلسہ ہوا مولانا نے عربی میں قصیدہ لکھا، ناچیز نے اس بات کو مولانا کے مزاج کے خلاف سمجھتے ہوئے محسوس کیا، اور پوچھا حضرت! ظالم کی تعریف سے تو عرش ہل جاتا ہے۔ (آپ نے ایک دنیادار[1] کے لئے قصیدہ کیسے لکھدیا) فرمایا۔ قصیدہ پر نظر کرو۔ اگر کوئی شعر خلاف حقیقت نظر آئے یا اس میں خوشامد اور بے جا تعریف کا کوئی پہلو دیکھو تو بتاؤ۔ میں نے غور کیا تو پورے قصیدے میں علم اور علماء کی عظمت کا بیان تھا یا نصائح تھے۔ جس وقت جلسہ میں قصیدہ پڑھا گیا تو ہم نے دیکھا کہ مولوی تمیزالدین رو رہے تھے۔"

عام طور پر میں نے، یہ دیکھا، اور پڑھا ہے کہ علماء، اور اتقیاء کے بارے میں یہ کہا، اور لکھا جاتا ہے کہ وہ ہر روز اتنے پارے قرآن پاک کے تلاوت کیا کرتے تھے۔ رمضان کی راتوں میں ہر رات پورا قرآن ختم کر لیتے تھے، اتنے ہزار بار درود شریف پڑھتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ اگر کوئی شخص خود اپنے بارے میں یہ اظہار کرتا ہے کہ میں نے اتنی عبادت کی، اتنی تلاوت کی، اتنے درود و وظائف پڑھے، تو بلا شبہ یہ ریا ہے۔ اور اس کے بے خبر رفقاء

---

(۱)۔ مولوی تمیزالدین مرحوم، پاکستان میں قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر بنائے گئے، ان کی نیکی اور امانت و دیانت ہمیشہ شک و شبہ سے بالا رہی، ان کی اصول پرستی کا موافق و مخالف سبھی نے اعتراف کیا۔ (م م م)

شاگرد، اور حلقہ بگوش اس طرح کی باتیں لکھتے ہیں تو یہ اس شخص کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔

میں نے اپنے انہی اوراق میں کسی اور جگہ بھی ذکر کیا ہے کہ مجھے تقریباً ۱۹۴۲ء کے بعد سے واقع ہونے والے تمام اہم اور قابلِ ذکر واقعات یاد ہیں، اور والد صاحب قبلہ کی وفات تک ہمیشہ ان کے ساتھ رہا یا ان کے قریب[1] رہا۔ لیکن میں نے کبھی نہیں سنا کہ انھوں نے کسی کے سامنے یہ اظہار کیا ہو کہ میں اتنی تلاوت کرتا ہوں، اتنی بار درود شریف پڑھتا ہوں۔ شاید بعض حضرات یقین نہ کریں لیکن مجھے یاد نہیں کہ کبھی انھوں نے اپنے تہجّد پڑھنے کا بھی ذکر کیا ہو۔ عام گفتگو تک میں یہ نہیں کہتے تھے کہ "جب میں تہجّد کے لیے اٹھا یا اٹھتا ہوں، یا فلاں دن کسی بیماری یا عذر کی وجہ سے نہیں اُٹھ سکا۔" ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ سردی گرمی، ہمیشہ رات کے پچھلے پہر اُٹھتے، خود اپنی چائے بناتے اور ایک پیالی پی کر نماز میں مصروف ہو جاتے۔ صبح کی اذان ہوتی تو مسجد چلے جاتے اور صبح کی نماز کے کم و بیش آدھ گھنٹے بعد گھر واپس آتے۔

صبح کی نماز سے واپس آتے تو مطالعہ کتب میں مشغول ہو جاتے، اور اس وقت عام طور پر صرف ان کتب کا مطالعہ کرتے جو زیرِ تدریس ہوتیں۔ دارالعلوم دیوبند میں دس برس تفسیر بیضاوی پڑھاتے رہے۔ جامعہ اشرفیہ لاہور میں بھی کئی برس پڑھانے کا اتّفاق ہوا، مگر ہمیشہ مطالعہ کرتے، اور بار بار اس بات کو جتاتے کہ! لوگ بغیر مطالعہ سبق پڑھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، مگر یہ کوئی فخر کی بات نہیں، میں ہمیشہ مطالعہ کر کے سبق پڑھاتا ہوں۔

قرآن حکیم رمضان المبارک کے علاوہ عام دنوں میں زبانی پڑھتے رہتے۔ کافی عرصے سے یہ معمول ہو گیا تھا کہ رمضان میں عشاء کے فرض پڑھ کر گھر آجاتے اور تراویح تنہا پڑھتے۔ ستائیسویں شب میں قرآن شریف ختم کرتے۔

دو تین مرتبہ ناچیز کو تراویح میں والد صاحب کا سامع بننے کا شرف حاصل ہوا۔ قرآن بہت

---

(۱) عجیب اتفاق ہے جب تک والد صاحب حیات رہے کبھی مستقل طور پر لاہور سے باہر جانے کا اتّفاق نہیں ہوا۔ نہ بسلسلہ ملازمت اور نہ بسلسلۂ کاروبار۔ اسلام آباد آنا ہوا تو ان کی وفات کے دس ماہ بعد۔

یاد تھا، اور شاذ و نادر کہیں بھولتے تھے۔ البتہ ایک عجیب بات بارہا ظاہر ہوئی حالاں کہ بہت سے حفاظ کا قرآن سننے کا اتفاق ہوا۔ بھائی مالک صاحب کا بار نماز تراویح میں سامع بنا، وہ بھی ماشاء اللہ عالمِ دین ہیں، اور قرآن بہت یاد ہے، پورے قرآن میں دو تین جگہوں سے زیادہ نہیں بھولتے مگر والد صاحب کے ساتھ عجیب تجربہ ہوا؛ وہ یہ کہ قرآن شریف پڑھ رہے ہیں، حضرت موسیٰؑ کا قصّہ چل رہا ہے۔ پارہ مثلاً سولھواں ہے۔ اب حضرت موسیٰؑ کا قصّہ کسی دوسرے پارے میں بھی ہے تو اس پورے قصّے کو ملا دیں گے۔

پہلی مرتبہ تراویح میں جب میں والد صاحب کا سامع بنا، اور ایک روز انھوں نے نماز میں ایک ہی قصّے کے مختلف حصّوں اور ٹکڑوں کو ملایا جو مختلف پاروں میں تھے، تو میں بڑا پریشان ہوا، اور پیچھے سے لقمہ نہ دے سکا۔ اس کے بعد کئی بار ایسا ہی ہوا، تب میں سمجھا کہ قرآن کے معانی و مطالب اور سیاق و سباق پر اتنی گہری نظر ہے کہ نماز میں بھی وہ مستحضر رہتے ہیں، اور کہیں اٹکتے نہیں بلکہ ایک قصہ اور واقعہ اگر مختلف مواقع میں بکھرا ہوا ہے تو اس کو جوڑ دیتے ہیں۔

یقیناً یہ بہت مشکل کام ہے اور دن و رات اور برہا برس کی مزاولت اور مسلسل مطالعہ سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ جمعہ کے روز جامع مسجد نیلہ گنبد میں جو تقریر کرتے، اس کا مضمون بھی صبح کے وقت دیکھ لیتے، اسی مطالعے اور مسلسل رجوع کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریر بھی درس کی طرح بے حد مربوط اور مسلسل ہوتی تھی۔ کئی کئی گھنٹے کی تقریروں میں ہم نے کوئی بات موضوع سے ہٹ کر نہیں سنی۔

کبھی کسی کو بیعت نہیں کیا، غیر محرم کو بلا پردہ کبھی سامنے نہیں آنے دیتے تھے، بلکہ بات چیت سے بھی گریز کرتے تھے۔

عام طور پر صبح سے لے کر عصر تک کا وقت اپنے کمرے میں گزارتے، کمرے کا ماحول بے شمار احباب نے دیکھا ہے۔ نہ میز، نہ کرسی، نہ خوبصورت ریک، نہ صوفہ، چند سادہ سی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی۔ معمولی فرش، تپائی پر کتاب رکھ کر مطالعہ کرتے اور اسی پہ

تصنیف و تالیف کا کام کرتے۔ بہت سی کتابیں ہر وقت کھلی ہوئی رکھی رہتیں۔ گھر والے کئی کئی روز کہتے رہتے کہ کمرہ صاف کردیں، مگر اجازت نہ دیتے کہ میری کتابیں گڑبڑ ہو جائیں گی۔ انھیں ہاتھ مت لگانا۔ فرش پر بسا اوقات خاصا گرد ہوتا، امیر و غریب، جو بھی آتا اُسے وہیں بیٹھنے کے لئے کہتے۔ ایک مرتبہ مختار مسعود صاحب، کیپٹن ڈاکٹر حامد علی خاں کے ساتھ آئے، سردی کا موسم تھا، مختار مسعود صاحب نے بہت قیمتی سوٹ پہنا ہوا تھا، والد صاحب نے محسوس کیا کہ شاید انھیں اس بات کا خیال ہو کہ مٹی لگ جانے سے سوٹ میلا ہو جائیگا۔ والد صاحب نے کہا : بھئی۔ ہم تو فقیر آدمی ہیں، ہمارے پاس تو صوفہ اور کرسیاں نہیں ہیں۔ آپ آئے ہیں تو اسی میلے کچیلے فرش پر بیٹھ جائیں"۔ مختار مسعود صاحب بہت ذہین اور خلیق آدمی ہیں، برملا کہنے لگے : مولانا! صوفوں پر تو روز ہی بیٹھتے ہیں، اس مٹی پر بیٹھنے کی تمنا لے کر تو آپ کے پاس آئے ہیں، والد صاحب ان کے اس ادب اور اخلاق سے بہت خوش ہوئے۔

سردار عبد الرشید مختلف ادوار میں شریکِ اقتدار رہے، اکثر و بیشتر والد صاحب سے ملنے آتے، ہمیشہ چلتے وقت کہتے : حضرت! کبھی کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف فرمایئے، مجھے خوشی ہوگی"۔ مگر ہر دفعہ یہی جواب دیتے : سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ خدا نے جو قدرت اور اختیار دیا ہے اُسے مسلمانوں کی بھلائی کے لئے استعمال کرو اور اپنے ساتھیوں کو بھی میرا یہی پیغام دو۔ میری ذاتی کوئی غرض نہیں۔

جولائی ۱۹۷۴ء میں مولانا کوثر نیازی، وزیر بننے کے بعد پہلی مرتبہ والد صاحب سے ملنے آئے، ناچیز راقم بھی موجود تھا نیازی صاحب نے ازراہِ تفنن کہا : مولانا۔ میں تو سمجھا تھا کہ گزشتہ سالوں میں لوگوں نے بہت ترقی کی ہے، بیشتر علماء بھی ایڈوانس ہو گئے ہیں، آپ کے یہاں بھی کرسیاں وغیرہ آگئی ہوں گی"۔ والد صاحب نے فرمایا : نہیں بھئی مولوی صاحب! میرا تو وہی درویشی دھندا ہے، میں کوئی کرسی ورسی اپنے گھر میں نہیں آنے دیتا"۔

گفتگو بہت نرم لہجے اور دھیمی آواز میں کرتے، اکثر ایسا ہوتا کہ چند قدم کے فاصلے پر بیٹھا

ہوا آدمی بھی بات سننے میں دشواری محسوس کرتا۔

ہر ایک سے بات اتنی خندہ پیشانی سے کرتے کہ دل میں اُتر جاتی، کبھی نام لے کر کسی پر طنز نہیں کرتے تھے، انگریزی زبان کے سخت مخالف تھے، اپنی اولاد میں کسی کو انگریزی نہیں پڑھنے دی، لیکن کبھی کسی انگریزی خواں کو حقیر نہیں سمجھا، بعض دفعہ کہتے کہ بعضے لوگ کوٹ پتلون میں آتے ہیں، دیکھنے میں بالکل صاحب لگتے ہیں مگر جب بات کرتے ہیں تو ان کے ایک ایک جملہ اور ایک ایک حرکت سے نیکی اور تقوی ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔"

کالجوں کے نوجوان طلبہ دعا کے لیئے اور بعض مرتبہ کوئی علمی سوال دریافت کرنے آتے، پہلے ان کی بات سنتے، پھر شفقت و محبت سے ان کو بتاتے، اگر کسی کے سر پر زیادہ بال ہوتے تو اس سے کہتے کہ دیکھو میاں، بال زیادہ رکھنے سے دماغ اور حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ تم اپنے بال منڈوا دو، حافظہ تیز ہوگا۔ رشتہ داروں کے بچے آتے، اگر ان کے سر پر زیادہ بال دیکھتے تو کہتے۔ جا سر منڈوا کر آ جا، دو روپے ملیں گے، اپنی اولاد پر بھی سختی نہیں کرتے تھے۔ ہم چھ بھائی ہیں، اور خدا کا شکر ہے سب حافظِ قرآن ہیں۔ رمضان آتا تو کہتے کہ اگر سارا دن میں اتنے پارے پڑھ لئے تو ایک روپیہ دوں گا، اسی طرح بچوں کو اور نوجوانوں کو نیکی پر آمادہ کرتے۔

دوسرے اہلِ علم اور خاص طور پر علماء، خطباء کو ہمیشہ اس بات سے منع کرتے کہ نام لے کر کسی کو کوئی بات نہ کہو، حضور علیہ السلام کا طریقۂ مبارکہ یہی تھا کہ کسی کی بات ناگوارِ خاطر گزرتی، حالانکہ حضور کو معلوم ہوتا کہ یہ ناروا عمل فلاں شخص نے کیا ہے، مگر مجلس میں کبھی اس کا نام نہ لیتے، یہی فرماتے کہ: نہ جانے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسا، اور ایسا کرتے ہیں، خود بھی عمومی انداز میں منع کرتے کہ ایسا کرنا مناسب نہیں ہے۔

عزیز و اقربا کو ہدیے بھیجتے رہتے۔ ہمیں بھی تلقین کرتے کہ جب کسی عزیز رشتہ دار کے ہاں جاؤ کوئی ہدیہ لے کر جاؤ، اس سے محبت بڑھتی ہے۔

خود صرف ان چند حضرات سے ہدیہ قبول کرتے جن سے خاص تعلق تھا، اور جن سے

مستقل میل جول تھا۔

مولانا محمد یوسف کاندھلوی مرحوم امیر تبلیغی جماعت کا تعلق ہمارے خاندان سے ہے، وہ جب لاہور آتے اور والد صاحب سے ملتے تو ان سے پوچھتے "کہ لاہور میں تمھارے فلاں فلاں رشتہ دار ہیں، تم ان سے ملے یا نہیں؟" ایک مرتبہ مولانا یوسف کہنے لگے! بھائی جی۔ وقت نہیں ملتا۔" فرمایا: عزیزوں سے ملنا بھی تبلیغ کا ایک جزو ہے جب لاہور آیا کرو، اپنے رشتہ داروں سے ضرور ملا کرو۔"

خود اپنا عمل بھی اس کے مطابق تھا۔ کراچی، راولپنڈی، بھاول پور جہاں بھی جاتے کوشش یہی کرتے کہ سب رشتہ داروں سے ملیں اور خود ان کے گھر چلے جاتے۔

کراچی میں اکثر مولانا احتشام الحق تھانوی کے ہاں قیام کرتے، لیکن ملنے کے لئے سب کے جاتے۔ میرے خالو اور ماموں[۱]، کراچی میں ہیں، ایک مرتبہ خالو نے کہا: بھائی جی! آپ کراچی آیا کریں تو ہمارے ہاں ٹھہرا کریں، سب کا دل خوش ہوگا۔" کہنے لگے۔ میاں اخلاق! یہ مولوی احتشام مجھے چھوڑتا نہیں، اس کی زبردستی کو یہاں آکر اترجاتا ہوں (مولانا احتشام الحق موجود تھے، اُنہی کے سامنے فرمایا) ہاں بچّوں سے ملنے ضرور آؤں گا۔

ایک مرتبہ خود ہی بلا اطلاع و دعوت ہمارے خالو کے دفتر میں (زیب النساء اسٹریٹ کراچی) دوپہر کے وقت پہنچ گئے۔ بالکل تنہا، وہ دیکھکر بڑے حیران ہوئے۔ سب دفتر والوں کو بھی تعجّب ہوا۔ اور پھر خود ہی کہا: میاں اخلاق! میں اس وقت کھانا تمھارے ساتھ یہیں کھاؤں گا، تو سب لوگ اور بھی حیرت میں ڈوب گئے۔ ہمارے خالو سے کہا: کہ کسی ہوٹل سے شوربا منگوالو، اور نان، وہ میں شوق سے کھاؤں گا۔ چنانچہ وہاں دفتر میں بیٹھ کر یہی کھایا اور اس کے بعد سب کو دعائیں دیتے ہوئے واپس چلے گئے۔

---

(۱) قاضی اخلاق احمد صدیقی ــــ، مولانا محمد یحییٰ (داماد علامہ شبیر احمد عثمانی)

کسی عزیز، رشتہ دار، یا جاننے والوں میں سے بھی کسی کی کوئی اچھی بات سنتے تو خوش ہوتے اور دعا کرتے۔ ہر ہر جاننے والے کے لیے اس کا نام لے کر دعاء مانگتے۔

اپنی ذاتی غرض کی بنا پر نہ کبھی کسی سے ملے، نہ کسی سے تعلق قائم کیا، اور نہ کسی سے ترک رسم وراہ کی۔

بارہا یہ بات کہی کہ: میں اگر دولت مندوں اور بڑے لوگوں کے آگے جھکتا تو نہ خود کو زندگی بھر ملازمت کرنا پڑتی، اور نہ میری اولاد کو۔" ظاہری اور مادی وسائل اور ذرائع ہوتے ہوئے ان سے منہ موڑنا، اور قناعت کے ساتھ زندگی گزار دینا، اس دور میں بلاشبہ ایک مافوق الفطرت کارنامہ ہے۔

جامعہ اشرفیہ سے پورے ۲۳ برس تعلق رہا، جس تنخواہ پر ۱۹۵۱ء میں آئے تھے، ۱۹۷۴ء تک وہی لیتے رہے۔ کئی بار مولانا عبید اللہ (مہتمم) اور مدرسہ کی مجلس شوریٰ نے تنخواہ بڑھانی چاہی، مگر والد صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرا کام اللہ چلا رہا ہے میں کوئی اضافہ کرانا نہیں چاہتا۔

اسفارِ حج وبلادِ عربیہ!

والد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے چار مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت عطا کی۔ پہلی بار آپ حج بیت اللہ کے لئے ۱۹۳۲ء میں گئے والدہ مرحومہ اور دونوں بڑے بھائی مولانا محمد مالک، مولانا محمد نعمان ہمراہ تھے۔

دوسری بار ۱۹۳۴ء میں تشریف لے گئے، اس وقت تنہا گئے اور زیارتِ حرمین سے فارغ ہو کر شام، لبنان اور فلسطین وغیرہ کی سیاحت کی اور چھ ماہ دمشق میں قیام کیا، اور وہاں رہ کر التعلیق الصبیح کی ابتدائی چار جلدیں طبع کرائیں۔ دمشق میں جامع اموی میں قیام رہا علماء اور مشائخ سے علمی ملاقاتوں اور مجالس کا سلسلہ رہتا، وہاں کی مجلس علمی کے شیخ اور بلند عالم شیخ بہجۃ البیطار جو بعد میں وہاں کے وزیر اوقاف اور شئون اسلامیہ کے عہدہ پر فائز ہوئے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا احترام کرتے تھے۔ بعد میں گاہ لگاہ ان کے خطوط بھی آتے تھے۔ جن میں ملاقات کا شوق اور دمشق میں جو علمی مجلسیں ہوتی تھیں ان کا تذکرہ ہوتا تھا۔

علماء شام خاص طور پر اس بات سے متاثر تھے کہ متعدد بار ان کو یہ محسوس ہوا کہ ہم اہل لسان ہونے کے باوجود فصاحت وبلاغت اور اصول عربیہ میں وہ مہارت نہیں رکھتے جو اس شیخ عجمی کو حاصل ہے۔

ایک دفعہ کسی مجلس کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ اس میں بہت سے علماء بھی تھے کسی گفتگو کے ذیل میں بدن سے بال اکھاڑنے کے آلہ کے لئے ایک صاحب نے لفظ منقاش استعمال کیا تو والد صاحب کی زبان سے اس کے لئے لفظ منماص نکلا، ایک عالم نے فوراً تحیر کے سے لہجہ میں دریافت کیا یا شیخ آپ نے یہ لغت اس معنی کے لئے کہاں سے اخذ کیا۔ فرمایا حدیث سے کیونکہ حدیث میں ہے لعن اللہ النامصات والمتنمصات کہ اللہ نے لعنت

فرمائی ہے ان عورتوں پر جو بالوں کو اکھاڑنے والی اور اکھڑوانے والی ہیں۔ تو فرمایا حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بال اکھاڑنے کے لئے لفظ نمص استعمال فرمایا، اس وجہ سے مناسب یہی ہے کہ بال اکھاڑنے والے آلہ کے لئے لفظ منماص ہی استعمال کیا جائے۔ اس نکتہ اور عربیت کے ذوق پر علمائے شام بہت محظوظ اور متاثر ہوئے۔

پاکستان بننے کے بعد بھی دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، پہلے ۱۹۵۰ء میں تشریف لے گئے۔ اس سفر میں علماء مکہ مکرمہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ بہت رہا۔ مکہ مکرمہ کے ایک جلیل القدر عالم شیخ علوی مالکی سید مانوس و متاثر تھے، بار بار ملاقات فرمایا کرتے، اسی طرح شیخ حسن مشاط بھی بڑی عقیدت اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے، مکہ مکرمہ میں ہمیشہ قیام مدرسہ صولتیہ میں رہتا۔ جہاں یہ حضرات علماء اور دیگر بلاد اور خاص طور سے ہندوستان سے آنے والے علماء ملاقات کے لئے تشریف لاتے رہتے۔ مولانا محمد سلیم صاحب جو حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی کے نبیرہ اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مہتمم اور ہمارے خاندانی بزرگ ہیں، والد صاحب سے بڑی محبت فرماتے تھے اور ان کے صاحب زادے برادر محترم مولانا شمیم صاحب تو ہر وقت ہر خدمت کے لئے مستعد و تیار رہتے۔ حق تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔ ان حضرات کی والہانہ محبت اور خدمت کو دیکھ کر والد صاحب یہ فرمایا کرتے تھے، بھائی میں تو مکہ آکر بھی ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اپنے گھر ہی میں ہوں۔

پاکستان میں دوسری مرتبہ ۱۹۶۵ء میں سفر حج فرمایا، اس کے بعد بار بار اس کی تمنا فرماتے تھے کہ دل چاہتا ہے کہ رمضان المبارک وہاں جاکر گزاروں۔ لیکن تصنیف و تالیف اور درس و تدریس ہی میں پورا سال گزر جاتا۔ پھر رمضان المبارک کے کچھ ایسے معمولات تھے کہ سفر میں ان معمولات کو پورا کرنا مشکل تھا اس وجہ سے تشریف نہ لے جاسکے۔

لاہور سے محبّت

والد صاحب کو برِ صغیر پاک و ہند کے تمام علاقوں اور شہروں میں جانے کا اتّفاق ہوا، مگر جتنی انسیت آپ کو لاہور سے ہوئی، کسی شہر سے نہیں ہوئی۔ اکثر کہا کرتے کہ: مجھے یہاں (لاہور میں) جتنا قلبی و ذہنی سکون ہے اتنا کسی اور شہر میں نہیں ہوا، فرماتے۔ اس گئے گزرے دَور میں بھی یہاں اللہ کے بڑے بڑے نیک بندے پڑے ہوئے ہیں۔

کئی بار حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ کے ایک مکتوب کا حوالہ دیا کہ انھوں نے اپنے ایک مرید کو جو لاہور میں مقیم تھا، لکھا کہ "لاہور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص نظر ہے۔ تم اس شہر کے لوگوں کی اصلاح و تربیت پر خاص توجہ دو۔ اگر اس شہر کی اصلاح ہو گئی تو پورا پنجاب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اس شہر کی اصلاح نہ ہو سکی تو پنجاب کی اصلاح ممکن نہ ہو گی۔"

جامع مسجد نیلہ گنبد میں ۲۱، ۲۲ سال وعظ و تقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمیشہ یہی کہتے کہ مجھے نیلہ گنبد کی مسجد میں وعظ کہہ کر تعب نہیں ہوتا اور اگر جسمانی طور پر تعب و مشقت بھی ہو تب بھی قلبی اور روحانی طور پر سکون اور خوشی محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ مجھے یہ یقین ہوتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں لوگ غور و توجہ سے سنتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے یہاں دورانِ تقریر انقباض ہوا ہو۔ البتہ ایک مرتبہ ملتان کے قریب ایک قصبہ کہروڑ پکا گئے وہاں تقریر کی۔ واپسی پر فرمانے لگے کہ: دورانِ تقریر جب مجمع پر میری نظر پڑ رہی تھی تو میں شرمندگی اور ندامت محسوس کر رہا تھا جو

لوگ میری تقریر سن رہے تھے وہ اگرچہ اہلِ علم وفضل نہ تھے مگر ان کے چہروں سے تقویٰ اور بزرگی کے آثار نمایاں تھے اور میں ان کے سامنے کچھ کہتا ہوا شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

۱۹۶۵ء کے جہاد ستمبر کے بعد لاہور سے محبت میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ دورانِ جہاد ہم نے یہ کیفیت دیکھی کہ ہر وقت اس فکر میں رہتے کہ مجاہدین کی فتح کی خبر معلوم ہو۔ میرے ذمہ یہ کام تھا کہ تمام نیوز بلیٹن غور سے سنوں، اور جو بھی مجاہدین کی اچھی خبر ہو وہ سناؤں۔

رات کو صحن میں سوتے، سب منع کرتے کہ پلنگ برآمدے یا کمرے میں کر لیں رات کو بار بار ہوائی حملے کا سائرن بجتا ہے۔ مگر صحن ہی میں سوتے، جب سائرن بجتا یا توپوں کی آواز اور دھماکے شدت اختیار کر جاتے تو اٹھ کر بیٹھ جاتے اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر مجاہدین کی فتح و نصرت کے لئے دعائیں مانگنے لگتے۔ کئی بار فرمایا: میرا دل چاہتا ہے کہ ان جگہوں پر جاؤں جہاں مجاہدوں نے کافروں کے خلاف جہاد کیا۔ اپنا خون دے کر اپنے ملک اور اپنی ماؤں بہنوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی، اور ان جگہوں کی مٹی کو بوسہ دوں ۔ کہ اس مٹی میں شہیدوں کا لہو شامل ہے۔

علمی آثار

٭ تصنیف و تالیف :

آپ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ اس مختصر سی کتاب میں ان کا احاطہ ناممکن ہے بلکہ تفصیلی طور پر ان کا ذکر بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن قدرت نے علم اور دین کی جو خدمت آپ سے لی ہے میں اس کا اجمالی ذکر کروں گا۔

وہ حافظِ قرآن ہیں، مجود ہیں، مفسّر ہیں، اس کے ساتھ قرآن کے شارح ہیں۔ اس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں، وہ محدّث ہیں، حدیث کے اسرار و نکات بیان کرنے والے ہیں۔ واعظ تھے۔ برہابرس مسند وعظ و ارشاد کو زینت بخشی ہے۔ اور لوگوں کی فکری، ذہنی اور روحانی ہدایت کا سامان فراہم کیا ہے۔ صوفی تھے۔ تصوّف کے رموز و غوامض کو فاش کیا ہے۔ وہ عام مجلسوں میں بھی علم و معرفت کے موتی بکھیرتے تھے، ہزاروں لوگ اپنے احوال و واردات ان کو پیش کرتے تھے، اور وہ ان کے تسلّی بخش جواب دیتے تھے۔

انھوں نے مختلف دینی موضوعات پر کتابیں اور رسائل لکھے، ان کی تصانیف برِ صغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں پھیلیں اور مسلمانوں کے لئے صلاح و فلاح کا ذریعہ بنیں بعض اہلِ علم نے ان کی متعدد کتب و رسائل کے انگریزی میں تراجم کئے۔

آپ کی تصنیف و تالیف کا عرصہ نصف صدی سے بھی کچھ زائد پر پھیلا ہوا ہے۔
آپ کی سب سے پہلی تالیف عربی ادب کی مشہور کتاب "مقاماتِ حریری" کی عربی شرح ہے جو آپ نے ۱۲ برس کی عمر میں لکھی۔ عیسوی کیلنڈر کے حساب سے آپ کی عمر ۸۴ برس ہوئی ہے وفات سے پندرہ روز قبل تک تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔
۷۲ برس کے عرصے میں آپ نے ایک سو کے قریب کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔
آپ کی مصنّفات / مؤلفات کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اثباتی انداز میں لکھی گئیں۔ اُن سے کسی خاص طبقے یا نظریے کا رد کرنا مقصود نہیں، ان میں خالص علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے اہلِ سنت والجماعت کے مسلک کو واضح کیا ہے۔
دوسری قسم میں وہ مؤلفات ہیں جن سے کسی خاص طبقے یا نظریے کا رد کرنا مقصود ہے۔ پہلی قسم کی کتب میں معارف القرآن، التعلیق الصبیح شرح مشکاۃ المصابیح، سیرۃ المصطفیٰ، عقائد الاسلام، اصول اسلام، الفتح السماوی شرح بیضاوی، مقدمۃ الحدیث، حل تراجم بخاری، مقدمۃ البخاری قابلِ ذکر ہیں۔
اور دوسری قسم میں علم الکلام، حیاتِ عیسیٰ، مسک الختام، احسن الحدیث فی ابطال التثلیث، اسلام اور نصرانیت، حجیت حدیث، حدوثِ مادہ و روح، اثباتِ صانعِ عالم وغیرہ نمایاں ہیں۔

تصانیف کی انواع:

آپ کی تصانیف، تالیفات اور رسائل کی تعداد جہاں ایک سو کے قریب ہے، وہاں ان کے موضوعات بھی مختلف اور متنوع ہیں۔ اکثر کتابیں اُردو زبان میں ہیں، بعض ضخیم کتب اور رسائل عربی میں ہیں۔ پھر یہ کہ آپ کی مؤلفات نثر اور نظم دونوں پر مشتمل ہیں۔

موضوعاتِ تالیفات:

تصانیف کا تمام تر حصہ خالصتاً دینی اور اصلاحی موضوعات سے متعلق ہے، زیادہ کُتب علوم قرآن، علوم حدیث، علم کلام، عقائد اور اصلاح و تربیت سے متعلق ہیں۔ فقہ کے موضوع پر آپ نے کوئی کتاب تالیف نہیں کی، اور نہ کبھی فتاویٰ کا کام کیا۔ ناچیز نے اور برادر بزرگ مولانا محمد مالک نے جب ہدایہ کا اُردو ترجمہ کیا تو بہت خوش ہوئے اور کئی بار یہ فرمایا: میں فقہ کی کوئی خدمت نہ کر سکا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری اولاد کو فقہ کی خدمت کرنے کی توفیق بخشی۔" (۱)

حقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے تین منابع بنیادی حیثیت رکھتے ہیں تصنیف و تالیف، درس و تدریس، اور دعوت و ارشاد۔ ایک ہی فرد کا ان تینوں شعبوں میں مساوی حصہ لینا، اور بھرپور کردار ادا کرنا، یہ بلاشبہ ایک امتیازی کارنامہ ہے۔

امتِ مسلمہ میں جن بزرگوں نے تبلیغِ دین کے ان تینوں شعبوں کا احاطہ کیا ہے ہم ان میں بلا کسی جھجک اور مبالغے کے موصوف کا نام بھی درج کر سکتے ہیں۔

مناظرے، آپ نے بہت کم کئے ہیں اور جو مناظرے کئے وہ قادیانیوں اور عیسائیوں کے خلاف کئے۔ بہت سے عیسائیوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ مسلمانوں کے مابین جو فروعی اختلافات ہیں، ان میں کبھی کسی عالم سے مناظرہ نہیں کیا۔ بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتب فکر کے علماء سے کبھی مناظرہ نہیں کیا۔ بلکہ اپنے احباب اور شاگردوں کو بھی منع کرتے تھے اور یہ فرماتے کہ پہلے ان لوگوں کی اصلاح کی فکر کرو جو سرے سے حضور کی سنّت کو مانتے ہی نہیں۔

---

(۱)۔ ہدایہ کا اردو ترجمہ میری بساطِ علم سے بڑھ کر تھا، اس لئے میں نے جلد اوّل میں یہ التزام رکھا کہ تمام مشکل مقامات کا ترجمہ کر کے والد صاحب کو دکھاتا تھا، جب وہ اس کی توثیق فرما دیتے تھے تب کاتب یا ناشر کے حوالے کرتا تھا۔ والد صاحب کی ہدایہ کے اردو ترجمہ پر مفصّل تقریظ ہے۔

فرمایا کرتے۔ جو لوگ علمِ غیب اور حاضر ناظر کی بحثیں کرتے ہیں وہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں فرمانے، حضورِ اقدس کی ذاتِ گرامی کو بحث و مناظرے کا موضوع بنانا گستاخی اور سوءِ ادب ہے۔

• قرآنِ حکیم کی خدمت :

اسلام میں علم اور ہدایت کا سب سے پہلا سفینہ، خود اسلام کا صحیفہ یعنی قرآنِ حکیم ہے۔ آپ نے اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل کی، وہ یقیناً ایک قابلِ فخر داستان ہے۔ بچپن میں قرآنِ پاک حفظ کیا، دارالعلوم دیوبند میں درسِ قرآن دیا۔ اور پھر زندگی کے ایک بڑے حصے میں تفاسیرِ قرآن پڑھاتے رہے، اور قرآنِ پاک کی ایک ضخیم اور بہترین تفسیر لکھی۔

• تفسیرِ قرآن :

دارالعلوم دیوبند میں طویل عرصے تک بیضاوی، اور ابن کثیر کا درس دیا۔ اس کے علاوہ دارالعلوم ہی میں نمازِ صبح کے بعد درسِ قرآن کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا۔ اس درسِ قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ تقریباً ہر جماعت اور ہر استعداد کے طلبہ کے علاوہ شہر کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی اس درس میں شریک ہوتے تھے۔ جامعہ عباسیہ بہاول پور میں بھی بخاری شریف کے علاوہ بیضاوی بھی پڑھاتے رہے پھر جامعہ اشرفیہ میں آنے کے بعد بھی کئی سال تک بخاری اور ترمذی کے علاوہ بیضاوی کا درس دیتے رہے۔

"معارف القرآن" کے نام سے قرآنِ حکیم کی ضخیم تفسیر بزبان اردو لکھی، اس تفسیر کے بارے میں اگر مختصراً یوں کہا جائے تو جامع تبصرہ ہوگا کہ یہ تفسیر سلفِ صالحین اور علمائے متاخرین

بے کے علوم و معارف کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

ترجمہ شاہ عبد القادر دہلوی رحمہ اللہ کا شامل کیا ہے۔ لفظی ترجمہ کے بعد رواں ترجمہ ہے جس میں قوسین میں ضروری تشریحات دی ہیں۔ آپ کو آیات و سُوَر میں ربط کا خاص ذوق تھا، اس ذوق کو اپنی تفسیر میں پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ آیات کی ضروری تشریح کے بعد فائدہ کے عنوان سے اسرار و نکات بیان کئے اور جا بجا فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی ہے۔ جہاں ایک طرف حافظ ابن کثیر، امام قرطبی، امام فخر الدین رازی، اور علامہ آلوسی کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ وہاں شیخ محی الدین بن عربی، حسن بصری اور مولانائے روم کے صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی نقل کئے ہیں۔ شکوک و شبہات کے جوابات بھی دیئے ہیں، تمام کتب تفسیر آپ کے پیش نظر ہیں اور مختلف ائمہ اور مفسرین کے اقوال نقل کر کے آخر میں قولِ راجح بیان کرتے ہیں۔

ماخذ میں سب سے زیادہ علامہ آلوسی کی روح المعانی اور امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر پر بھروسہ کیا ہے۔

معارف القرآن کے مقدمے میں تفسیر لکھنے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تفسیر قرآن کا پہلا بنیادی پتھر اس کا وہ صحیح ترجمہ ہے جو قواعد عربیت اور قواعدِ شریعت کے عین مطابق ہو۔ تفسیر قرآن کا یہ سنگِ بنیاد یعنی ترجمۂ قرآن شاہ ولی اللہ اور ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین کے ہاتھوں رکھا گیا، اور ہندوستان میں یہ خیرِ کثیر اسی خاندان کے ہاتھوں جاری ہوا۔

یہ تینوں ترجمے، تفسیر قرآن کے لئے سنگِ بنیاد بنے اور ہندوستان میں کوئی عالم ان سے بہتر ترجمہ نہ کر سکا۔

فہم قرآن کی پہلی منزل یعنی ترجمہ کی منزل گزر گئی تو اس کے طے ہو جانے کے بعد ضرورت

اس کی تھی کہ اردو زبان میں قرآن کی مختصر اور جامع تفسیر لکھی جائے جس میں فقط حلِ مطالب اور ربط آیات کا خاص اہتمام کیا جائے۔

یہ خدمت اور سعادت من جانب اللہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کے حصے میں آئی اور "بیان القرآن" کے نام سے (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۴ء میں) ایک تفسیر لکھی جو اپنی افادیت، جامعیت، اور مقبولیت میں ثریٰ سے ثریا تک پہنچ گئی۔

"تفسیر بیان القرآن سے کچھ عرصہ قبل مولانا عبدالحق دہلوی نے "فتح المنان" کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں حل قرآن اور توضیح مطالب کے علاوہ، یہود، نصاریٰ اور ملاحدہ کی تردید بھی ہے اور قدیم و جدید فلسفہ کے اشکالات کے بھی جوابات دیئے ہیں۔ لیکن مسلسل تشریح اور ربط آیات میں جو درجہ بیان القرآن کو حاصل ہوا وہ کسی تفسیر کو نہ ہو سکا۔

اسی طرز پر علامہ شبیر احمد عثمانی نے ایک مختصر اور جامع تفسیر لکھی جو جدید شبہات کے قلع قمع کے لیے کافی ہے اور فصاحت و بلاغت اور حسنِ تعبیر میں اپنی مثال آپ ہے۔

بحمدہ تعالیٰ جب یہ دو منزلیں طے ہوگئیں تو اب ضرورت اس کی ہوئی کہ بیان القرآن کے طرز پر ایک ایسی تفسیر لکھی جائے کہ جو مطالب قرآنیہ کی توضیح و تشریح اور ربط آیات کے علاوہ قدرے احادیث صحیحہ اور اقوالِ صحابہ و تابعین پر اور بقدر ضرورت لطائف و معارف اور نکات و مسائل مشکلہ کی تحقیقات اور ملاحدہ و زنادقہ کی تردید اور ان کے شبہات اور اعتراضات کے جوابات پر بھی مشتمل ہو تاکہ کلام خداوندی کی عظمت و شوکت اور اس جامعیت اور اس کے اعجاز کا کچھ نمونہ نظروں کے سامنے آجائے۔ پھر یہ کہ وہ ترجمہ اور تفسیر سلف صالحین کے مسلک سے ذرہ برابر ہٹا ہوا نہ ہو۔ عہدِ نبوت اور عہد صحابہ و تابعین سے

ے کر اس وقت تک امت کے علمائے ربانیین اور راسخین فی العلم نے
جس طرح قرآن حکیم کا مطلب سمجھا ہے، اسی طرح اس امانت کو بلا کسی خیانت
کے مسلمانوں تک پہنچا دیا جائے اور کسی جگہ بھی اپنی رائے، خیال اور نظریہ
کو قرآن کے نام پر پیش کر کے مسلمانوں کو دھوکہ نہ دیا جائے۔ جیسے آج کل بعض
آزاد طبع لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ قرآن کی تفسیریں لکھ کر اس لئے شائع کر رہے
ہیں کہ تاویل اور تحریف کے ذریعے قرآنی تعلیمات کو مغربی تہذیب و تمدن کے
مطابق کر دیں، ان آزاد مفسروں کی ہمہ تن یہ کوشش ہوتی ہے کہ اصطلاح
اسلامی ہو، اور معنی و مفہوم سراسر مغربی ہوں، اور یورپ کے ملحدین کے خیالات
باطلہ کو قرآن کے نام سے مسلمانوں میں پھیلا دیا جائے
اس ناچیز نے مسلمانوں کو اس فتنے سے بچانے کے لئے یہ تفسیر شروع کی کہ جیسا
مطلب قرآن حکیم کا، اللہ کے رسول نے اور صحابہ اور تابعین نے سمجھا ہے
وہی مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے تاکہ لوگ صحیح طور پر قرآن کو سمجھ سکیں اور
اس پر عمل کر سکیں۔ بغیر علم صحیح کے عمل صحیح ناممکن ہے۔ یہ ناچیز سلف صالحین
کے اتباع کو سعادت سمجھتا ہے اور سلف کے مسلک سے ہٹ کر تفسیر کو
ضلالت اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت سمجھتا ہے" (مقدمہ معارف القرآن)

یہ تو اس تفسیر کے لکھنے کی غرض و غایت، اور اس کا مختصر پس منظر بیان کیا، اس سے
آگے اس کا اسلوب اور انداز بیان بیان کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ کن کن امور کا لحاظ کیا
ہے اور کیا انفرادی اور امتیازی خصوصیات ہیں۔

خصوصیات کے بیان میں عجز و انکسار کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے وہ میں نے عصر حاضر کے
کسی مفسرین کے قلم اور تحریر میں نہیں دیکھا۔ ان کے مزاج اور طبیعت کا انکسار پورے طور پر تحریر میں
نمایاں ہے۔

لکھتے ہیں :

"اس حقیر و فقیر کی یہ تفسیر گداگر کی جھولی کی طرح ہے کہ جو قسم قسم کے کھانوں اور طرح طرح کے نوالوں سے بھرپور ہے، کوئی اس گدائے بے نوا سے پوچھے کہ تیرے پاس یہ قسم قسم کے کھانے کہاں سے آئے۔ تو وہ جواب میں یہ کہے گا کہ میں گدائے بے نوا ہوں مگر بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر بھیک مانگتا ہوں، وہاں سے جو ملتا ہے وہ سب کے سامنے لاکر رکھ دیتا ہوں۔ جسے جو کھانا اچھا معلوم ہو وہ کھالے یہی حال علم کے اس گدائے بے نوا کا ہے، اس تفسیر میں جو کچھ بھی علم ہے وہ سب کا سب خسروانِ علم و حکمت کے دستر خوانوں کی بھیک ہے۔

میں نے ان دروازوں کے نام بھی ظاہر کر دیئے ہیں جہاں سے یہ بھیک ملی ہے۔ تاکہ اگر کسی کو کچھ اور مانگنا ہو تو براہِ راست وہاں سے مانگ لے۔"

(مقدمہ معارف القرآن)

بعض اہم مسائل پر عجیب و غریب بحثیں کی ہیں، اور سلف کے اس قدر آراء و اقوال نقل کئے ہیں کہ دوسری تفاسیر میں یکجا نہیں ملتے۔ بعض آیات کے ضمن میں جو تفسیر و تشریح کی ہے اور مفسرین کے آراء نقل کئے ہیں، بعض نقل کرتا ہوں اس سے قارئین کو اندازہ ہو سکے گا۔

مثلاً قرآن حکیم کی آیت "والوزن یومئذ الحق" کی تفسیر میں سلف صالحین کی متعدد آراء نقل کی ہیں اور آخر میں قولِ راجح نقل کیا ہے۔

لکھتے ہیں :

"وزن اعمال کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے، جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ نفس اعمال کا وزن ہوگا قیامت کے دن جو چیز ترازو میں رکھی جائے گی وہ اعمال ہوں گے۔ اعمال اگرچہ اعراض ہیں اور غیر قائم بالذات ہیں مگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو اجساماً دبنادے گا یعنی

قیامت کے دن اعمال کو قابل وزن جواہر بنا دیا جائے گا۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ قیامت کے دن سورہ بقرہ اور آل عمران دو بادل یا دو چھتری یا دو پرندوں کی طرح آویں گی۔ اور حدیث میں ہے کہ مومن کی قبر میں ایک خوبصورت اور خوش رنگ اور خوشبودار جوان سامنے آئے گا تو مومن اس سے پوچھے گا تو کون ہے تو وہ کہے گا کہ میں تیرا عمل صالح ہوں اور کافر اور منافق کے حق میں اس کے برعکس ذکر فرمایا اور حدیث میں ہے کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان حبیبتان الی الرحمٰن سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم یعنی دو کلمے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں۔ اور ترازو میں بھاری ہیں اللہ کے نزدیک بہت محبوب ہیں۔ وہ دو کلمے یہ ہیں سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم، اس حدیث سے بھی نفس اعمال کا میزان میں تولا جانا ظاہر ہے۔

• دوسرا قول

اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اعمال تو نہیں تولے جائیں گے بلکہ اعمال نامے تولے جائیں گے یعنی وہ صحیفے جن میں فرشتوں نے بندہ کے اچھے اور برے اعمال لکھے ہیں۔ وہ تولے جائیں گے۔ جیسا کہ ترمذی اور مسند احمد کی حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص لایا جائے گا جس کے ننانوے (۹۹) سجل یعنی طومار نامۂ اعمال میزان کے ایک پلے میں رکھے جائیں گے اور ہر سجل (طومار) حدِ بصر تک ہوگا۔ اس کے بعد اس شخص کا ایک بطاقہ یعنی ایک پرچہ کاغذ لایا جائے گا جس میں لا الٰہ الا اللہ لکھا ہوگا، وہ شخص یہ کہے گا کہ اے پروردگار ان سجلات کے سامنے اس بطاقہ کی کیا ہستی ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تجھ پر ظلم نہ ہوگا۔ پھر اس بطاقہ کو ترازو کے دوسرے پلہ میں رکھ کر سب اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں فطاشت السجلات وثقلت البطاقۃ یعنی اس وقت گناہوں کے تمام طومار ہلکے ہو جائیں گے اور وہ پرچہ بھاری ہو جائے گا۔

یہ حدیث ترمذی میں ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ سب کے ساتھ نہ ہوگا بلکہ میدانِ حشر میں صرف ایک شخص کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا، تاکہ لوگوں پر کلمہ توحید کا وزن اور ثقل ظاہر ہو جائے کہ یہ کلمہ کس قدر وزنی ہے کہ توحید کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ مقصود نمونہ دکھلانا ہوگا۔ لہٰذا نمونہ کے لئے ایک ہی شخص کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا۔

• تیسرا قول:

اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ خود صاحب عمل کو تولا جائے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ایک بڑا موٹا شخص لایا جائے گا اور اس کو تولا جائے تو وہ ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ نکلے گا۔ بظاہر یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ سب کافروں کے ساتھ نہ کیا جائے گا بلکہ صرف ایک کافر کے ساتھ کیا جائے گا تاکہ اہلِ محشر پر کافر کی خفت اور اس کا بے حقیقت اور بے وقعت ہونا سب کو آنکھوں سے نظر آجائے۔

حافظ ابنِ کثیر۔ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ان اخبار و آثار میں توفیق اور تطبیق بھی ممکن ہے، وہ یہ کہ یہ کہا جائے کہ یہ سب امور حق اور درست ہیں، کبھی نفسِ اعمال کا وزن ہوگا اور کبھی صحائف اعمال یعنی نامہائے اعمال کا وزن ہوگا اور کبھی صاحبِ اعمال کا وزن ہوگا۔

ان اقوال میں سب سے زیادہ صحیح اور راجح پہلا قول ہے کہ نفسِ اعمال کو تولا جائے گا اور سلف صالح اکثر اس کے قائل ہیں اور اعمال اگرچہ بظاہر اس وقت اعراض معلوم ہوتے ہیں کہ جو بظاہر ایسی چیز نہیں کہ جو تولی جائے۔ لیکن یہی اعمال جو اس دنیا میں اعراض ہیں قیامت کے دن ان کو اعیان اور اجسام کی صورت میں مجسّم بنا دیا جائے گا اور خود نفسِ اعمال کو ترازو میں رکھ کر تولا جائے گا جس نے عمل کو اخلاص کے ساتھ اور بروقت اور برمحل کیا ہوگا۔ اس کا عمل ثقیل اور وزنی ہوگا اور جس نے ریاکاری سے شرع کے خلاف کام کیا ہوگا وہ ہلکا ہو جائے گا۔"

سورۂ آلِ عمران کی آیت "یا ایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین کفروا" کی تفسیر کے ضمن میں تشبہ بالکفار کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے عقلی اور نقلی دلائل بیان کرتے ہیں :

"اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ تشبیہ اور مشابہت سے منع فرماتے ہیں کہ اخلاق و عادات اور لباس و معاشرت میں ان کے مشابہ نہ بنیں۔ حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم کافر نہ ہو۔ بلکہ یہ فرمایا کہ۔ کافروں کے مشابہ نہ ہو، کافر بننا اور چیز ہے، اور کافروں کے مشابہ ہونا اور چیز ہے، اور باغی بننا اور چیز ہے، اور اوباشوں کے مشابہ اور ہم رنگ بن جانا اور بات ہے۔

حدیث میں ہے : من تشبہ بقوم فھو منھم ، جو شخص کسی قوم کے مشابہ بنتا ہے، وہ انہی میں شمار ہوتا ہے۔ جیسے پاکستان کا کوئی فوجی سپاہی، بھارت کے فوجی سپاہی کی وردی پہن لے تو اگر مسلمان سپاہی اس کے گولی مار دے تو جرم نہ ہوگا۔ یا کوئی افسر سرکاری دفتر سے پاکستانی پرچم اتار کر بھارت کا جھنڈا دفتر پر لگا دے تو اسی وقت قابلِ معزولی ہوگا۔ اگر وہ افسر یہ تقریر کرنے لگے کہ میں نے صرف ایک کپڑے کا ٹکڑا اور لکڑی کا ڈنڈا ہی بدل دیا ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ میں حکومت پاکستان کا مخالف ہوں۔ تو کیا حکومت کے نزدیک اس کی یہ تقریر دل پذیر اسے معزولی اور سزا سے بچا سکے گی۔؟

اسی طرح سمجھو کہ احکم الحاکمین یہ حکم دیتا ہے کہ جن کو ہم نے اپنی کتاب میں مغضوب اور ملعون قرار دیا ہے، ان کے تشبہ سے پرہیز کرو۔ حیرت ہے کہ مجازی اور فانی حکومت میں تو دشمنانِ حکومت کا تشبہ بالاتفاق قبیح اور ممنوع ہو، اور احکم الحاکمین کے دشمنوں سے تشبہ کا جب ذکر آتا ہے تو اس کو تنگ نظری کہا جاتا ہے، بلکہ دشمنوں کے ساتھ تشبہ کی ممانعت اور قباحت کا مسئلہ کافروں کے نزدیک بھی مسلّمہ ہے۔ بھارت کے کسی فوجی سپاہی کی یہ مجال نہیں کہ وہ مسلمانوں کا سا لباس استعمال کرے۔

نہ معلوم ان مغرب زدہ ذہنیتوں کی غیرت کہاں چلی گئی، خوب سمجھ لو کہ اپنے مذہبی اور

قومی شعار و امتیاز کو چھوڑ کر غیر قوم کے شعار اور امتیاز کو اختیار کرے اوّل تو یہ غیرت کے خلاف ہے۔ دوم یہ غیروں کا تشبہ عملی طور پر اپنی کمتری، اور دوسری قوم کی برتری کے اعتراف کے مترادف ہے۔ دنیا کا طریق ہے کہ ادنیٰ، اعلیٰ کے اتباع کو اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتا ہے' اور پھر رفتہ رفتہ اپنے قومی امتیازات کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

زاہد اتسبیح میں زنار کا ڈورا نہ ڈال
یا برہمن کی طرف ہو، یا مسلماں کی طرف "

(معارف القرآن۔ ج: ۲، ص: ۱۶۹، ۱۷۰)

علمِ حدیث کی خدمت:

شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اوّلین منبع کتاب اللہ ہے اور اس کے بعد حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خدا نے آپ کو جس طرح قرآن پاک کی خدمت کا موقع عطا کیا، اور آپ اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں سے قرآن پاک کی تفسیر اور ترجمہ پڑھاتے رہے اور علوم قرآن سے متعلق مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف کیں، اور سب سے اہم خدمت اور عظیم کام ایک مفصل اور مبسوط تفسیر لکھ کر سر انجام دیا، اسی طرح قدرت نے رشد و ہدایت کے دوسرے سرچشمے سے سیراب ہونے کی سعادت بخشی، اور پھر درس و تدریس، وعظ و تقریر اور تصنیف و تالیف کے ذریعے یہ فیض ہزاروں، لاکھوں بندگانِ خدا تک پہنچایا۔

دارالعلوم دیوبند میں جب تحصیلِ علم کے بعد مدرس ہوئے اس وقت بھی بارہا مشکوٰۃ شریف پڑھائی۔ پھر دوبارہ ۱۹۳۹ء میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے دارالعلوم میں آئے تو کئی برس بیضاوی کے علاوہ ابوداؤد بھی زیرِ درس رہی۔

حیدرآباد دکن میں تقریباً دس برس قیام رہا۔ وہاں کے دورانِ قیام تصنیف تالیف کی عظیم خدمات انجام دیں، خاص طور پر مشکوٰۃ شریف کی شرح کی وہیں کے دورانِ قیام سعادت ملی۔ اور اس کی ابتدائی چار جلدیں بڑے اہتمام سے دمشق جاکر طبع کرائیں۔

جس طرح تفسیر معارف القرآن، اسلاف کے علوم کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اسی طرح تعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح بھی سلف صالحین کی تحقیقات کا لبِ لباب ہے، ائمہ اربعہ میں جہاں اختلاف مسالک ہے، وہاں سب کے دلائل بیان کرتے ہیں مگر ترجیح امام ابوحنیفہ کے مسلک کو دیتے ہیں۔

تعلیق الصبیح کے بنیادی مآخذ طیبی اور تورپشتی ہیں۔

خدمت حدیث کے سلسلے میں تعلیق الصبیح یقیناً بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ ایک ایسا کارنامہ جس کو علمائے ہند کے علاوہ مصر، شام اور حرمین شریفین کے علماء نے قابلِ فخر قرار دیا۔ مگر ناچیز کے خیال میں اس سے بڑی اور اہم خدمت بخاری کے حلِ تراجم ہیں۔

صحیح بخاری کے ابواب اور تراجم کی اہمیت ہمیشہ علماء کی نظر میں بہت زیادہ رہی دورانِ درس اساتذہ، ابواب و تراجم کی مراد پر بسیط بحثیں اور تقریریں کرتے ہیں لیکن اس احساسِ اہمیت کے باوجود یہ عجیب اتفاق ہے کہ بخاری کی بے شمار شروح لکھی جانے کے باوجود علماء نے حلِ تراجم کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور مستقل طور پر کسی دور میں کسی عالم نے حلِ ابواب و تراجم پر کام نہیں کیا۔

سب سے پہلے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کو اس کا خیال ہوا، اور انھوں نے اُردو میں بخاری کے ابواب و تراجم کا حل لکھنا شروع کیا مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی، ایک پارہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

والد صاحب نے اس کام کی طرف توجہ کی، اور عربی میں بخاری کے ابواب و تراجم کا حل لکھنا شروع کیا۔ اور خدا کی توفیق و تائید سے اسے مکمل کیا، مگر ابھی تشنۂ طباعت ہے۔ اگر موزوں سائز پر عربی ٹائپ میں چھاپا جائے تو کم و بیش تین ہزار صفحات پر مشتمل ہو گا۔

یہ بلاشبہ علمِ حدیث اور علمِ نبیؐ کی ایسی خدمت ہے جس میں موصوف کو تقدم کا شرف حاصل ہے۔

عربی میں مسودہ مکمل کرنے کے بعد آپ کو خیال ہوا کہ اگر اس کو قدرے مختصر اور ملخص کر کے اردو میں منتقل کر دیا جائے تو اس کا افادہ عام ہو سکے گا، اور علماء کے علاوہ طلباء اور اُردو داں طبقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے گا، اس خیال کے پیشِ نظر عربی مسودہ کو مختصر کر کے اردو میں منتقل کرنا شروع کیا۔ ابھی دس پارے کا مسودہ مکمل ہوا تھا کہ خالقِ حقیقی کا پیغام آ پہنچا۔

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: آدمی کو جب کچھ آتا ہے تو اس کے جانے کا وقت قریب آجاتا ہے،

نیز فرمایا کرتے۔ علم، ہم سے کہتا ہے کہ تم اپنا سب کچھ مجھے دے دو، پھر مجھ میں سے تھوڑا سا لے لو۔

"مقدمۃ الحدیث" کے عنوان سے تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک مسودہ ہے۔

مقدمۃ البخاری، کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا جس میں امام بخاری رحمہ اللہ کے مختصر احوال، بخاری کی امتیازی خصوصیات، اور صحاح ستہ میں اس کے مقام پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی۔

حجیتِ حدیث پر ایک مستقل کتاب، اور متعدد مضامین لکھے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد پانچ چھ برس انکارِ حدیث کا فتنہ عروج پر رہا۔ اس پورے عرصے میں حجیتِ حدیث پر ملک کے مختلف حصوں میں انتہائی مدلّل اور عالمانہ تقریریں کیں، حجیتِ حدیث پر جامع مسجد نیلا گنبد لاہور میں جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر آپ نے جو تقریر ۱۹۵۲ء میں کی تھی، وہ اس کے سننے والے کبھی نہیں بھولیں گے۔ یہ تقریر تین مختلف نشستوں میں پوری ہوئی تھی، اور مجموعی طور پر ساڑھے پانچ گھنٹے ہوئی تھی۔

عقائد اور علم کلام:

تفسیر اور حدیث کی خدمت کے بعد، اسلامی عقائد اور علم کلام پر بھی آپ نے اپنے ہم عصر علماء میں سب سے زیادہ کام کیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے وابستگی کا جو دورِ اوّل تھا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک، اس دوران آپ نے علم الکلام کے نام سے ایک کتاب تالیف کی، اس موضوع پر تالیف سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ ماضی قریب میں علامہ شبلی نعمانی سے "الکلام" میں بعض مقامات پر جو لغزشیں ہوئی ہیں۔ اور انھوں نے اہلِ سنّت والجماعت کے مسلک سے عدول کیا ہے، اس کی اصلاح کی جائے اور اسلام کے نام پر جو بعض مسالک ایسے وجود میں آگئے جو درحقیقت قرآن و سنّت

کے بنیادی اصول اور عقائد کے خلاف ہیں، ان کا رد کیا جائے۔ اور اہلِ سنّت کا مسلک عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں واضح کیا جائے۔

علم الکلام میں آپ نے اساسیاتِ اسلام پر بڑے محکم انداز میں بحث کی ہے، اور ان کی حقانیت پر قرآن و سنّت کے علاوہ بے شمار عقلی دلائل ذکر کئے ہیں۔

عقائد اور ارکان اسلام کے اثبات میں امام غزالی، حافظ ابن تیمیہ، مجدّد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ نے جو دلائل بیان کئے ہیں، اس ایک کتاب میں ان کو جمع کر دیا ہے۔ شیخ محی الدین بن عربی اور مولانائے روم کے اسرار و نکات بھی مناسب مواقع پر ذکر کئے ہیں۔ کتاب کتنی پر مغز اور دلائل سے بھرپور ہے، اس کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر چند اقتباسات ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

خدا خالقِ خیر بھی ہے، اور خالقِ شر بھی، اس موضوع پر مختلف عقلی دلائل کے ضمن میں لکھتے ہیں:

اگر کوئی خوش نویس دیدہ و دانستہ کوئی لفظ برا لکھے یا کوئی کوزہ گر باختیار خود کوئی کوزہ ترچھا بنائے تو برا صرف اس لفظ اور کوزہ کو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس خوشنویس اور کوزہ گر کو کوئی برا نہیں کہہ سکتا، اسی طرح حق تعالیٰ کو خیر و شر دونوں کا خالق مانا جائے تو اس کی طرف کوئی برائی نہیں منسوب کی جا سکتی برا فقط اس شئے کو کہا جائے گا کہ جس کے ساتھ شر قائم ہے۔

تماشا کرنے والے پتلیوں سے کبھی اچھا کام لیتے ہیں اور کبھی برا کبھی ان کو بادشاہ اور وزیر بناتے ہیں۔ کبھی ان کو دہقان اور جاروب کش بناتے ہیں۔ کبھی کسی طرح نچاتے ہیں اور کبھی کسی طرح، بہر حال سب یہی کہتے ہیں کہ فلاں پتلی خوب ناچتی ہے اور فلانی بری، یہ کوئی نہیں کہتا کہ پتلی والا خوب ناچا یا برا ناچا یہ بھی اس کا کمال سمجھا جاتا ہے، اس لئے کہ اس کی غرض جو کہ تماشا ہے وہ دونوں صورتوں میں حاصل ہے۔ غرض یہ کہ اس میں کوئی ہرج نہیں کہ ایک شئے کسی اعتبار سے بری ہو اور دوسروں کے اعتبار سے اچھی، مثلاً رہزنوں کو مارنا اور قید کرنا ان کے حق میں گو برا

ہے مگر بادشاہ کی سلطنت اور انتظام مملکت کے لئے مستحسن ہی نہیں بلکہ ضروری اور واجب ہے۔ خیر خواہان حکومت کے لئے انعام واکرام اس درجہ ضروری نہیں جتنا کہ باغیوں اور رہزنوں کا استیصال ضروری ہے۔ آفتاب کا نور ہر ناپاک اور پاک چیز پر پڑتا ہے مگر اس سے آفتاب کا نور ناپاک نہیں ہو جاتا۔ بلکہ الٹا اسے بھی منور کر دیتا ہے۔ نور بصر ہر قسم کی چیز پر واقع ہوتا ہے۔ آنکھ جس طرح شیشہ کو دیکھتی ہے۔ اسی طرح توے کو بھی دیکھتی ہے مگر توے کی سیاہی سے آنکھ میں کوئی نقص نہیں آجاتا۔ علم ہر بھلی اور بری چیز کا ہوتا ہے۔ مگر معلوم کے برے ہونے سے علم کی برائی لازم نہیں آتی، معلوم اور مبصر اگر برا ہو تو بصر اور علم کا کیا قصور ہوا بلکہ بصر کا کمال ہی یہ ہے کہ ہر قسم کی چیز کو دیکھ سکے۔ علیٰ ہذا علم کا کمال ہی یہ ہے کہ اس کی وساطت سے ہر بھلی اور بری چیز منکشف ہو جائے۔ اسی طرح اگر حق تعالیٰ کی ایجاد ہر خیر و شر ایمان اور کفر۔ مومن اور کافر سب ہی پر وارد ہو تو اس سے ایجاد اور موجد میں کوئی نقص نہیں لازم آتا۔ (۱)

انسان نہ قادر مطلق ہے، اور نہ مجبور محض، جبریہ اور قدریہ کے مسلک کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

اہلِ حق نے جب یہ دیکھا کہ فرقۂ قدریہ اس عقدہ کو حل کر سکا اور نہ فرقہ جبریہ اس لئے اہلِ حق متوجہ ہوئے کہ طالبانِ حق کے سامنے عقل اور نقل کی روشنی میں ایسی تشفی بخش پیش کی جائے کہ جس سے قلوب مطمئن ہو جائیں اور خصوصاً پیش کردہ شبہات کا قلع اور قمع ہو جائے۔

اہلِ حق کہتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ انسان نہ تو خالق اور فاعل مستقل ہے اور نہ شجر اور حجر کی طرح مجبور محض ہے۔ ایک بین بین حالت میں ہے۔ بندہ اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل نہیں۔ فاعل مستقل اور خالق تو ہر شے کا خدا تعالیٰ ہی ہے لیکن اس قادر مطلق اور مختار کل نے کچھ قدرت اور اختیار اور ارادہ بندہ کو بھی عطا کیا ہے کہ جس سے بندہ اپنے مولیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کر سکے۔ اسی وجہ سے بندہ کو سب کہا جاتا ہے اور اس خداداد قدرت اور اختیار

---

(۱) علم الکلام۔ ص: ۳۳، ۳۴

سے بندہ جو فعل کرتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں اس کو کسب کہتے ہیں اور اسی وجہ سے بھلائی اور برائی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور اسی کسب پر مدح اور ذم کا مستحق ہوتا ہے اور اسی پر جزا و سزا ثواب ملتا ہے۔

چلا عدم سے میں ہستی کو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

لہٰذا برے افعال کے ارتکاب سے بندہ ہی کو برا کہا جائے گا۔ خالق ہونے کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی برائی منسوب نہیں کی جاسکتی۔ تلوار چلانے والے ہی کو قاتل کہا جاتا ہے۔ تلوار بنانے والے کو نہ کوئی قاتل کہتا ہے اور نہ کوئی برائی اس کی طرف سے منسوب کی جاتی ہے۔ تلوار بنانا تو کمال ہی کمال ہے لیکن اگر اس کا استعمال بے محل ہے تو وہ بلاشبہ معیوب اور مذموم ہے۔ رنگریز کو اسود یعنی سیاہ نہیں کہا جاسکتا جو کپڑا سیاہ رنگ میں رنگا گیا ہے اس کو سیاہ کہا جائے گا۔ اسی طرح کافر اور گمراہ وہی کہلائے گا جو کفر اور ضلالت کی سیاہی میں رنگین ہے جس نے کفر اور ضلالت کی سیاہی کو پیدا کیا اور اس کی طرف کوئی برائی منسوب نہیں کی جاسکتی۔ اس اخلاقِ عالم نے تو سیاہ اور سفید، کفر اور ایمان ہر قسم کے رنگ پیدا کئے اور تمھارے سامنے کردیئے اور خوب اچھی طرح تبلا دیا کہ یہ رنگ اچھا ہے اور یہ برا ہے، بھلے اور برے میں امتیاز کے لئے تم کو عقل دی کرنے اور نہ کرنے کی، تم کو قدرت دی اور اس پر بھی اگر کوئی ایمان کے صاف اور سفید رنگ کو چھوڑ کر کفر کی سیاہی اپنے قلب کو لگا لے تو یہ اس کا قصور ہے۔" (۱)

"عقائد اسلام" میں بھی اہل سنت والجماعت کے مسلک کو واضح کیا ہے۔

کلمہ اسلام: لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، کی مختصر تشریح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

(۱)۔ علم الکلام۔ ص: ۵۵۔

"اسلام کے معنی عربی زبان میں کسی کے سامنے گردن جھکا دینے کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں اسلام کے معنی یہ ہیں کہ نبی آخر الزماں کی ہدایت کے مطابق اپنے خداوند کریم کے سامنے گردن جھکا دینے اور اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کے ہیں۔ اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے جس کے دو رکن ہیں، پہلا رکن توحید ہے اور دوسرا رکن رسالت ہے۔ لا الہ الا اللہ میں توحید کا بیان ہے اور محمد رسول اللہ میں رسالت کا بیان ہے بغیر توحید و رسالت کے اقرار کے آدمی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

لا الہ الا اللہ

لفظ الہ باعتبار اپنے ماخذ اور مصدر کے دو معنی کا احتمال رکھتا ہے ایک یہ کہ وہ ذات کہ جو اپنے جلالی و جمالی کمالات کے باعث قابلِ عبادت اور لائقِ پرستش ہو اور دوم یہ کہ وہ ذات کہ جو اپنی بے انتہا خوبیوں کے سبب سے اس کی طرف متوجہ ہونے والوں کو حیرت میں ڈال دے۔

پس اگر کلمہ لا الہ الا اللہ میں معنی اول کے اعتبار سے الہ کی نفی مراد ہو تو اس تقدیر پر کلمہ شریف کا مطلب اس طرح بیان کیا جائے گا کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی ذات ایسی نہیں کہ جو اس قدر جلال و جمال اور کمال بے مثال کے ساتھ موصوف ہو جس کی بنا پر وہ معبود ہونے کے لائق ہو سکے۔ اس کے جلال و جمال کی کوئی حد اور نہایت نہیں، اور اس کے جود و نوال کی کوئی غایت نہیں لہٰذا اس کے سوا کوئی قابلِ عبادت اور قابلِ پرستش نہیں، اور اگر لفظ الہ سے دوسری معنی مراد لیتے ہیں تو اس لحاظ سے کلمہ توحید کا مطلب یہ ہو گا کہ تمام دائرہ وجود میں اللہ کے سوا کوئی موجود ایسا نہیں، کہ جو اپنے بے شمار محامد و محاسن کی وجہ سے نظارہ کرنے والوں کو ایسی حیرت میں ڈال دے کہ وہ ایسی حیرت میں پڑ کر از خود رفتہ ہو جائیں اور اس بے خودی کے عالم میں اپنی ہستی کو بھول جائیں اور وہ اس حسن و جمال اور کمال بے مثال کے سامنے سر بسجود ہو جائیں اور تہ دل سے پروانہ کی طرح نور الانوار پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ الہ سے مراد خواہ قابلِ عبادت اور لائقِ پرستش کے معنی مراد ہے، اور

خواہ متحیر اور بے خود کرنے والے کے معنی مراد ہوں۔ بہر صورت اس معنی کا مصداق حقیقی سوائے اللہ کے کوئی نہیں، نہ مادہ اور طبیعت میں یہ صلاحیت ہے اور نہ نیچر اور ایتھر میں یہ لیاقت ہے کہ وہ خدا بن سکے، سب کا خالق اور مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے دہر اور نیچر سب اس کے مخلوق اور مملوک ہیں اور وہی خدا ان دونوں کا خالق اور مالک ہے۔

سیبویہ جو صرف، نحو کا امام عالی مقام ہے، اس نے کہا کہ لفظ اللہ دلہ سے مشتق ہے جس کے معنی حیرانی و سرگردانی کے ہیں اور لفظ اللہ کے یہ معنی بتاتے ہیں کہ لوگ سرگران اور حیران ہو کر اپنی حاجتوں میں بصد عجز و زاری اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس سے التجا کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اے اللہ ہم اپنی حاجتوں میں تیری طرف رجوع کرتے ہیں اور اس سے التجا کرتے ہیں اور ان کو طلب کرتے ہیں تو تیرے پاس ان کا حل پاتے ہیں اور تیری بارگاہ سے ہماری حاجتیں پوری ہوتی ہیں اور کلمہ شہادت کو کلمۂ توحید اور کلمہ اخلاص بھی کہتے ہیں اور لا الہ الا اللہ کو کلمہ نفی و اثبات بھی کہتے ہیں، لا الہ میں ان تمام معبودوں کی نفی ہے جو خدا کے سوا ہیں یعنی کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں اور کوئی اس کے مثل اور مانند نہیں، اور کوئی اس کے سوا صانع اور مدبر عالم نہیں اور کوئی اس کا شبیہ اور نظیر نہیں اور الا اللہ اثبات ہے یعنی وہ موجود برحق ہے اور معبود برحق اللہ ہے اور تمام صفات کمال میں یکتا اور یگانہ ہے اور تمام چیزوں کا مدبر اور ان میں متصرف ہے، لفظ اللہ ان تمام معانی کا جامع ہے جو شخص کلمہ لا الہ الا اللہ ان معانی کے لحاظ سے پڑھے وہ تمام انواع کفر و شریک سے پاک ہو جائے اور اہل توحید میں داخل اور شامل ہو جائے اور توحید کا دار و مدار پانچ چیزوں پر ہے۔

(۱)۔ اوّل یہ کہ خدا تعالیٰ کو تمام اسماء حسنیٰ و صفات اعلیٰ کے ساتھ حقیقتاً موصوف ہو جانے اور ان میں ایسی تاویل نہ کرے جو حقیقت سے نکل کر مجاز کے حد میں داخل ہو جائے۔ یہ یہ ایک قسم کی تعطیل ہے۔

(۲)۔ دوم یہ کہ بندہ کو اپنے افعال کا خالق نہ کہے۔ کفر اور معصیت سے اللہ کے ارادہ اور مشیت کی نفی نہ کرے یہ ایک طرح کی تشریک ہے۔

(۳)۔ سوم یہ کہ خدا کی صفات کو مخلوقات کی صفات پر قیاس نہ کرے جس سے خدا اور مخلوق میں مماثلت اور مشابہت شامل ہو جائے، یہ ایک قسم کی تشبیہ اور تمثیل ہے۔۔

(۴)۔ چہارم یہ کہ مادہ اور روح کو قدیم نہ کہے اور یقین رکھے کہ اللہ کے سوا سب چیزیں اللہ کی مخلوق اور حادث ہیں۔ مادہ اور روح کو قدیم ماننے میں تعلیل کا شائبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم کا خالق نہیں، بلکہ علتِ موجبہ ہے۔ جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں۔

(۵)۔ پنجم یہ کہ نظام کائنات اور تنوعات عالم کو طبائع اور کواکب و نجوم کی تاثیر کا نتیجہ نہ سمجھے۔ اس سے تدبیر الٰہی میں تشریک مفہوم ہوتی ہے۔ امید ہے کہ جو شخص ان معانی کا لحاظ کر کے کلمۂ توحید پڑھے تو اس نے توحید کا حق ادا کرے۔

محمد رسول اللہ

یہ کلمہ اسلام کا دوسرا رکن ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام عالم کے باشندوں کو یہ حکم ہے کہ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خالق و مالک کا رسول یعنی فرستادہ اور پیغام رساں مانیں اور جو اس نے پیغامات سنائے اور جو احکام پہنچائے ان کو حق اور صدق جان کر بے چون و چرا دل و جان سے تسلیم کریں اور سر مو ان میں شک نہ کریں اور تمام احکام کو واجب التعمیل جانیں اور اخلاص و نیاز مندی کے ساتھ نبی کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دیں اور اس کی طاعت کو خدا تعالیٰ کی اطاعت جانیں" (۱)

حقیقت یہ ہے کہ والد صاحب نے عقائد اہل سنت والجماعت کے اثبات اور مسائل کلامیہ کی تحقیق و تشریح میں جو ٹھوس اور بنیادی کام کیا اس کے تعارف کے لئے حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا یہ جملہ لکھ دینا کافی ہے۔ جو موصوف نے حضرت والد

(۱) عقائد الاسلام ۔ ص:

صاحب کی کتاب علم الکلام کے بعض مباحث سننے اور مطالعہ کرنے کے بعد فرمایا مجھے اگر زندگی میں کسی کے علم کو چرانے کا خیال پیدا ہوا تو وہ مولانا آپ کا علم ہے جی چاہتا ہے اسے چرا لوں"
اور اس موضوع پر امام غزالی، حضرت مجدد الف ثانی، اور شاہ ولی اللہ نے علوم و معارف کا جو خزانہ جمع کیا تھا، اس کو سہل اور عام فہم انداز میں مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ علم الکلام، عقائد الاسلام، اصول اسلام، نظامِ اسلام، دعوتِ اسلام، یہ تمام کتابیں انہی حضرات کے علوم کی ترجمان ہیں۔

چند سال پیشتر ملک میں، بلکہ مختلف بلادِ اسلامیہ میں یہ فتنہ اٹھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس تحریک کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ خود مسلمان مؤلفین نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ہدف بنایا۔ ہمارے وطن عزیز پاکستان میں بھی بعض ایسی تحریریں شائع ہوئیں جن میں سخت انداز میں خلیفہ راشد پر تنقید کی گئی تھی، ان تحریروں میں سب سے زیادہ تحریر جو علماء کی نظروں میں قابل اعتراض تھی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" تھی۔

حضرت عثمان کو ہدف بنانے کی تہ میں نہ کوئی علمی تحقیق تھی، اور نہ تاریخی حقائق و واقعات کا کھوج اور تفحص، بلکہ چند ایسے غیر مستند تاریخی حوالوں کو بنیاد بنایا گیا جن کی خود محققین نے تردید فرمائی ہے۔ حضرت والد صاحبؒ نے اس طرح کی بعض تحریریں دیکھیں تو بہت ملول ہوئے۔ ایک روز ناچیز راقم اور حکیم انیس احمد صدیقی بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے:

> "چند سال پہلے نسبتِ رسول کی محبت کا انکار کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس فقیر سے خدمت لی، مختلف مضامین لکھے، ملک کے مختلف حصوں میں تقریریں کیں۔ اور حجیت حدیث کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اہلِ علم نے اس کتاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اب لوگوں نے حضرت عثمان غنی کی ذات کو ہدف بنانا شروع کر دیا، مولوی صاحب! یہ صرف عثمان غنی پر تنقید

یا تنقیص کا معاملہ نہیں۔ اگر خدانخواستہ عثمان غنی کی عدالت و ثقاہت مجروح ہوتی ہے، تو قرآنِ کریم کی قطعیت کو بھی ایسے لوگ زیرِ بحث لا سکتے ہیں۔ کیونکہ حضرت عثمان ہی تو جامع قرآن ہیں، مولوی صاحب یہ خطرناک بات ہے۔ عثمان غنی کی ثقاہت و نزاہت کے بارے میں شاہ ولی اللہ نے جیسا لکھا ہے، ایسا کوئی نہیں لکھ سکا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بلند مقامات سے نوازے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر حضرت شاہ صاحب کی ازالۃ الخفاء، اور حضرت مجدد الف ثانی کے بعض مکتوبات کی روشنی میں ایک تحریر لکھنی شروع کی ہے، اللہ تعالیٰ اسے پورا فرما دے۔"

چند ماہ میں "خلافتِ راشدہ" کے نام سے ایک تحریر مرتب کی، جو الحمدللہ اسی وقت طبع طبع ہو گئی، ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں!

علمائے دین نے خلفائے راشدین کے فضائل و مناقب میں بے شمار کتابیں لکھیں منجملہ ان کے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی ازالۃ الخفاء ہے، جو اپنے موضوع پر لاثانی ہے۔ خلافتِ راشدہ کی حقیقت اور افضلیت شیخین کا اثبات جس طرح عقلی و نقلی دلائل سے کیا ہے وہ محیر العقل ہے۔ جب قلم درایت پر چلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلم جنید و بایزید کا ہے، اور جب یہی قلم روایت پر چلتا ہے تو روایات کا بحرِ بے کراں نظر آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ قلم عسقلانی، اور قسطلانی کا ہے۔

اس ناچیز نے اس کتاب کا غور سے مطالعہ کیا ہے اور یہ ارادہ کیا کہ اس کتاب کے مقاصدِ کلیہ اور مہمات کا خلاصہ کر دیا جائے تاکہ اہلِ فہم پر اصل مسئلہ واضح ہو جائے اور خلافتِ راشدہ کی حقیقت اور مرتبے سے آگاہ ہو جائیں۔

علاوہ ازیں متعدد مباحث میں دیگر اکابر امت کے کلامِ معرفت التیام کا اضافہ کیا تاکہ بحث مکمل ہو جائے۔ مکتوباتِ امام ربانی، تحفہ اثنا عشریہ مؤلفہ شاہ عبدالعزیز دہلوی، اور منہاج السنۃ لابن تیمیہ سے مختلف مقامات پر لطیف

اضافے کئے۔"

کتاب اگرچہ زیادہ طویل نہیں ہے، مگر انتہائی ٹھوس اور بنیادی مضامین پر مشتمل ہے۔ کتاب کی بنیادی بحثیں ہیں:

- ــــــ معنیٰ خلافت۔
- ــــــ خلافتِ عامہ اور خلافتِ خاصہ۔
- ــــــ خلافتِ راشدہ کی شرائط و لوازم۔
- ــــــ خواصِ نبوّت۔
- ــــــ خلفائے راشدین کے اقوال و افعال حجّت شرعیہ ہیں۔
- ــــــ اثباتِ خلافت خلفائے راشدین۔
- ــــــ افضلیت ابوبکر صدیق رضؓ

کتاب کا سب سے اہم حصّہ اور بحث وہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے۔ اس عنوان ہے "حضرت ذی النورین پر معترضین کے اعتراضات اور ان کے جوابات"! اس موضوع کے تحت ان اعتراضات کو جو حضرت عثمان پر کئے گئے ہیں، سات بنیادی اعتراضوں میں جمع کیا ہے، اور پھر ان سب کے جوابات دیئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں "مشاجراتِ صحابہ" یعنی صحابہ کرام کے باہمی اختلافات ایک مستقل عنوان رکھا، اور خلاصہ بحث کے طور پر لکھا:

"صحابہ کرام، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی صحبت کی برکت سے اس درجہ مزکّٰی اور مجلّٰی ہو چکے تھے کہ ہزاروں ہزار جنید و شبلی ایک ادنیٰ صحابی کے نقشِ پا کو نہیں پہنچ سکے، بڑے سے بڑے ولی کے متعلق حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بارگاہِ خداوندی میں اس کا کیا مقام ہے۔ مگر صحابہ کرام کے متعلق بے شمار آیات قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ انھیں دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضا اور خوشنودی کا پروانہ مل چکا ہے اور دنیا ہی میں ان کو جنّت کی بشارت

سنادی گئی اور اعلان عام کر دیا کہ "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" اللہ ان سے راضی ہو گیا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

معاذ اللہ اگر بفرضِ محال صحابہ کرام برے بھی تھے تو بھی اچھے تھے، اس لئے کہ خداوند علام الغیوب نے اس علم کے باوجود کہ صحابہ سے کیا کیا ظہور میں آئے گا۔ یہ اعلان کیا، اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا و یحبہم و یحبونہٗ اللہ ان کو محبوب رکھتا ہے۔ اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد، ہنر است

سارا قرآن صحابہ کی مدح سے بھرا پڑا ہے، جو شخص صحابہ میں کوئی قدح نکالتا ہے تو اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ حق تعالیٰ کی مدح و توصیف میں جرح و قدح کرتا ہے۔" (۱)

بہرکیف اپنی مختلف تصانیف میں اہل سنت والجماعت کے عقائد کو پورے طور پر بیان اور واضح کر دیا ہے اور اہل سنت کے جو ائمہ مختلف ادوار میں گزرے ہیں ان کے علوم و معارف کو موجودہ حالات اور تقاضوں کے مطابق پیش کر دیا ہے۔ میں نے صرف چند اقتباسات پر اکتفا کیا ہے۔

آپ نے حکیم انیس احمد صدیقی سے فرمایا تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اگر کسی کتاب میں کچھ اور اعتراضات نظر سے گزریں تو مجھے لکھ کر دینا میں ان کا جواب باصواب طبع ثانی میں اضافہ کر دوں گا لیکن افسوس کہ آپ نظر ثانی سے قبل وفات فرما گئے۔

---

(۱) ۔ خلافتِ راشدہ ۔ ص ۱۷۹ ، ۱۸۰ ۔

مختصر فہرست مصنّفات و مؤلّفات

والد صاحب نے اپنی مصنّفات و مؤلّفات کی ایک مختصر فہرست خود مرتب کی اس میں ساٹھ کتب کا ذکر کیا ہے۔ عنوان کے طور پر لکھا ہے:

الفہرس المختصر لاسماء تالیفات ہٰذا العبد المحتقر

تفسیر:

الفتح السماوی بتوضیح تفسیر البیضاوی	عربی میں ہے۔ ۲۲ جلدوں میں ہے۔ مسودہ ہے۔
معارف القرآن	اُردو ۲۳ پاروں کی تفسیر مکمّل ہے۔ باقی سات پاروں کے مشکل مباحث کا حل موجود ہے۔ صرف مضامین کو مربوط کرنا باقی ہے۔

مقدمۃ التفسیر:

	عربی	
دلائل الفرقان علیٰ مذہب النعمان	عربی	مطبوعہ
شرائطِ مفسر و مترجم	اُردو	مطبوعہ
اعجاز القرآن	اُردو	"

حدیث:

التعلیق الصبیح شرح مشکاۃ المصابیح	۸ جلدوں میں ہے مطبوعہ۔ عربی میں ہے

مقدمۃ الحدیث	عربی	مخطوط
منحۃ الحدیث فی شرح الفیۃ الحدیث	"	"
کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ	اُردو	مطبوعہ
القول المحکم	"	"
لطائف الحکم فی اسرار نزول عیسیٰ بن مریم	"	"
الدین القیم	"	"
احسن البیان فی مسئلہ الکفر والایمان	"	"
نہایۃ الادراک فی حقیقۃ التوحید والاشراک		
فتح الغفور شرح منظومۃ القبور	"	"
اسلام اور مرزائیت کا اصولی اختلاف	"	"

سیرت وسوانح :

سیرت المصطفیٰ ؐ	چار جلدوں میں ہے۔ اُردو۔ مطبوعہ
خلافت راشدہ	" "

قصائد :

تائیۃ القضاء والقدر	عربی میں ہے	مطبوعہ
لامیۃ المعراج	"	"
رائیۃ الحمد والثناء والمناجاۃ	"	"
تشطیر لامیۃ امرأ القیس	"	"
تحفۃ القاری فی حل مشکلات البخاری	عربی میں ہے۔ غیر مطبوعہ	
مقدمۃ البخاری		

الکلام الموثوق فی تحقیق ان کلام اللہ غیر مخلوق۔	عربی میں ہے۔	مطبوعہ
الباقیات الصالحات فی شرح حدیث انما الاعمال بالنیات۔	عربی۔	//
تحفۃ الاخوان بشرح حدیث الایمان۔		
الجمال للرجال۔		
احسن الکلام فیما یتعلق بالقراءۃ خلف الامام جلاء العینین فی تحقیق رفع الیدین		
حجیت حدیث۔	اُردو میں ہے۔	مطبوعہ

عقائد وعلوم کلام:

عقائد اسلام	اُردو	مطبوعہ
اصولِ اسلام	//	//
علم الکلام	//	//
عورتِ اسلام	//	//
اثباتِ صانعِ عالم	//	//
تائیۃ القضاء والقدر	عربی	//
حدوثِ مادہ وروح	اُردو	//
بشائر النبیین	//	//
احسن الحدیث	//	//
مسک الختام	//	//
اسلام اور نصرانیت	//	//

متفرق رسائل وکتب:

دستور اسلام۔	اُردو	مطبوعہ
نظامِ اسلام	〃	〃
اسلام اور اشتراکیت	〃	〃
عقل، اس کی فضیلت	〃	〃
نبوّت کبریٰ	〃	〃
مقاصد بعثت	〃	〃
شرح حدیث افتراق امّت	〃	〃
محاسن اسلام	〃	〃
عقل اور اسلام	〃	〃
شرائط نبوّت	〃	〃
دعاویِ مرزا	〃	〃
ادرادِ مبارکہ	〃	〃
پیامِ اسلام	〃	〃

یہ فہرست وفات سے کافی عرصے قبل مرتّب کی تھی، اس کے بعد بھی متعدد کتب ورسائل تالیف کیے۔

رُوحانی مشرب یا طریقت

حضرت والد ماجد کے ممتاز شاگرد مولینا حکیم انیس احمد صدّیقی مجدّدی کا یہ تحقیقی مضمون پیش کیا جاتا ہے جو اس سلسلہ میں علماء اور عوام کے لئے تصوّف اور سلوک کے مسائل حل کرنے کیلئے کار آمد اور مفید ہے۔ (محمد میاں صدیقی)

حضرت استاذی مولینا محمد ادریس کاندھلوی قدس اللہ سرہٗ اہل السنّت والجماعت کے مسلک حقّہ کے مطابق ائمہ اربعہ کو اہلِ حق مقتدر بزرگ سمجھتے تھے لیکن مسلک احناف سے خاص محبت اور تعلّق رکھتے تھے، اس سلسلہ میں آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے بجائے شاہ عبدالعزیز کا مزاج رکھتے تھے۔ لیکن طریقت میں آپ کا مسلک شاہ ولی اللہ سے زیادہ قریب تھا۔

حضرتؒ معارف القرآن کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

بندہ ناچیز حافظ محمد ادریس بن مولینا حافظ محمد اسماعیل کاندھلوی جو نسباً صدّیقی مذہباً حنفی اور مشرباً چشتی ہے۔ (دیباچہ معارف القرآن حصہ اوّل)

دوسری جگہ حضرت تحریر فرماتے ہیں۔

مولینا ادریس .... الصدیقي الفاروقي نسبًا والبوفالي مولدا ومنشاء والكاندهلوي موطنا والحنفي مذهبا والنقشبندي والمجددي۔

موقعۃ التفسیر فصل ثالث عنوان ترجمۃ عبد الضعیف صاحب ہذا التالیف

بظاہر ان دونوں عبارتوں میں تعارض محسوس ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں ہے، نسب میں آپ صدیقی ہیں لیکن ماں کی طرف سے فاروقی خون بھی شامل ہو گیا ہے۔ ایک جگہ آپ نے طریقت میں اپنا مشرب و مسلک چشتی بیان فرمایا ہے اور دوسری جگہ نقشبندی مجدّدی اس میں بھی کوئی تعارض نہیں ہے۔

حضرت استاذی مولینا کاندھلویؒ نے اگرچہ حضرت مولینا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی سے

بیعت کی تھی۔ لیکن فیوض و برکات حضرت حکیم الامت مولٰنا اشرف علیؒ تھانوی سے بھی حاصل کئے ہیں اور یہ اکابر چاروں سلسلہ میں مجاز طریقت تھے۔ سلسلہ عالیہ، صابریہ چشتیہ۔ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ۔ سلسلہ عالیہ قادریہ اور سلسلہ عالیہ سہروردیہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے اور جس شخص میں جو استعداد اور صلاحیت ہوتی تھی اس کو اسی سلسلہ کی تعلیم فرماتے تھے۔ حضرت مولٰنا خلیل احمد مہاجر مدنی، حضرت مولٰنا محمد مظہر نانوتویؒ اور شاہ عبد الغنی مجددیؒ سے سند روایت و اجازت حاصل کی تھی۔

حضرت استاذیؒ نے خود بیان فرمایا کہ ایک دیہاتی ہمارے ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بیعت کی درخواست کی۔ شیخ نے فرمایا اگر کوئی زمین بنجر پڑی ہو اور اس کو کار آمد کرنے کا خیال ہو تو کیا صورت کی جائے، ایک صورت یہ ہے کہ جھاڑ جھنکاڑ میں آگ لگا دی جائے پھر اس میں ہل چلا کر کاشت کے قابل بنایا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ جھاڑیوں کو تھوڑا تھوڑا کاٹ کر صاف کیا جائے اور زمین کو ہموار کر کے ہل چلایا جائے اور تدریجی طور پر تمام زمین کو قابلِ کاشت بنا لیا جائے۔

دیہاتی نے آگ لگا کر جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کرنے کی تجویز کو پسند کیا۔ شیخ نے اس کو اس کے مزاج کے مطابق سلسلہ عالیہ چشتیہ میں بیعت کر لیا۔ اور دل میں عشق الٰہی کی آگ لگا دی تاکہ ماسوی اللہ کو جلا کر خاکستر کر دے، مقصد کے اعتبار سے یہ چاروں سلسلے ایک ہیں۔ حضرت عارف رومی فرماتے ہیں۔ ع

آب از جوئے بجوئے می رود

باز یک سو گشتہ در دریا رود

دیگر

انبیاء و اولیاء را مسلکے است

لیک تا حق می برد جملہ یکے است

بات یہ ہے کہ حضرت کاندھلوی نے جب ابتداءً میں بیعت کی تو سلسلہ عالیہ صابریہ چشتیہ میں کی اور جب شیخ نے تھوڑی سی توجہ فرما کر دل میں عشقِ الٰہی کی آگ روشن کر دی، اس کے بعد آپ کے علوم و اسباق اور درس و تدریس کی مناسبت کے باعث آپ کی تربیت بسلسلہ نقشبندی مجددی فرمائی گئی۔

خود حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں۔

شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم۔ عمل۔ اخلاص جب تک یہ تینوں جزو متحقق نہ ہوں شریعت متحقق نہیں ہوتی، احوال و مواجید اور علوم و معارف جو صوفیوں کو اثناءِ راہ میں حاصل ہوتے ہیں اصلی مقصود نہیں ہیں۔ بلکہ وہم و خیالات ہیں جن سے اطفال طریقت کی تربیت کی جاتی ہے۔

طریقت اور حقیقت کی منزلیں طے کرنے سے یہ مقصود ہے کہ اخلاص حاصل ہو جائے جو مقام رضا کے لئے لازم ہے، تجلیوں اور عارفانہ مشاہدوں سے گزار کر ہزاروں میں سے کسی ایک کو اخلاص اور مقام رضا کی دولت تک پہنچاتے ہیں۔ بے سمجھ لوگ، احوال و مواجید اصل مقصود جانتے ہیں اور مشاہدات و تجلیات کو اصل مطلب خیال کرتے ہیں۔ اس ہی وہم و خیال کی قید میں گرفتار رہتے ہیں اور شریعت کے کمال سے محروم رہتے ہیں۔ اس مطلب کی حقیقت حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور پیروی کے طفیل اس فقیر دس سال بعد ظاہر ہوئی ہے۔ (ملخصاً)

مکتوب $\frac{۳۶}{ج ۱}$ بنام ملا حاجی محمد لاہور

حضرت عارف ربانی مجدد الف ثانی ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں۔

شریعت کو اپنی جگہ قائم رکھ کر حقیقت کو طلب کرنا بہادروں کا کام ہے۔ میرے حضرت خواجہ باقی باللہ رحؒ بھی اوّل توحید وجودی کا مشرب رکھتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کوچہ تنگ سے خلاصی عطا فرما کر ترقی غایت فرمائی، آخر وقت میں آپ نے فرمایا:

توحید کوچہ تنگ است شاہ راہ دیگر است

(مکتوب نمبر ۴۳ ج ۱۔ بنام شیخ فرید)

حضرت شیخ التفسیر اور شیخ الحدیث تھے علم کلام، فقہ، اور دوسرے علوم پر وسیع نظر رکھتے تھے۔ اس لئے طریقت میں آپ کا مسلک وہی ہو سکتا ہے جس میں کتاب اور سنّت کی پیروی کو تمام چیزوں پر فضیلت اور اہمیت موجود ہو۔

نیز آپ نسبی طور پر صدیقی تھے اور اساتذہ میں سلسلۃ الذہب حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ سے تعلق کی بنا پر بھی ضروری تھا کہ آپ کی تربیت سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے مطابق ہو۔

حضرت استاذی مولینا کاندھلوی کے والد ماجد حضرت مولینا حافظ محمد اسماعیل صاحب کاندھلوی جو حضرت تھانوی کے معاصر، پیر بھائی اور دوست بھی تھے، آپ کو بچپن میں حضرت تھانوی کی تربیت میں پیش کرنے کے لئے لائے تو والد ماجدؒ نے فرمایا کہ یہ آپ کی خانقاہ کے لیئے ہے۔ حضرت تھانوی نے ارشاد فرمایا یہ ہمارے مدرسہ کے لئے ہے۔

حضرت تھانوی کے مدارس سے ایسا تعلق قائم ہوا کہ مہد سے لے کر لحد تک یہ تعلق قائم رہا اور وفات کے وقت تک جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث رہے اور جامعہ اشرفیہ سے آپ کا جنازہ اٹھایا گیا۔ سلوک اور طریقت میں ترقی کے دو بڑے راستے ہیں، ایک راستہ سلوک ولایت ہے۔ دوسرا طریقہ آثار سلوک نبوت ہے۔ ان دونوں سلسلوں میں مختصر طور پر یہ فرق ہے۔

آثار سلوک نبوت	آثار سلوک ولایت
امت میں اس کے سربراہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔	امت میں اس کے سربراہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ ہیں۔

حضرت مولینا کاندھلوی فرماتے ہیں۔

صدیق اکبر کو روح نبوی کے ساتھ قوت عاقلہ میں زیادہ تشبہ حاصل تھا صدیق اکبر کو فنا فی الرسول کا اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے اسی وجہ سے اکبر کا سینہ شفا عہدئے نبوت کا مخزن اور مظہر اتم بنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لو کنت متخذا خلیلا لاتخذت ابا بکر خلیلا اس مقام فنا کی طرف اشارہ ہے، ارواح شیخین ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ نسبت حاصل تھی جو ایک صاف و شفاف آئینہ کو آفتاب سے ہوتی ہے آئینہ آفتاب کے ہم رنگ ہو جاتا ہے کہ ظاہر نظر میں شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔

اور روح مرتضوی کو روح نبوی کے ساتھ وہ نسبت ہے کہ جو قمر کو آفتاب سے ہے، نور قمر اگرچہ آفتاب ہی سے مستفاد ہے مگر اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے۔ اس لئے چاند اور سُورج کے احکام مختلف ہیں۔ شیخین کے زمانۂ خلافت میں شان نبوّت کی غالب رہی اور حضرت علی کے زمانۂ خلافت میں شانِ ولایت کا ظہور رہا۔ خلافتِ راشدہ ص ۱۵۶ تا ۱۵۷، تلخیص قرۃ العینین از حضرت شاہ ولی اللہؒ ص ۲۹۹ و تفہیمات الٰہیہ ص ۲۴۴ تا ۲۴۶ ج ۱

خلقِ خدا کی طرف اضافہ کے لئے رغبت کرتے ہیں لیکن مخلوق سے جی نہیں لگاتے۔	خلق سے نفرت کرتے ہیں۔
۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور یہ ان کا مزاج بن جاتا ہے۔	۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ واجب نہ ہو۔
۴۔ جیسا کہ صاحب شرع سے ثابت ہو اس کا ادب غالب ہوتا ہے، اپنی طرف سے بذریعہ کشف وغیرہ اضافہ نہیں کرتے اگرچہ وہ زیادت خلاف شرع نہ ہو۔	۴۔ اپنے مکاشفات و تحقیقات پر اطمینان ہوتا ہے اور اس پر عمل کرتے ہیں اگر خلاف شرع نہ ہو۔
۵۔ ان پہ ذوق و شوق غالب نہیں ہوتا وہ خود ان پر غالب ہوتے ہیں اور وہ عبادت کو حکم ایزدی سمجھ کر عمل کرتے ہیں۔	۵۔ ان پر شوق و ذوق غالب ہوتا ہے عبادت میں لذت طبعی پیدا ہو جاتی ہے۔
۶۔ شریعت پر نہایت پختگی سے کرتے ہیں	۶۔ شریعت پر عمل میں تسامح بھی ہو جاتا ہے اور وہ معذور ہوتے ہیں۔
۷۔ ان پر صحو یعنی ہوشیاری غالب ہوتی ہے	۷۔ ان پر سکر (یعنی عالم بے خودی) غالب رہتا ہے۔

۸ حب ایمانی کا غلبہ ہوتا ہے۔	۸ حب عشق غالب ہوتی ہے۔
۹ اسباب ظاہری کے انتظام بغیر انہماک بمقتضاء سنّت رسول اللہ صلی علیہ وسلم کرتے ہیں۔	۹ اسباب ظاہری ترک کر دیتے ہیں۔
۱۰ سلوک ولایت کی انتہائی مقام عبودیت ہے جو تمام مقامات میں اعلیٰ وارفع ہے۔	۱۰ سلوک ولایت کی انتہا مقام رضا ریا فنار الفناء ہے۔
کمال قال سبحان الّذی اسری لعبدہٖ	(ماخوذ از طریقت و شریعت ص ۲۰)

کتب سلوک و تصوف میں اس موضوع پر طویل مباحث ہیں یہاں پر اختصار سے عرض کرنا کافی ہے، حضرت چونکہ شیخ المفسرین والمحدثین اور عمدۃ المفسرین والمحدثین اور عمدۃ المتکلفین تھے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ حضرت مولٰنا محمد قاسم نانوتوی، علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت تھانوی کے علوم و معارف کے وارث اور حامل تھے اور آپ کی رگوں میں صدیقی خون تھا اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی تربیت اور عروج و ترقی آثار سلوک نبوت کے ذریعہ ہو۔

حضرت کی خدمت میں خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ کے سجادہ نشین حضرت مولٰنا عبداللہ صاحب مرحوم تشریف لائے اور حضرت کے پیر دبانے لگے جس طرح ایک خادم یا مرید اپنے مخدوم اور شیخ کی خدمت کرتا ہے، حضرت نے منع کیا۔ اور فرمایا آپ تو خود مخدوم اور شیخ طریقت ہیں۔ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ حضرت مولٰنا عبداللہ مرحوم نے عرض کیا کہ حضرت میں آپ کا خادم اور شاگرد ہوں، میں نے آپ سے قرآنِ کریم کی تفسیر پڑھی ہے اور مجھے اس سعادت سے محروم نہ فرمائیں۔

قرآن و حدیث کے تمام مسائل میں جو رموز و نکات اور اسرار و معارف حضرت عارف ربانی مجدّد الف ثانی نے ارشاد فرمائے ہیں وہ مولٰنا کاندھلوی کو محفوظ و مستحضر تھے اور آپ کا کوئی خاص درس یا وعظ ایسا نہیں ہے جس میں حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات شریف کے حوالہ سے یا بغیر حوالہ آپ کے فرمودات وارشادات بیان نہ کئے ہوں۔ اس سلسلہ میں آپ سب سے زیادہ مجدّدی اور نقشبندی تھے۔

آپ حضرت مجور صاحب کی تعلیمات کے عالم بھی تھے اور عامل بھی، مؤلف بھی اور مبلغ بھی۔

حضرت استاذی نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی قدس اللہ سرہٗ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اعلیٰ مقام اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی ارواح پاک براہِ راست استفادہ و استفاضہ فرمایا ہے، جس کے بعض قرائن اور شواہد ہمارے پاس موجود ہیں۔

وصال سے چند ساعت قبل آپ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دیگر اکابر کو دیکھا کہ یہ حضرات تشریف لائے ہیں۔ یہ اکابر حقیقت میں حضرت کاندھلوی اس دنیا سے لینے کے لئے تشریف لائے تھے اور یقیناً ان حضرات نے اور فرشتوں نے آپ کو حق تعالیٰ کی طرف سے سنایا ہوگا۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ اس آیت میں عباد کا لفظ ہے، عباد عبد کی جمع ہے اور سارا سلوک نبوت کا آخری مقام عبدیت ہی ہے۔

حضرت خود بیعت نہیں فرماتے تھے، اس لئے کہ آجکل لوگ بیعت کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم کامل ہو گئے ہیں حالانکہ ابھی طالب بنے ہیں، اس لئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ ضرورت کے مطابق دین سیکھے، عالم بننا ضروری نہیں ہے لیکن ضرورت کے مطابق دین سیکھنا فرض ہے اور آدمی کو چاہیئے کہ جس قدر سیکھے اس پر عمل کرے، اعمال میں اخلاص پیدا کرے، دل میں اللہ تعالیٰ سے خشیت اور تقویٰ پیدا کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور کامل اتباع یعنی پیروی کرے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھے اور ان سے اپنا حال بیان کر کے جو بات سمجھ میں نہ آئے دریافت کرتا ہے۔

حضرت کے شیخ مولانا خلیل احمد قدس اللہ سرہٗ نے آپ کے علمی مشاغل کو دیکھتے ہوئے آپ کو صوفیانہ اوراد و وظائف، چلہ کشی اور محنتِ شاقہ کے اعمال میں پڑنے کا حکم نہیں دیا۔ صرف اوراد ماثورہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ تسبیح، تہلیل، تحمید، درود شریف، استغفار وغیرہ پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ حزب الاعظم اور حزب البحر، مناجات مقبول بھی آپ کے معمولات میں شامل تھی۔ آپ نے اورادِ ماثورہ کے سلسلہ میں ایک رسالہ بھی تالیف فرمایا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور دیگر وظائف اور اوراد بھی شامل ہیں۔

حضرت فرماتے تھے کہ نفس کی اصلاح اور اس کا تزکیہ ہر شخص پر واجب اور ضروری ہے لیکن اس کے طریقے مختلف ہیں۔ حضرت سے متعلقین حضرات اور متقدین نہایت درجہ عقیدت اور محبت رکھتے تھے، کئی بڑے عہدوں پر فائز حضرات انتہائی عقیدت کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن آپ ان کے ساتھ انتہائی خلوص، محبت، تعلق اور اخوت کا اظہار فرماتے اور خود ان کے پاس تشریف نہ لے جاتے، مثلاً گورنر مشرقی پاکستان اور صدر ایوب سے ملاقات کرنے سے معذرت فرمادی۔ اگر کوئی شخص بیعت کا اصرار کرتا تو اس کو حضرت مفتی محمد حسنؒ بانی جامعہ اشرفیہ یا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ بانی دارالعلوم کراچی کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ عطا فرماتے۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ روحانی ترقی کے لیے (۱) اکلِ حلال حلال روزی (۲) صدقِ مقال بات اور وعدہ کا سچا ہونا (۳) فرائض کا بروقت ادا کرنا (۴) بندوں کے حقوق ادا کرنا (۵) ضرورت کے مطابق علم دین حاصل کرنا، جو شخص ان امور کا پابند ہے وہ صحیح معنیٰ میں مسلمان اور مومن ہے۔ اور ہر مومن بنص قرآنی اللہ ولی الذین امنوا ولی اللہ ہے، اگرچہ ولایت کے درجے متفاوت ہیں۔ احکام شریعت کے عمل یا اعتقاد رکھنے والا متقی یا خدا کا ولی نہیں ہو سکتا، اگر ایسے شخص سے کوئی خرق عادت بات ظاہر ہو تو کرامت نہیں استدراج ہے

فرمایا تم چاہتے ہو کہ نمازیں پڑھنے روزے رکھنے اور عبادت کرنے سے، باطنی اسرار اور کشف وکرامات کا اظہار ہو اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دین پر استقامت حاصل کرو۔ اگر تم کو دین استقامت حاصل ہو جائے تو یہ مطلوب حق تعالیٰ ہے اور کشف وکرامت ترا مطلوب ہے، ترے مقصود سے حق تعالیٰ کا مطلوب افضل ہے اور مقصود اصلی بنانے کے لائق ہے۔

ما برائے استقامت آمدیم
نے پئے کشف و کرامت آمدیم

اتباع سنت کا راستہ تمام راستوں سے قریب اور آسان ہے، صبح کی نماز باجماعت ادا کرنے سے ایک رات کی عبادت کا ثواب ملتا ہے، عشاء کی نماز باجماعت ادا کرنے سے نصف شب

کی عبادت کا ثواب ملتا ہے اور جو تہجد بھی ادا کرے وہ نہایت خوش قسمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص مناجات کا موقع عطا فرمایا۔ ایک رات گزرنے پر ڈیڑھ رات سے زیادہ عبادت کا ثواب اور اس پر مزید انعام واکرام اتباع سنّت کی بدولت ہے۔ حضرت فرماتے تھے کہ کتاب وسنّت میں احسان کا ذکر موجود ہے یہی اصلی تصوف اور طریقت ہے۔ آپ نے فرمایا وطریقیت جس کا ثبوت کتاب اور سنّت سے نہ ہو۔ حضرت فرماتے تھے کہ مجدد صاحب الف ثانی کا تصوّف تمام دنیائے اسلام کے لئے قابلِ قبول ہے۔ صوفیوں کے مشہور مسئلہ وحدت الوجود میں حضرت کاندھلوی اپنے درس میں حضرت مجدد الف ثانی کی تفہیم اور تحقیق وحدت الشہود بیان فرماتے تھے۔

حضرت عارف ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں

ایک فرض ادا کرنا ہزار سالہ نفلوں کے ادا کرنے سے بہتر ہے اگرچہ وہ نفل خاص نیت سے ادا کئے جائیں اور خواہ نفل از قسم نماز، روزہ وذکر وفکر وغیرہ ہوں۔ حضرت عمر بن فاروق رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمام شب کے جاگنے سے بہتر ہے کہ تمام رات سوئے اور صبح کی نماز باجماعت ادا کرے اور زکوٰۃ کی نیت سے ایک دانگ (۲ رتی) کا دینا سونے کے پہاڑ سے جو صدقہ یا نفل کے طور پر صرف کیا جائے بہتر ہے۔ (مکتوب ۲۹ ج ۲ بنام شیخ نظام الدین تھانیسری)

حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں۔ اب سوائے اتباع سنّت کے کوئی آرزو باقی نہیں ہے۔

(مکتوب ۳۷)

حضرت فرماتے تھے کہ دل آئینہ کی طرح ہے اس کو پانی سے صاف کر لو یا پیشاب سے صاف کر لو، روحانی اعمال کے علاوہ سفلی یعنی ناپاک اور گندے اعمال سے انسان قوت استدراج یا خرق عادت حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن یہ مردود ہے۔

حضرت کاندھلوی نے فرمایا کہ بیعت مسنون اور مندوب ہے، واجب نہیں ہے بلکہ مسنون اور مندوب کو واجب سمجھنا غلط ہے۔ البتہ بیعت کا مقصد اصلاح وتزکیہ نفس واجب اور فرض ہے۔ اور نفس کا تزکیہ اور اصلاح بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔ سلف صالحین، انصار

و مہاجرین اور تابعین میں اصل چیز صحبت تھی۔ صحابی کی فضیلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی بنا پر ہے۔ خیر القرون اور اس کے بعد بیعت اور خرقہ کا اہتمام نہ تھا بلکہ صحبت کا التزام اور اہتمام تھا۔

مولانا کاندھلوی نے فرمایا حضرت مولینا نانوتوی کے ایک مرید امیر احمد خان مرحوم تھے، درس نظامی اور کتابی علم سے نابلد تھے، لیکن جب دار العلوم دیوبند تشریف لاتے تھے تو اُن کے پاس بڑے بڑے اساتذہ علماء اور فضلاء دوزانوں ہو کر استفادہ کے لئے بیٹھتے تھے۔ وہ مولینا محمد قاسم نانوتوی کے تربیت یافتہ تھے۔

ایک صاحب نے واقعہ بیان کیا کہ میں نے ایک روز مرغ کا سالن پکایا۔ اتّفاقاً حضرت تشریف لے آئے، میں نے کہا حضرت کھانا حاضر ہے، آپ نے میری خاطر ایک یا دو لقمے تناول فرمائے لیکن اس کے فوراً بعد آپ کو قے ہو گئی۔ صاحب واقعہ نے بیان کیا کہ یہ مرغ ہم نے ناجائز ذرائع سے حاصل کیا تھا۔ حضرت اس مال مغصوب کو ہضم نہ کر سکے۔ ہم اس واقعہ سے بہت شرمندہ ہوئے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جس طرح تندرست آدمی مکھی ہضم نہیں کر سکتا اسی طرح صاحب باطن اور اللہ تعالیٰ سے تعلّق اور نسبت رکھنے والا مال حرام کو برداشت نہیں کر سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک واقعہ اس قسم کا ملتا ہے اور حضرت کاندھلوی کا واقعہ اسی نسبت صدیقی کا مظہر ہے۔

حضرت نے تقرب الی اللہ کے لئے جو مجاہدات کئے وہ عام لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہیں۔ آپ کو کھانے پینے پہننے کسی چیز کی خاص پروا نہ تھی۔ کتابوں کے مطالعے اور تالیف و تصنیف میں یا درس و تدریس میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے، یہاں تک کہ اخبار پڑھنے میں وقت ضائع نہ فرماتے تھے، آپ نے حیدرآباد سے ۲۵۰ کی تنخواہ چھوڑ کر دیوبند میں ۲۰ تنخواہ پر پڑھانا قبول کیا۔ پھر جامعہ اشرفیہ میں مہتمم صاحب کے بار بار اصرار پہ تنخواہ میں اضافہ قبول نہیں کیا۔ یعنی طور پر یہ ایک سخت مجاہدہ ہے جو حضرت جیسے اصحاب ہی کر سکتے ہیں۔ اور اس کردار میں حضرت

ابوبکر صدیق کی نسبت اور سیرت کا جمال نظر آرہا ہے۔ حضرت کے وصال کے بعد آپ کا ترکہ وراثت ایک علمی اور نادرِ روزگار کتب خانہ کے علاوہ کچھ مطبوعہ کتابیں اور قلمی مسودات کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں یعنی کوئی بنک بیلنس کوئی زرِ نقد کوئی جاگیر جائیداد وغیرہ موجود نہیں ہے، اس میں بھی جمال صدیقی کا عکس نظر آرہا ہے۔ مجھ جیسا ہیچمدان حضرات کے روحانی مشرب یا طریقت کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے پوری طرح ترجمانی کر دی ہے یا اس کو مکمل طور پر بیان کر دیا ہے، اوّل تو میرا علم خود بہت تھوڑا ہے اور پھر اس میں سے بھی نہایت اختصار کے ساتھ کچھ عرض کر دیا ہے۔

یہ ذرّہ ناحقیقت ہے ترے رُتبے کو کیا جانے
جو ہم رتبہ ہو ترا وہ ترے اوصاف پہچانے

اہلِ باطل کے خلاف جہاد

"رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن"

آپ کی تصنیفی و تالیفی زندگی کا عرصہ نصف صدی سے بھی کچھ زائد پر پھیلا ہوا ہے، اس پورے عرصہ میں دو قسم کی کتابیں، اور رسائل تصنیف و تالیف کئے، ایک وہ جو مثبت انداز میں تھے اور دوسرے وہ جن سے براہِ راست کسی نظریے کا رد کرنا مقصود تھا۔

جن غلط اور باطل نظریات کے رد میں سب سے زیادہ کتابیں، رسائل اور مضامین لکھے وہ قادیانیت، عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث، اور انکار حدیث ہیں۔

کسی فرد، طبقے، یا نظریے کے رد میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، عام طور پر ان کا انداز مناظرانہ ہوتا ہے، الفاظ کی تلخی اور فقروں کی تندی سے دلائل کا اضمحلال کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک عام قاری کے لئے تو یہ انداز خاصا مؤثر، اور کامیاب ہے، لیکن اُن اہلِ علم کے نزدیک جو ہر جملہ کی تہ میں دلائل کے متلاشی رہتے ہیں، ایسے انداز، اور ایسی عبارتوں کی حیثیت ایک خول اور بے مغز چھلکے سے زیادہ نہیں ہوتی۔

والد صاحب قبلہ کی جتنی تحریریں، غلط نظریات کے رد میں ہیں، ان میں بھی تحقیقی رنگ ہے، کوئی بات بغیر دلیل بیان نہیں کی، اور دلائل میں عقلی اور نقلی کی تقسیم ہے، اور ایک یا دو دلیلوں پر اکتفا نہیں کیا، اکثر جگہ دس دلیلیں ذکر کی ہیں، اور قرآنی ارشاد "تلك عشرة كاملة"

کی پیروی کی ہے، اور بعض مقامات پر اس سے بھی تجاوز کیا ہے، مسلک حق کے اثبات اور نظریۂ باطل کے رد میں بیس بیس دلیلیں بیان کی ہیں۔

قادیانیوں کے خلاف تحریری جہاد

عیسائی، اور قادیانی مذہب کے رد کی سعادت آپ کو نوجوانی ہی سے ملی ۱۹۲۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے، قادیانی فتنہ اس وقت اپنی زندگی کے ابتدائی مگر انتہائی خطرناک مراحل میں داخل ہو چکا تھا، برصغیر کے سبھی علمار اس فتنۂ ارتداد کے مقابلے اور سدِ باب کے لئے سینہ سپر تھے، ہر طرف تحریر، تقریر، اور مناظروں کا ہنگامہ بپا تھا۔۔ عیسائی حکومت برسرِ اقتدار تھی، اور وہ بھی ایسی حکومت جس کی قادیانیوں کو مکمل حمایت، اور سرپرستی حاصل تھی۔ علمارِ حق قادیانیوں سے مناظرے ہی کر سکتے تھے، ان کے کفریہ عقائد اور دعاوی کا تحریری اور تقریری طور پر دلائل و براہین سے رد ہی ممکن تھا چنانچہ علمار نے اس ضمن میں اپنا فرض بخوبی ادا کیا۔ اور خاص طور پر دہلی، یو۔ پی اور پنجاب کے علمار نے امتِ مسلمہ کو عہدِ حاضر کے اس فتنۂ کبریٰ سے بچانے کے لئے اپنی تمام تر علمی، فکری اور عملی صلاحیتوں سے کام لیا۔

اپنے قابلِ فخر اساتذہ، علامہ انور شاہ کاشمیری[۵۱]، علامہ شبیر احمد عثمانی[۵۲]، اور مولانا مرتضیٰ حسن خاں کے ہمراہ کئی بار قادیان، فیروز پور، گورداسپور، اور لاہور آنا ہوا، اور ایسی ایمان افروز تقریریں کیں کہ استادوں کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ والد صاحب نے خود ایک جلسہ کی کیفیت یوں بیان کی:

"قادیانیوں کے خلاف مسلمانانِ پنجاب نے ایک عظیم الشان جلسہ کیا، علامہ انور شاہ اور علامہ عثمانی کو بلایا، میں بھی اپنے گرامی قدر اساتذہ کے

---

۵۱ ۔ علامہ محمد انور شاہ کاشمیری : ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء ــــ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء

۵۲ ۔ علامہ شبیر احمد عثمانی م ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء

ساتھ گیا، جلسہ میں جب میری تقریر کا وقت آیا، تو شاہ صاحب کھڑے ہوئے اور لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: بھائیو۔! یہ مولوی ادریس ہیں، دارالعلوم دیوبند کے مدرس ہیں، ان کی عمر کا خیال نہ کرنا[1]، جو کچھ کہیں اُسے غور سے سُننا"۔ تقریر کی لوگوں نے پسند کی اور شاہ صاحب اور علامہ عثمانی دونوں بیحد خوش ہوئے"۔

پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف علمائے دیوبند نے جو علمی فکری محاذ قائم کیا حضرت مُفتی محمد شفیع صاحب، اپنے مضمون میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"اسی زمانے میں اکابر دارالعلوم کے ایک وفد نے جس کی قیادت استاد محترم حضرت شاہ صاحب فرما رہے تھے، عام مسلمانوں میں قادیانی دجل وفریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے ملک کا دورہ کرنا تجویز کیا، اس دورے میں بھی ہم تینوں (مفتی شفیع صاحب، مولانا محمد ادریس اور مولانا بدرِ عالم[2] کو حضرت کا ہم سفر رہنے کی سعادت نصیب ہوئی

اسی زمانے میں یہ طے ہوا کہ ہر سال ایک جلسہ خود قادیان میں کیا جائے جس میں مرزا صاحب کے اوہامِ باطلہ کی تردید خود اُن کے مرکز میں جا کر کی جائے، ان جلسوں میں بھی حضرات اکابر کے ارشاد کے مطابق ہم تینوں کو شریک رہنے کا موقع ملا۔

فیروز پور پنجاب میں قادیانیوں نے مناظرہ کا چیلنج کیا، تو ان سے مناظرے کے لئے دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مولانا سیّد مرتضیٰ حسن کی سرکردگی میں ہم تینوں رفیقِ سفر رہے خود حضرت شاہ صاحب اور علامہ شبیر احمد عثمانی بھی پہنچ گئے۔ تین روز یہ تاریخی مناظرہ جاری رہا۔

حضرت شاہ صاحب کی خاص توجہ اور کوشش نے چند سال میں ایسا کر دیا تھا کہ

---

[1] اس وقت والد صاحب کی عمر تقریباً ۲۲ برس تھی۔

[2] مولانا بدر عالم میرٹھی، مہاجر مدینہ منورہ۔ م: ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۵م

علمی اعتبار سے مرزا صاحب اور قادیانیت نے دم توڑ دیا، اور یہ لوگ مناظرے، مباہلے کا نام چھوڑ کر زیرِ زمین سازشوں میں مشغول ہو گئے۔"[1]

قادیانیوں کے خلاف باقاعدہ تحریری جہاد کا آغاز ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۲ء سے "کلمۃ اللہ فی حیاتِ روح اللہ" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر کیا۔ دیباچہ میں خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس دورِ پُرفتن میں ہر طرف سے دین پر فتنوں کا ہجوم ہے؛ جس میں ایک بہت بڑا فتنہ مرزائیت کا ہے۔ اس فتنے کا بانی منشی مرزا غلام احمد قادیانی ہے، اَولاً اس نے اپنے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا، پھر مثیلِ مسیح ہونے کا، پھر مسیح اور عیسیٰ ہونے کا اور اپنی مسیحیت کی دُھن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا مدعی بنا، اور ان کے رفع الی السماء کو محال قرار دیا، اور صدہا اوراق اس بارے میں سیاہ کئے۔

علمائے اہلِ سنّت والجماعت نے ردِ مرزائیت پر عموماً، اور حیاتِ عیسیٰ پر خصوصاً مفصل، مختصر، اور متوسط کتابیں تالیف فرمائیں اور بارگاہِ خداوندی سے اجر حاصل کیا۔

۱۳۴۲ھ میں اس ناچیز، اور بے بضاعت نے بھی ایک رسالہ کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ" کے نام سے لکھا تھا، جس کو حضرت مخدومنا الحبیب و مطاعنا اللبیب مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے اپنے اہتمام سے شائع فرمایا تھا۔"

(حیاتِ عیسیٰ۔ طبع ملتان ۱۳۷۶ھ، ص: ۳، ۴)

اس کتاب کے بارے میں والد صاحب اپنا ایک عجیب خواب بیان فرماتے ہیں:

"جس شب میں اس رسالے (کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ) کی لوح کا ورق (یعنی ٹائیٹل) طبع ہو رہا تھا، اس ناچیز نے یہ خواب دیکھا کہ یہ ناچیز دار العلوم دیوبند کی مسجد میں داخل ہوا۔ دیکھتا کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام منبر کے قریب اور محراب امام کے سامنے تشریف فرما ہیں، چہرہ مبارک پر عجیب

(۱) بحوالہ مقالہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، مطبوعہ ماہنامہ البلاغ کراچی، ص: ۲۱، شمارہ شعبان ۱۳۹۴ھ/ اکتوبر ۱۹۷۴ء

غریب انوار ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرشتہ بیٹھا ہوا ہے اور حضرت
کے ساتھ کوئی خادم بھی ہے ۔ یہ ناچیز نہایت ادب کے ساتھ دوزانو بیٹھ گیا۔
تھوڑی دیر میں ایک قادیانی پکڑ کر لایا گیا، اور سامنے کھڑا کر دیا گیا بعدازاں
دو عبا لائے گئے ۔ ایک نہایت سفید، اور خوبصورت ہے اور دوسرا نہایت
سیاہ اور بدبودار ہے ۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ سفید عبا اس ناچیز
کو پہنا دیں، اور بدبودار عبا اس قادیانی کو پہنایا جائے ۔ چنانچہ اس ناچیز کو پہنایا
گیا اور سیاہ عبا اس قادیانی کو، اور یہ ناچیز خاموش کھڑا ہے اور قادیانی کو دیکھ کر
دل میں یہ آیت پڑھ رہا ہے ۔ سرابیلھم من قطران وتغشیٰ وجوھھم
النار[1] ۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی "۔

(حیات عیسیٰ، طبع ملتان ۱۳۷۶ھ، ص : ۵، ۶)

" کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ " کا موضوع یہ ہے کہ : قادیانیوں نے حضرت عیسیٰ
علیہ السّلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے پر جو اعتراضات کئے ہیں، ان کا قرآن حکیم،
احادیث نبویہ، اور اجماع امت سے مفصل، اور مدلل جواب دیا ہے، نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کا آسمان پر زندہ رہنا، اور آخیر زمانے میں آسمان سے نازل ہونا بھی ثابت کیا گیا ہے ۔ اس کتاب
کے تقسیم ہند سے قبل اور اس کے بعد متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔ موجودہ ایڈیشن حیات عیسیٰ
کے نام سے طبع ہوا ہے ۔ ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔
کتاب اگرچہ ضخیم نہیں ہے، مگر مضمون کے اعتبار سے کتنی اہم ہے، اس کا اندازہ علامہ
انورشاہ کاشمیریؒ، اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تقریظات سے لگایا جا سکتا ہے، جو اس کتاب پر
انھوں نے تحریر فرمائیں، علامہ انورشاہ تحریر فرماتے ہیں :-
" رسالہ کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ " مصنفہ علامہ فہامہ جناب مولوی

---

[1] ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے، اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی۔

محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدرس دار العلوم دیوبند کا احقر نے کہیں سے دیکھا، اور بعض مضامین کو مؤلف ممدوح کی زبان سے سُنا، رسالہ مذکورہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام میں کافی وشافی اور مباحثِ متعلقہ کا حاوی، اور جامع ہے. نقول معتبر اور مستند کتابوں سے لی گئی ہیں، اور عمدہ سے عمدہ قول سامنے رکھدیا ہے. علماء اور طلبہ کو تلاش اور تتبع سے بے نیاز کر دیا ہے"

اسی کتاب کے بارے میں علامہ شبیر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں :

"تقریباً دس سال ہوئے ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء بمقام فیروز پور پنجاب، قادیانی مرزائیوں سے متنازعہ فیہ مسائل میں علمائے دیوبند کی گفتگو ہوئی تھی، سب سے پہلی بحث حضرت مسیح بن مریم کی حیات، اور رفع الی السماء، اور دوبارہ تشریف آوری کے متعلق تھی، جس میں دیوبند کی طرف سے برادرِ مکرم جناب مولوی محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدرس دار العلوم، وکیل تھے، مولوی صاحب نے جو عالمانہ، اور محققانہ تقریر فرمائی، بحمد اللہ تعالیٰ نہ صرف عام پبلک بھی اس سے محظوظ اور مطمئن ہوئی بلکہ بندہ کے روبرو بعض ممتاز مرزائیوں نے بھی اس کی معقولیت، اور سنجیدہ روش کی داد دی۔ اور اس طرح مولوی صاحب کے عالمانہ طرزِ استدلال نے منکرین سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا۔

میں نے اُسی وقت مولانا موصوف سے درخواست کی تھی کہ آپ اس مسئلہ کے تمام اطراف وجوانب کی توضیح وتحقیق ایک کتاب کے ذریعے اس طرح کر دیجئے کہ غائب وحاضر کے لئے اس میں بصیرت ہو، اور مسئلہ کا تمام مادہ بیک وقت سامنے آجائے۔ اور کسی باطل پرست کو گنجائش نہ رہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد وہ ایک حق پرست کے قدم ڈگمگا سکے۔

شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت تک کوئی کتاب، اس قدر جامع

اور حاوی، ایسے سادہ اور بے تکلف انداز میں نہیں لکھی گئی۔"

(حیات عیسیٰ، طبع ملتان ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء ص: ۱۴۰-۱۴۲)

"کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ" کے متعلق علامہ شبیر احمد عثمانی کے برادر بزرگ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"برادر عزیز مولوی محمد ادریس صاحب، جو دارالعلوم دیوبند کے لائق مدرس ہیں اور عالم باعمل، متصلب فی الدین ہیں، نے رسالہ کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ تصنیف کر کے اس مسئلہ (حیات عیسیٰ کے) کو اور زیادہ روشن اور واضح کر دیا ہے کہ منصف مزاج اور طالب حق کے لئے گنجائشِ تردد و تأمل نہیں چھوڑی۔"

(۱۱ رجب ۱۳۴۳ھ)

حیات عیسیٰ میں قرآنی آیات، اور احادیث صحیحہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ: کسی جسم عنصری کا آسمان پر اٹھایا جانا نہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے، نہ سنّت اللہ سے متصادم ہے، اور اسی طرح کسی جسمِ عنصری کا بغیر کھائے پیئے زندگی بسر کرنا، اور ایک عرصۃ تک زندہ رہنا ممکن ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے وفات نہ پانے، اور زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے، اور پھر قیامت کے قریب نزول پر چار دلیلیں قرآنِ حکیم سے، اور چھ دلیلیں احادیث صحیحہ سے دی گئی ہیں۔"

یہ کتاب اگرچہ مرزائے قادیان کے رَد میں تالیف کی گئی، مگر اس سے عیسائیوں کا بھی رَد ہوا کیونکہ وہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو سولی چڑھا دیا گیا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد جب پاکستان (۱۹۴۹ء) میں تشریف لے آئے۔ تو یہاں بھی امّتِ مسلمہ کو اس فتنے کا سامنا تھا۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں، قادیانیت کے خلاف علمائے حق کی جدوجہد نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

اس وقت حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب بقید حیات تھے۔ جامع مسجد نیلہ گنبد میں

زیادہ تر جمعہ کے روز مفتی صاحب مرحوم تقریر فرمایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی جامع مسجد نیلہ گنبد میں آپ کی تقاریر ہوتیں، اور ملک کے مختلف حصوں میں جو جلسے منعقد ہوتے وہاں تشریف لے جاتے اور قادیانیت کے خلاف بصیرت افروز تقریریں کرتے۔ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں جب بہت سے علماء تحریک ختم نبوت کی پاداش میں دار ورسن کی صعوبتیں اٹھا رہے تھے، آپ تحریری و تقریری جہاد میں مصروف تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ فروری ۱۹۵۳ء کا کوئی ایک جمعہ تھا، شہر میں ہر طرف ہنگامہ بپا تھا، نیلہ گنبد چوک میں آگ لگی ہوئی تھی۔ جامعہ کی گلی میں بعض شر پسند اپنے گھروں کے دروازوں سے گولیاں برسا رہے تھے، اور کسی کی باہر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی حضرت مفتی صاحب مرحوم اور والد صاحب جمعہ کی نماز کے لئے مسجد نیلہ گنبد گئے اور قادیانیت ہی کے خلاف تقریریں کیں۔

تحریک ختم نبوت نے ۱۹۵۳ء میں شدت اختیار کی تشدد کے واقعات ہوئے، اس لئے مارشل لا ر لگانا پڑا۔ اور آخر کار............

اعلیٰ اختیارات کا ایک کمیشن بیٹھا، جو ان تمام واقعات اور حالات کی تحقیقات کے لئے مامور کیا گیا۔ بہت سے علماء کے عدالتِ عالیہ میں بیانات ہوئے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ والد محترم نے ان مجاہدین کی کس طرح علمی رہنمائی کی جو جیل کی کوٹھڑیوں سے باہر رہ کر امتِ مسلمہ کی وکالت کر رہے تھے۔ اکثر قاضی شمس الدین صاحب والدِ محترم کی خدمت میں تشریف لاتے، گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ عدالتِ عالیہ میں اُنہیں موقف کی حمایت میں جو مواد بہم پہنچانا ہوتا، وہ والد صاحب سے حاصل کرتے۔

قاضی شمس الدین کے علاوہ، ان دنوں والد صاحب کے پاس اس موضوع پر گفتگو کے لئے جو اہلِ علم تشریف لائے ان میں خاص طور پر تحریک ختم نبوت کے مجاہد مولانا محمد علی جالندھریؒ، مولانا لال حسین اخترؒ، مولانا عبدالستار خاں نیازی، اور قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ قابل ذکر ہیں۔

عدالتِ عالیہ نے والد صاحب کو بھی بیان دینے کے لئے بلایا، تحقیقاتی بنچ دو ججوں پر مشتمل تھا۔ جسٹس محمد منیر، اور جسٹس کیانی مرحوم، دورانِ بیان جسٹس منیر نے مختلف سوالات کئے۔ ایک سوال یہ کیا کہ:

"مولانا! ترمذی میں ایک حدیث آتی ہے، جس میں یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کافر کہے تو اس کا کفر کہنے والے پر لوٹتا ہے۔ بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے بہت سے علماء دیوبندی علماء کو کافر کہتے ہیں، اس حدیث کی رُو سے ان کا کفر خود بریلوی علماء پر لوٹا، اور وہ لوگ کافر ہوئے؟"

والد صاحب نے جواب دیا کہ:

"ترمذی کی حدیث تو صحیح ہے، مگر آپ اس کا مطلب صحیح نہیں سمجھے، حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان، دوسرے مسلمان کو یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وہ مسلمان ہے، دیدہ و دانستہ کافر کہے تو اس کا کُفر کہنے والے پر لوٹے گا، جن بریلوی علماء نے بعض دیوبندی علماء کو کافر کہا انھوں نے دیدہ و دانستہ نہیں کیا۔ بلکہ ان کو غلط فہمی ہوئی جس کی بناء پر انھوں نے ایسا کہا، انھوں نے منشاء تکفیر یہ تجویز کیا ہے کہ ایسے علماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے۔ اگرچہ ان کا یہ خیال درست نہیں کیونکہ وہ اگر ذرا بھی غور و فکر کرتے یا ان ہی حضرات کی وہی کتابیں اور عبارتیں دیکھ لیتے جس سے بریلوی حضرات علماء کو یہ خیال ہوا ہے تو خود ہی اس کا ازالہ ہو جاتا پھر بھی ہم اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ان حضرات نے بعض علماء دیوبند کی تکفیر اس بنیاد یعنی توہین رسول کے مزعومہ پر کی ہے۔ لہٰذا یہ کُفر کہنے والے پر نہیں لوٹے گا، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ دیوبندی علماء بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حُضور اقدس کی شان میں گستاخی کرنے والا کافر ہے۔ ہم جواباً ان کی تکفیر کا طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ اس بلند پایہ جواب کو جو ایک صحیح عالم کی بلند حوصلگی کی ترجمانی کر رہا ہے، بہت سے بریلوی نہایت متاثر ہوئے اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا کاش کہ یہ وسعت حوصلہ دوسری جانب بھی پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ والد

رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت اور محبت رکھنے میں ہر طبقہ کے علما اور عام حضرات برابر کے شریک تھے۔

عدالت میں زبانی بیان دینے کے علاوہ، آپ نے ایک مفصّل تحریری بیان قلم بند کیا جس میں پوری تفصیل سے ایمان، اور کفر کی تعریف، اس کے وجوہ، اور اسباب پر بحث کی، یہ بیان بعد میں "مسلمان کون، کافر کون" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں ایمان اور کفر کے موضوع پر جس قدر تفصیل سے بحث کی گئی، اتنی یقیناً یک جا کسی ایک کتاب، اور مضمون میں اس سے پہلے نہیں کی گئی تھی۔

سب سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابوں سے اُن کا اپنا عقیدہ اور مذہب بیان کیا، اس کے بعد جو عنوانات قائم کئے، اور قرآن وحدیث کی روشنی میں ان پر مفصّل بحث کی، وہ یقیناً اس موضوع پر ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

حسب ذیل چند عنوانات سے اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

- ایمان کی تعریف
- کُفر کی تعریف۔
- ضروریاتِ دین کی تعریف
- قومی اسلام، اور شرعی اسلام
- اسلام میں ختم نبوّت کا عقیدہ متواتر ہے
- ایمان باللہ اور ایمان بالرسول میں فرق
- مسئلہ تکفیر اہلِ قبلہ
- الحاد، زندقہ، اور ارتداد کی تعریف اور احکام
- مرتدین کے حق میں قرآن کا فیصلہ
- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت آدم علیہ السّلام کی پیدائش سے پہلے خاتم النبیین تھے۔

- اسلام میں مدعیانِ نبوت کے بارے میں اجماعی فیصلہ جس پر صدّیق اکبر اور بعد کے قرون میں عمل کیا گیا۔

- ختمِ نبوّت، اور اُس کا مفہوم وحقیقت

قادیانیوں کے خلاف پاکستان میں تحریک زوروں پر تھی، بھارت سے مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ایک مضمون شائع کیا جس میں لاہوری قادیانیوں کی حمایت کی گئی، اور ان کو دائرۂ کُفر سے نکالنے کے لئے مولانا صاحب نے خاصے ہاتھ پاؤں مارے۔ والد صاحب نے وہ مضمون پڑھا، اور یہ لحاظ کئے بغیر کہ دریا بادی صاحب کو، مولانا اشرف علی تھانویؒ سے نسبت ہے۔ ان کے خلاف ایک بیان لکھا جس کا مضمون مدلّل، اور الفاظ سخت تھے۔ یہ جوابی مضمون، جامعہ اشرفیہ لاہور کے ماہانہ رسالے "انوار العلوم" میں چھپایا گیا۔[1]

حضرت کی عصبیت فی الدین کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا عبدالباری ندوی نے ایک مکتوب میں والد صاحب والد صاحب کو مولانا عبدالماجد دریابادی کے خلاف عنوان اور مضمون سخت اختیار کرنے کی شکایت کی جس کی والد صاحب نے کوئی پروا نہ کی۔

حمایت کے پہلو پر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خود مولانا ندوی سے اس قدر انقباض اور تکدر ہوا کہ اس کے بعد جب وہ لاہور تشریف لائے اور حضرت محمد حسن صاحب کی ایک مجلس میں یا کسی تقریب میں والد صاحب کی موجودگی میں مولانا ندوی ملاقات کے لئے قدم رفاقت کے انداز میں مصافحہ کے لئے بڑھے تو والد صاحب سے من احب للہ، وابغض للہ کا رنگ غیر اختیاری طور پر ظاہر ہوا اور اعراض فرمالیا۔

---

[1] میں نے کوشش کی کہ جامعہ اشرفیہ کی لائبریری سے ماہنامہ انوار العلوم کی فائلیں مل جائیں تاکہ مولانا دریا بادی اور والد صاحب کے مضامین کے اہم اقتباسات ہدیہ ناظرین کرسکوں، مگر وہاں چند بے ترتیب پرچوں کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ پایا۔ ایک ایک پرچہ دیکھا، مگر دونوں مطلوبہ مضامین نہ ملے۔ اگر کسی صاحب کے پاس ہوں تو مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن کے لئے استفادہ ممکن ہو۔ چند ورق منتشر مسودات میں سے ملے، ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ (مؤلف)

عبدالماجد دریا بادی اور مسیلمہ پنجاب کی حمایت

الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہٗ۔ عرصہ سے عبدالماجد دریا آبادی ایڈیٹر الصدق کے مضامین مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی حمایت میں شائع ہو رہے ہیں۔ چونکہ عبدالماجد صاحب حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ سے اپنی نسبت بیان کرتے ہیں۔ اس لیے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ حضرت حکیم الامت کی نسبت کے ساتھ یہ مرزائیت کی حمایت کیسی اس لیے چند مختصر کلمات احباب کی تشفی کے لیے لکھ رہا ہوں۔ وباللہ التوفیق

ختم نبوت کا عقیدہ قرآن کریم اور حدیث متواتر اور اجماع صحابہ تابعین اور اتفاق علماء امت محمدیہ ثابت ہے جس میں ذرہ برابر کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں۔

امت محمدیہ میں سب سے پہلا اجماع جو منعقد ہوا وہ مدعی نبوت کے قتل پر ہوا۔ صدیق اکبر نے خلیفہ ہونے کے بعد مسیلمہ کذاب کے قتل کے لیے صحابہ کرام کا لشکر روانہ کیا بالآخر اس کو قتل کیا اور اس کے متبعین کو بھی قتل کیا اور قیدیوں کو گرفتار کر کے مدینہ لائے اور ان کو غلام و باندی بنا کر مجاہدین پر تقسیم کیا۔

مدعی نبوت کے جہاد و قتال پر امت محمدیہ کا یہ پہلا اجماع تھا جو عہد صدیقی میں منعقد ہوا۔ کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ مسیلمہ کذاب سے یہ دریافت کیا جائے کہ وہ اپنی نبوت کے کیا دلائل پیش کرتا ہے مسیلمہ کے بعد طلیحہ اسدی نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ صدیق اکبر نے اس کے قتل کے لیے بھی خالد بن ولید کو لشکر دے کر روانہ کیا۔ اس کے بعد خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں حارث نامی ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ علماء تابعین کے متفقہ فتویٰ سے اس کو قتل کر کے عبرت کے لیے سولی لٹکایا گیا۔ اور اس کے بعد خلفاء اور سلاطین اسلام کا مدعیان

نبوت کے ساتھ یہی عمل رہا جیسا کہ شفائے قاضی عیاض میں تصریح ہے اور صبح الاعشیٰ صفحہ ۳۰۵ ج ۱۳ میں ہے کہ ہر زمانے میں اسلامی حکومت کا معمول یہی رہا کہ جس نے نبوت کا دعوی کیا اس کو سزائے موت دی گئی۔ حدیث میں ہے۔ لا تجتمع امتی علی الضلالۃ ۔ میری امت گمراہی پر کبھی متفق نہیں ہو سکتی۔ محقق ابن امیر الحاج شرح تحریر الاصول صفحہ ۸۵ ج ۳ میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث باسانید صحیحہ اور طرق متعددہ مروی ہے، فرداً فرداً اگرچہ اخبار آحاد میں لیکن قدر مشترک متواتر ہے۔

وقال تعالیٰ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی و یتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ماتولی ونصلہ جھنم وساءت مصیرا

اور جو شخص حق واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کے متفقہ مسلک کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرے تو ہم دنیا میں اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے کہ جو چاہے کرے اور آخرت میں اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور جہنم بہت بری جگہ ہے۔

اس آیت میں سبیل المومنین سے اجماع صحابہ واہل مراد ہے۔ جس کی مخالفت کو دخول جہنم کا سبب قرار دیا۔ علاوہ ازیں اگر اجماع حجت نہ ہو تو پھر دین ایک کھلونہ بن جائے، اور ہر شخص کی رائے اور سمجھ کے تابع ہو جائے۔

خلاصہ کلام

یہ کہ جس طرح مسیلمہ کذاب اور اس کے متبعین قطعاً کافر اور مرتد ہیں۔ اسی طرح مسیلمہ پنجاب مرزا غلام قادیانی اور اس کے اتباع واذناب بھی قطعاً کافر اور مرتد ہیں، دونوں کے کفر اور ارتداد میں ذرہ برابر فرق نہیں، بلکہ مسیلمہ کذاب کا تو فقط ایک ہی کفر (یعنی دعوائے نبوت) ثابت ہے اور مسیلمہ پنجاب کے کفریات کی تو کوئی شمار ہی نہیں اس لئے کہ مسیلمہ پنجاب کفر میں

یمامہ کے مسیلمہ کذاب بہت آگے ہے، لہٰذا جس طرح مسیلمہ کذاب کے کفر میں شک اور تردد کفر اور ارتداد ہے، اسی طرح مسیلمہ پنجاب کے کفر میں بھی شک اور تردد کرنا صریح کفر اور صریح ارتداد ہے۔ امتِ محمدیہ کے چودہ قرن کے علمار اور سلف صالحین کا یہی اجماعی عقیدہ ہے جو عہد صحابہ سے لے کر ہم تک بطریق تواتر پہنچا ہے، جو شخص اجماع صحابہ و تابعین پر نظر ثانی کا تصور بھی کرے یہی اس کے گمراہ اور بے دین ہونے کی دلیل قطعی ہے۔

رہا دریا بادی صاحب کا حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہٗ سے اپنا تعلق ظاہر کرنا یہ سب فریب اور مغالطہ ہے۔ حضرت تھانوی سے علاقہ اسی وقت تک رہ سکتا ہے کہ جب عقائد اسلام اور عقائد اہلِ سنّت پر قائم ہو اور حضرت تھانوی کے مسلک پر قائم ہوں، اور جب اسلام کے اجماعی عقیدہ ہی سے انحراف ہو جائے تو حضرت تھانوی سے تعلق خود بخود منقطع ہو جاتا ہے۔ بزرگان دین سے تعلق دین کے تعلق پر موقوف ہے جب دین ہی سے تعلق نہ رہا تو بزرگان دین سے کہاں تعلق رہ سکتا ہے۔

حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ کی تصانیف مرزا غلام احمد کی صریح تکفیر موجود ہے اور مرزائے قادیانی کے کفر کے فتووں پر حضرت حکیم الامت کے بھی دستخط ہیں اب ظاہر کہ ایسی صورت میں دریا آبادی صاحب کا حضرت تھانوی سے کیا علاقہ رہ سکتا ہے۔ حضرت تھانوی کا مسلک یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متبع کافر اور مرتد ہیں اور دریا آبادی صاحب کے نزدیک مرزا صاحب کافر نہیں کا مسلک حضرت تھانوی کے مسلک کے صریح منافی اور متناقض ہے، یہ دو متناقض مسلک ذاتِ واحدہ میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اجتماع نقیضین باجماع عقلار عالم محال ہے۔

مسلمانوں کو نصیحت

اے میرے عزیزو! اپنے ایمان کی حفاظت کرو اور خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن نہ چھوڑو اور اجماعی عقیدہ صحابہ و تابعین سے لے کر اس وقت تک تم کو بطریق تواتر پہنچا ہے

اس کو حرزِ جان بنا کر رکھو اور اخباری مضمون نگاروں پر اپنے دین اور ایمان کو قربان نہ کرو۔ دنیا میں سینکڑوں مسیلمہ اور کذاب آئے اور ہزاروں ان کے حامی ہوئے مگر سب ختم ہوئے، صرف ایک دینِ محمدی باقی رہا اور انشاءاللہ قیامت تک باقی رہے گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ مدعی نبوت کا ارتداد امتِ محمدیہ ایک اجماعی عقیدہ ہے، اس کے خلاف کسی ایڈیٹر اور مضمون نگار کا کوئی حرف ہذیان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ دریا آبادی صاحب کو بھی معلوم ہے کہ یہ اجماعی عقیدہ اس لئے مسیلمہ پنجاب کی حمایت میں اجماع امت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے تحقیر آمیز الفاظ میں لکھتے ہیں

> "جن معاصر علماء نے کفر وغیرہ کے فتوے صادر کئے وہ ضرور ماجور ہوں گے اور ان کو یہی کرنا چاہیئے تھا لیکن بہر حال غیر معصومین کے اقوال و تحقیقات پر نظرِ ثانی کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے، خصوصاً بدلتے ہوئے حالات میں۔"

دریا بادی صاحب کی اس عبارت سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتویٰ آپ کے نزدیک فقط آپ کے معاصر علماء نے دیا ہے اس سے پہلے کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا۔ (جو صریح غلط ہے صحابہ و تابعین کے وقت سے لے کر اس وقت تک تمام مشرق اور مغرب کے علماء کا یہی فتویٰ رہا ہے کہ مدعی نبوت کا ذب کافر و مرتد ہے)

دوم یہ معلوم ہو کہ دریا آبادی صاحب اپنے کو علماء عصر کا معاصر سمجھتے ہیں، حالانکہ دریا آبادی صاحب عالم نہیں۔ البتہ ایڈیٹروں اور اخبار نویسوں کے معاصر ہیں۔

سوم اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اجماع امت ایک امر ظنی ہے کیونکہ وہ غیر معصوموں کے اقوال و تحقیقات کا نتیجہ ہے نظرِ ثانی کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

جاننا چاہیئے کہ صحابہ اور تابعین اور علماء امت اگرچہ فرداً فرداً غیر معصوم ہیں مگر ان کا اجماع معصوم عن الخطاء ہے اور شریعت میں حجت اور تابعین کے اجماع کے بعد کسی بڑے سے بڑے عالم کو بھی خلاف کرنے کا حق باقی نہیں رہتا اور نہ آج تک کسی امام اور مجتہد اجماع صحابہ کا خلاف کیا

حضرات فقہاء اور محدثین کا یہ معمول ہے کہ جب کوئی حدیث اجماع صحابہ کے خلاف دیکھتے ہیں تو اس کو منسوخ العمل سمجھتے ہیں۔ علماء امت کی نظر میں اجماع صحابہ دلیل نسخ ہے یعنی علامت نسخ ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ تمام صحابہ کرام کسی حدیث کے خلاف پر متفق ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ صحابہ کے علم میں ضرور کوئی دوسری حدیث اس حدیث کی ناسخ ہوگی۔ جب ہی تو اس کے خلاف پر متفق ہوئے، مگر ہم کو قصور علم کی وجہ سے اس ناسخ کا علم نہ ہو سکا۔ نیز تمام غیر معصومین ایک رتبہ اور ایک درجہ کے نہیں ہوتے۔ انبیاء کے سب غیر معصوم ہیں۔ مگر علم اور فہم اور تقویٰ اور دیانت کے اعتبار سے درجات مختلف ہیں۔ دریا آبادی صاحب کی اس عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جس طرح میں غیر معصوم ہوں، اسی طرح دیگر علماء امت بھی غیر معصوم ہیں۔ ایک غیر معصوم دوسرے غیر معصوم کی تحقیق پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وعلینا معہم یا ارحم الراحمین۔

محمد ادریس کاندھلوی کان اللہ لہ
وکان للہ وجعل ہمہ وہواہ
فیما یحبہ ویرضاہ
آمین جامعہ اشرفیہ
لاہور

والد صاحب کے اس جوابی مضمون پر بعض حضرات نے خاصا ناک بھوں چڑھایا، بھارت سے مولانا عبدالباری ندوی صاحب کا خط آیا (مولانا عبدالباری والد صاحب کے زمانۂ حیدرآباد دکن کے رفقا میں سے تھے) انھوں نے اس بات کی خاص طور پر شکایت کی کہ: آپ نے دریابادی صاحب کی، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت کا بھی خیال نہیں کیا، مضمون ومعنون کے علاوہ، عنوان بھی بہت تلخ اختیار کیا، والد صاحب کے جوابی مضمون کا عنوان تھا: عبدالماجد دریابادی، اور سیلِ پنجاب، مگر والد صاحب کے ہاں ذاتی تعلقات، اور مصلحت اندیشی، دینی تقاضوں کے مقابل کوئی معنیٰ نہیں رکھتے تھے بلکہ مولانا عبدالباری ندوی کے اس

۱۹۵۳ء میں جب قادیانیت کے خلاف مسلمانوں کی تحریک عروج پر تھی، آپ نے ختم نبوت کے موضوع پر ایک کتاب تالیف کی، حضور علیہ السلام کے خاتم النبیین ہونے پر اس کتاب میں اتنے ٹھوس دلائل پیش کیے کہ قادیانیوں کے کسی فرد یا حلقے سے آج تک اس کتاب کا جواب بن نہ پڑا۔

اسی زمانے میں قادیانیوں نے بعض اولیائے کرام، اور مولانا محمد قاسم نانوتوی[1] کی بعض عبارتوں کو مسخ کرکے، اور ان کا سیاق وسباق حذف کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نعوذ باللہ بعض اولیائے کرام اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ حضور کے بعد کسی ظلّی اور بروزی نبی کا آنا ممکن ہے۔ آپ نے مرزائیوں کی اس تلبیس کا جواب دیا، اور خاص اسی موضوع پر ایک رسالہ لکھ کر شائع کردیا، جس کا موضوع ہی یہ تھا:

"حضراتِ صوفیائے کرام، اور مولانا محمد قاسم نانوتوی پر مرزائیوں کا بہتان اور افتراء"
آپ نے اس رسالے کے پیرایۂ آغاز میں لکھا:

"بندۂ ناچیز محمد ادریس کاندھلوی اہلِ اسلام کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ مرزائیوں کو اپنی گمراہی اور غلط عقائد کے ثابت کرنے کے لئے کتاب اور سنت

---

[1] مولانا محمد قاسم نانوتوی - م ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰م

اور اقوالِ صحابہ و تابعین، اور ائمہ دین، اور فقہاء اور محدثین، مفسرین اور متکلمین، کے کلام میں تو کہیں تل رکھنے کی گنجائش نہیں ملتی، اس لئے یہ گروہ حضراتِ اولیائے کرام، اور عارفین کے ناتمام اقوال قطع و برید کرکے عوام کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ عوام، ان حضراتِ اولیا کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکیں، حالاں کہ ان بزرگوں کا صریح عقیدہ جو عین قرآن و حدیث کے مطابق ہوتا ہے، وہ ان کتابوں میں مذکور ہوتا ہے، اس کو یہ لوگ نقل نہیں کرتے، البتہ بزرگوں کے بعض ایسے مُبہم اور مجمل فقروں کو نقل کر دیتے ہیں؛ جو ان بزرگوں سے خاص حالتِ سُکر میں نکل جاتے ہیں، جو باتفاقِ علماء حجت نہیں۔ جیسا کہ منصور نے ایک خاص بے خودی کی حالت میں "انا الحق" کہہ دیا، مگر جب ہوش آیا تو تائب ہوئے، تو کیا کوئی عاقل، منصور کے انا الحق کہنے سے یہ استدلال کر سکتا ہے کہ ظلّی اور بروزی ربوبیت بندے کو بھی حاصل ہو سکتی ہے اور لا الٰہ الا اللہ، کے یہ معنیٰ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی مستقل خدا نہیں ہو سکتا، البتہ ظلی اور بروزی خدا ہو سکتا ہے۔ حاشا و کلا۔ یہ صریح کفر اور ارتداد ہے۔ اسی طرح "لانبی بعدی" میں یہ تاویل کرنا کہ حضور علیہ السلام کے بعد کوئی مستقل نبی تو نہیں آسکتا، البتہ ظلّی اور بروزی نبی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی صریح کفر اور ارتداد ہے"۔

اس رسالہ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کی اس عبارت کو سیاق و سباق کے ساتھ نقل کرکے اس کے مفہوم کی وضاحت کی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان کا ہرگز وہ مقصد نہیں جو اس عبارت سے مرزائی اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا نانوتوی حتماً خاتمیتِ زمانہ کے قائل ہیں اور صراحتہً یہ تحریر فرماتے ہیں: "حضور پُرنور سلسلۂ نبوت کے علی الاطلاق خاتم ہیں زماناً اور رتبتہً بھی۔" نیز فرماتے ہیں: "اپنا دین و ایمان ہے کہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور کے نبی ہونے کا احتمال نہیں۔ جو اس میں تامل کرے، اس کو کافر سمجھتا ہوں[۱]"۔

---

[۱] رسالہ "حضراتِ صوفیائے کرام، اور مولانا محمد قاسم پہ مرزائیوں کا بہتان اور افتراء" طبع لاہور، ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲م، ص: ۲، ۳، ۹، ۱۰۔

مرزائی کیوں کہ ہر جگہ، اور خاص طور پر بیرونی ممالک میں اسلام کے نام پر تبلیغ کرتے اور اپنے لئے عنوان "مسلمان" ہی کا اختیار کرتے ہیں، ان کے اندازِ تبلیغ سے عام لوگوں کو یہ دھوکہ اور مغالطہ ہوتا ہے کہ یہ بھی مسلمانوں کا ایک فرقہ، اور طبقہ ہے۔ ایسے لوگوں کی غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے والدِ محترم نے ایک مستقل رسالہ تالیف کیا، اس کا نام ہی "اسلام اور مرزائیت کا اصولی اختلاف" رکھا۔ اس رسالے میں اپنے ہی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ خود مرزائے قادیان کی عبارتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ مرزائیت ایک جداگانہ مذہب ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ والدِ محترم نے اس رسالے میں اسلام اور مرزائیت کے دس بنیادی اختلاف بیان کئے ہیں۔

ایسے ہی "دعاوی مرزا" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا، اس میں وہ سینکڑوں متضاد اور بعض مضحکہ خیز دعوے نقل کئے جو خود مرزا صاحب نے کئے، اور ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔

مرزائے قادیان ہی کو بے نقاب کرنے کے لئے "شرائطِ نبوت" کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس میں نبی کی دس شرائط بیان کیں مثلاً: عقل کامل ہونا، حافظہ کامل ہونا، علم کامل ہونا، معصوم ہونا، صادق و امین ہونا، اعلیٰ حسب و نسب ہونا، اخلاقِ فاضلہ کا مجموعہ ہونا، زاہد و قانع ہونا، مرد ہونا عورت نہ ہونا، اور پھر یہ بتایا کہ اللہ جل شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء بھیجے، ان سب میں یہ شرائط اور صفات موجود تھیں، مگر مرزائے قادیان میں ان شرائط میں سے کوئی شرط بھی موجود نہ تھی، خود اس کے بقول عقل میں بھی فتور تھا، مراق تھا، حافظہ خراب تھا، علم و فضل کا یہ حال ہے کہ دنیا کی کوئی زبان صحیح لکھنے پر قادر نہ تھا، صدق و امانت، اور زہد و قناعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ساری عمر مقدمہ بازیوں میں گزری۔

بہرکیف رسالہ مختصر ہونے کے باوجود انتہائی جامع اور مدلل ہے۔

* عیسائیوں کے خلاف تحریری جہاد:۔

جس طرح ابتدائے عمر سے قادیانیوں کے خلاف تحریر اور تقریر کے ذریعے مسلمانوں کی

صحیح رہنمائی کرتے رہے، اسی طرح زندگی بھر عیسائیوں کے خلاف بھی سرگرم عمل رہے بعیسائیوں کے عقائد کے رَد میں متعدد کتابیں لکھیں، خاص طور سے ان موضوعات پر بہت زور دیا، عقیدۂ تثلیث کا رَد، عیسائیوں نے اسلام پر، یا حضور اقدس پر جو اعتراضات کئے ہیں، ان کا جواب، اور اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ، اور اسلام کے محاسن۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ: قادیانیوں کے خلاف تحریری جہاد کا آغاز "کلمۃ اللہ فی حیاتِ روح اللہ" لکھ کر کیا، اور یہ کتاب اگر ایک طرف قادیانیوں کے رَد میں لکھی گئی تو دوسری طرف اس سے عیسائیوں کا بھی رَد مقصود تھا، کیوں کہ وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے قائل ہیں۔

عیسائیوں کے غلط عقائد و نظریات کے رَد میں جو کتابیں لکھیں ان میں خاص طور سے دو عنوانات پر زیادہ مواد جمع کیا ہے، اور قرآن و حدیث سے مضبوط دلائل پیش کئے ہیں۔

اوّل: ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا۔ اور دوسرے: انجیل کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت دی تھی اور بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ جب خدا کا آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو تو اس پر ایمان لانا۔ اور اس کی پیروی کرنا۔

اپنی تصنیف "حیاتِ عیسیٰ" میں حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے جو دلائل قرآن حکیم سے دیئے، ان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

" حیاتِ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پہلی دلیل ۔ قال اللہ عزوجل۔ فبما نقضھم میثاقھم وکفرھم بآیاتِ اللہ وقتلھم الانبیاء بغیر حقٍ۔ الیٰ قولہٖ تعالیٰ وکان اللہ عزیزاً حکیماً۔[1]

" حق تعالیٰ شانہٗ نے ان آیاتِ شریفہ میں یہود بے بہبود کے ملعون اور مغضوب

---

[1] سورۃ ، آیۃ :

اور مطرود و مردود ہونے کے کچھ وجوہ و اسباب ذکر کئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ : پس ہم نے یہود کو متعدد وجوہ کی بنا پر مورد لعنت و غضب بنایا۔ (۱) نقض عہد، اور میثاق کی وجہ سے، (۲) آیات الٰہیہ اور احکام خداوندی کی تکذیب، اور انکار کی وجہ سے، (۳)۔ خدا کے پیغمبروں کو بے وجہ محض عناد اور دشمنی کی بنا پر قتل کرنے کی وجہ سے، (۴)۔ اور اس قسم کے متکبرانہ کلمات کی وجہ سے کہ ہمارے قلوب علم اور حکمت کے ظرف ہیں، ہمیں تمہاری ہدایت اور ارشاد کی ضرورت نہیں، حالاں کہ ان کے قلوب علم اور حکمت اور رشد و ہدایت سے بالکل خالی ہیں، بلکہ اللہ نے ان کے عناد اور تکبر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے جس کی وجہ سے قلوب میں جہالت اور ضلالت بند ہے اوپر سے مہر لگی ہوئی ہے، اندر کا باہر نہیں آسکتا اور باہر سے کسی رشد و ہدایت کا اثر اندر داخل نہیں ہوسکتا، پس اس گروہ میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں، مگر کوئی شاذ و نادر جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے رفقاء، (۵)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کفر و عداوت کی وجہ سے، (۶)۔ حضرت مریم پر بہتان لگانے کی وجہ سے جو حضرت عیسیٰ کی اہانت اور تکذیب کو بھی مستلزم ہے۔

امید واثق ہے کہ ناظرین اس اجمالی تفسیر سے سمجھ گئے ہوں گے، یہ آیات شریفہ حضرت عیسیٰ کے رفع جسمی میں نص صریح ہیں، اب ہم کسی قدر تفصیل کرنا چاہتے ہیں، تاکہ طالبان حق کی بفضل خدا تشفی اور تسلی ہو جائے ورنہ ہم کیا، اور ہماری مجال کیا، اور ہم کیا اور ہماری تحریر کیا، جس سے تسلی اور تشفی کر سکیں، قلوب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، جس طرح چاہے اور جدھر چاہے دلوں کو پلٹتا اور پھیرتا ہے، اسی کی توفیق سے لکھ رہا ہوں اور اسی کی توفیق سے اپنے لئے اور ناظرین کرام کی دستگیری کی امید رکھتا ہوں۔

ان آیات میں یہود بے بہبود پر لعنت کے اسباب کو ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک سبب

یہ ہے کہ حضرت مریم پر طوفان اور بہتان لگانا آیات کا سیاق و سباق بلکہ سارا قرآن روزِ روشن کی طرح اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ یہود بے بہبود کی ملعونیت اور مغضوبیت کا اصل سبب حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی عداوت اور دشمنی ہے، اللہ تعالیٰ نے دو الفاظ ذکر فرمائے، ایک وما قتلوہ، جس میں قتل کی نفی فرمائی، دوسرا وما صلبوہ، جس میں صلیب پر چڑھائے جانے کی نفی کی، اس لئے اگر فقط وما قتلوہ فرماتے تو یہ احتمال رہ جاتا کہ ممکن ہے قتل نہ کئے گئے ہوں لیکن صلیب پر چڑھائے گئے ہوں، اور علیٰ ہذا اگر فقط وما صلبوہ فرماتے تو یہ احتمال رہ جاتا کہ ممکن ہے صلیب تو نہ دیئے گئے ہوں لیکن قتل کر دیئے گئے ہوں۔ علاوہ ازیں بعض مرتبہ یہود ایسا بھی کرتے تھے کہ اوّل کرتے اور پھر صلیب پر چڑھاتے، اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے قتل اور صلیب کو علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا، اور پھر ایک حرفِ نفی پر اکتفا نہ فرمایا یعنی وما قتلوہ و صلبوہ نہیں فرمایا ہے بلکہ حرف نفی یعنی کلمۂ ما کو قتلوا، اور صلبوا کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا، اور پھر ما قتلوہ وما صلبوہ فرمایا تاکہ ہر ایک کی نفی، اور ہر ایک کا جداگانہ و مستقلاً رد ہو جائے، اور خوب واضح ہو جائے کہ ہلاکت کی کوئی صورت ہی پیش نہیں آئی۔ نہ مقتول ہوئے اور نہ مصلوب ہوئے اور نہ قتل کر کے صلیب پر لٹکائے گئے۔

ولکن شبہ لھم۔ یعنی ان کے لئے اشتباہ پیدا کر دیا گیا یا شُبّہ کی ضمیر حضرت مسیح کی طرف راجع کرو اور اس طرح ترجمہ کرو کہ عیسیٰ علیہ السّلام کا ایک شبیہ اور ہم شکل ان کے سامنے کر دیا گیا تاکہ عیسیٰ سمجھ کر اس کو قتل کریں، اور ہمیشہ کے لئے اشتباہ اور التباس میں پڑ جائیں حضرت شاہ عبدالقادر اس طرح ترجمہ فرماتے ہیں: لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے، یہ ترجمہ اسی اشتباہ کی تفسیر ہے یعنی اسی صورت سے وہ اشتباہ اور التباس میں پڑ گئے۔ ابنِ عباسؓ سے باسنادِ صحیح منقول ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مسیح کو مکان کے ایک دریچے سے آسمان پر اٹھا لیا، اور ان ہی میں سے ایک شخص کو عیسیٰ علیہ السّلام کے ہم شکل اور مشابہ بنا دیا، یہودیوں نے اس کو عیسیٰ سمجھ کر قتل کر دیا اور بہت خوش ہوئے کہ ہم اپنے

مدعا میں کامیاب ہوگئے[1]

غرض پوری کتاب شروع سے آخر تک اسی طرح دلائل و براہین کا مجموعہ ہے۔

کلمۃ اللہ، کے بعد" احسن الحدیث فی ابطال التثلیث" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، اس میں عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث، اور الوہیت عیسیٰ کے عقیدہ کا رد کیا اور اسلام کے عقیدۂ توحید پر ایسے مدلّل انداز میں بحث کی کہ جواب کی کوئی راہ باقی نہ چھوڑی۔ حتیٰ کہ توریت، زبور، اور انجیل سے عقیدۂ توحید کو ثابت کیا۔ کراچی سے ۱۹۷۲ء میں اس کتاب کا انگریزی ٹرانسلیشن بھی

کے عنوان سے شائع ہوگیا ہے۔ مکتبہ یقین انٹرنیشنل کراچی نے شائع کیا ہے۔

دعوتِ اسلام، اسلام اور نصرانیت، پیامِ اسلام مسیحی اقوام کے نام، بشائر النبیین یہ سب رسائل و کتب، عیسائیوں کے رد میں ہیں۔ بشائر النبیین میں قرآن سے پہلی الہامی کتابوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور ختم المرسلین کے متعلق جو بشارتیں اور اور شہادتیں موجود ہیں انھیں جمع کیا ہے، اس کا بھی کے نام سے انگریزی ترجمہ شائع ہوگیا ہے۔ دعوتِ اسلام کا بھی انگریزی ترجمہ کے نام سے چھپ چکا ہے۔

* جبریہ و قدریہ کا رد

جبر و اختیار کا مسئلہ مذاہبِ عام کا پیچیدہ مسئلہ ہے، جو مذہبی دنیا کے لئے ہمیشہ الجھنوں اور صدہا فکری مشکلات کا سبب رہا ہے۔

پیچیدگی درحقیقت بندے اور خدا کے درمیانی رابطے اور باہمی نسبت سے پیدا ہوتی ہے۔ بندے کے نقائص کا خدا کے کمالات سے جوڑ کیسے لگے۔؟ بندے کی محتاجگی،

[1] حیات عیسیٰ۔ طبع ملتان ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء۔ ص ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۵

اور مجبوری، خدا کے غنا، اور اختیارِ مطلق سے مربوط کیسے ہو۔؟ خدائے برحق کے مختار مطلق ہونے کی نسبت سے بندے میں جبر و اختیار کا کونسا پہلو تسلیم کیا جائے جس سے بندے کی تکلیفِ شرعی اور سلسلۂ سزا و جزا کی معقولیت اپنی جگہ رہے اور اللہ تعالیٰ کی تنزیہ و تقدیس پر بھی غبار نہ آئے

خدا کی طرح بندے میں اختیار مستقل مانا جائے اور جبر کی نفی کر دی جائے۔ یا بندے کو مجبورِ محض مان کر اختیار کو مطلقاً اس سے نکال دیا جائے، یا انسان کو جبر اور اختیار، دونوں کا مجموعہ مانا جائے۔ ان میں سے کوئی بھی صورت پیچیدگی سے خالی نہیں

اگر بندے کو مستقل بالاختیار مانا جائے تو خدا کی برابری لازم آئے گی اور اگر مٹی اور پتھر کی طرح بے اختیار اور مجبورِ محض تسلیم کریں تو اس کے اعمال و افعال پر خدا کی طرف سے سزا و جزا کا مرتکب ہونا ظلم کہلائے گا۔

جبریہ نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ خدا مختارِ مطلق اور بندہ مجبورِ محض ہے

قدریہ نے یہ راہ اختیار کی کہ بندہ جو افعال اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے، ان میں مطلق الاختیار ہے بلکہ وہ اپنے افعال کا خالق بھی خود ہی ہے، انھوں نے بندے کے اچھے بُرے اعمال کی ذمّہ داری خدا پر نہیں ڈالی، بلکہ خود بندے کے سر ڈال دی اور خدا کی شانِ عدل کو بے غبار کر دیا۔

لیکن اہلِ سنّت و الجماعت سخت ترین مشکل میں گھر گئے۔ وہ بندے کے جبر و اختیار میں سے کوئی پہلو بھی ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے۔ خدا کو مختارِ مطلق، اور جبر کی صفت سے کلیتہً بری مانتے ہیں، اور بندے اور خدا میں، قدرت و اختیار کی تقسیم اور حد بندی کے بھی قائل نہیں۔ بلکہ خدا کو کلیتہً مختارِ مطلق مانتے ہوئے بھی بندے کو مجبورِ محض ماننے کے لئے تیار نہیں۔ گویا بندے کو بیک وقت مختار بھی جانتے ہیں، اور مجبور بھی۔ مگر اس درمیانی انداز سے کہ وہ مختارِ مطلق ہے، اور نہ مجبورِ محض ہے۔ مختار مان کر زنجیرِ تقدیر سے

پابستہ کرتے ہیں، اور مجبور کہہ کر اینٹ پتھر کی طرح مضطر و بے بس نہیں مانتے، اور پھر ان باتوں کے ساتھ خدا کو بھی ہر قسم کے ظلم، تعدی اور ارتکاب عبث سے بری جانتے ہیں

بہر کیف مشکل میں اگر ہیں، تو اہلِ حق ہیں۔

ساتویں صدی ہجری میں ایک یہودی زید بن تقعی نے اسلام کے اسی مسئلہ قضاء قدر کو بڑے زور شور سے اٹھایا۔ اعتراضات اور طعن سے بھر پور ایک نظم کہی اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ جب اس یہودی کی نظم شائع ہوئی تو علمائے حق اس کے جواب کی طرف متوجہ ہوئے۔ شام، عراق، اور مصر کے علماء نے نظم، اور نثر دونوں میں اس زندیق کے اعتراضات اور طعن کا جواب دیا۔

والد صاحب قبلہ لکھتے ہیں:

"کئی بار دل میں خیال آیا کہ علمائے شام و مصر نے اس زندیق کے جواب میں قصائد لکھے اور مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کی، اور بارگاہِ خداوندی سے رضا اور خوشنودی کا تمغہ حاصل کیا، مگر ہندوستان کے کسی عالم نے اس قصیدے کا جواب نہیں لکھا ایک روز یہی خیال دل میں آیا، اور بے اختیار چند اشعار زبان پر آگئے، خدا کا نام لے کر لکھنا شروع کیا، بحمد اللہ بہت سے مفید مضامین قلم بند ہو گئے۔ یہ محض ایک طالبعلمانہ قصیدہ ہے۔ عالمانہ نہیں۔ حضراتِ سلف کے قصائد کے ساتھ تو کوئی نسبت ہی نہیں۔"

یہ قصیدہ ۱۹۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ والد محترم نے ۱۳۵۶ھ میں لکھا۔ اس کی دو شرحیں لکھیں، ایک عربی میں، اور ایک اردو میں، اردو شرح کے ساتھ دار العلوم دیوبند سے ۱۳۶۶ھ میں شائع ہوا، قصیدے اور شرح کے ۵۶ صفحات ہیں۔ اس پر حضرت قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دار العلوم دیوبند) کا بسیط مقدمہ ہے، جو ۶۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ حضرت قاری صاحب اپنے طویل مقدمے کے آخر میں قصیدہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اہلِ سنّت میں اس عقدۂ لاینحل کو حل کرنے والے محقق جنھوں نے مسئلہ کو خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھا دیا ہے، سلف اور خلف میں بکثرت پیدا ہوئے۔ سلف میں جیسے حضرت علی، ابنِ عباس، حسن بصری وغیرہ پھر قرونِ مابعد میں اشعری، غزالی، رازی، شیخ اکبر، اور عارف رومی، قرونِ متاخرہ میں شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالعزیز وغیرہ۔ پھر ان کے اخلاف رشید میں حکیم اسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم وغیرہ، اکابرِ امّت ہیں۔ جنھوں نے اس مسئلہ پر زبان و قلم اٹھایا۔ انہی اکابر کے اخلاف حال میں جو افراد مسئلہ کو سمجھا دینے اور صاف کر دینے پر قلم اٹھا سکتے ہیں، ان میں بحمداللہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ التفسیر برادرِ محترم مولانا الحافظ، الحاج الشیخ محمد ادریس کاندھلوی بطولِ حیاتہٖ کا اسم گرامی خاص طور سے سامنے لائے جانے کے قابل ہے۔ جنھوں نے مسئلہ جبر و اختیار کے موضوع پر اپنے عربی کے اس بلیغ قصیدے "تائیۃ القضاء والقدر" میں جو میری ان سطور کا محرک ہے، جامع بحث کرتے ہوئے سلف و خلف کے کلام سے مسئلہ کی بنیادوں کو کھولا ہے۔ اور بحمداللہ کافی مواد پیش کیا ہے۔

الحمدللہ مولانا محمد ادریس صاحب نے بھی اس یہودی کی تردید فرما کر جہاں اپنی ذات کو علماء سلف کی فہرست میں شامل کر لیا، وہیں ہندوستان کے لئے اس فخر کا موقع بھی بہم پہنچا دیا کہ علمائے ہندوستان بھی شام، عراق، اور مصر کے علماء سے اس بارے میں پیچھے نہیں رہے۔

بہرحال قصیدۂ تائیہ اپنی ذات سے پُرمغز، اپنی نوعیت سے کشافِ شبہات، اپنی نسبت و اضافت سے قصیدۂ استاد کی پیروی، اور اپنے

مفاخر کے لحاظ سے چشمک زن قصائد سلف ہے۔ یہ کل چیزیں مصنفِ قصیدہ کے لئے مفاخر و فضائل کی حیثیت رکھتی ہیں، جو اُنھیں من جانب اللہ عطا ہوئی ہیں۔" (۲۹ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ)

حضرت قاری صاحب کا مقدمہ، اور تبصرہ بذاتِ خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے جب یہ قصیدہ قاری صاحب کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہونے لگا تو مقدمہ کا جداگانہ نام تجویز کیا، اور قاری صاحب کے اسمِ گرامی کی مناسبت سے "اطیب الثمر" نام رکھا۔

اس قصیدہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس پر نہ صرف قاری صاحب نے اتنا بسیط اور پُر مغز مقدمہ تحریر فرمایا، بلکہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، اور علّامہ شبیّر احمد عثمانی نے بھی تقریظیں لکھیں۔

جب والد صاحب قبلہ نے حضرت تھانوی کو اس قصیدے کی اطلاع دی تو ساتھ ہی یہ لکھا کہ "دل چاہتا ہے کہ حضرت اس کو ملاحظہ فرمالیں" ۔ حضرت نے اجازت دے دی، تب والدِ محترم نے یہ قصیدہ حضرت کی خدمت میں روانہ کیا، حضرت نے قصیدے کے خاتمے پر اپنے قلمِ مبارک سے یہ شعر تحریر فرمایا:

جزاک اللہ یا ادریس خیراً　　　علیٰ ما صُنتَ اھل الدین خیراً

اس کے ساتھ ایک مکتوب بھی تحریر فرمایا، مکتوب کے آخر میں لکھا:

" رسالہ کا ایک لقب میرے خیال میں آیا، اگر کسی مصلحت کے خلاف نہ ہو آپ کی طرف سے نام رہے، میری طرف سے لقب۔ وہ لقب یہ ہے مجموعہ متن اور شرح کا۔ دَرسُ ادریس لدرس التلبیس " (درس بمعنی مٹانا، اور تلبیس بمعنی اشتباہ)

علّامہ شبیّر احمد عثمانیؒ نے اس قصیدے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

"مولانا موصوف اپنے زمانے کے محدث، مفسر، ادیب، اور متکلم ہیں، ساتھ ہی علم، اور دین کی خدمت کا خاص جذبہ رکھتے ہیں، آپ کی متعدد تصانیف چھوٹی بڑی ملک میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں بھی آپ نے اُس زندیق کی نظم کا نہایت محققانہ جواب نظم میں دیا ہے، پھر تعمیم فائدہ کے لئے اُردو زبان میں اس کی شرح کر دی ہے۔ بہرحال مسئلہ قضا و قدر کے متعلق تمام شبہات کا جواب اور مغلقات کا حل مختصر طور پر اس نظم، اور قصیدے میں موجود ہے۔ طرزِ بیان سادہ، سلیس، اور مؤثر ہے۔ امید ہے ناظرین مستفید اور اہلِ علم محظوظ ہوں گے۔" (۱۰ جمادی الاخری ۱۳۶۶ھ)

"قصیدہ تائیۃ القضاء والقدر" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ وَوُجُودُهُ معارٌ لَهُ من حضرةِ الاحديّةِ	آگاہ ہو جاؤ۔ کہ ہر چیز اپنی ذات سے فانی اور معدوم ہے۔ اور اس کا وجود بارگاہِ خداوندی سے مستعار ہے۔
وما هذه الأكوانُ الّا مظاهرُ لاسمائه الحسنىٰ لدىٰ اهل خبرةِ	اور تمام کائنات حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ علیٰ کے مظہر اور تجلّی گاہ ہیں، اِسی کی تجلّی سے یہ ممکنات عدم سے وجود میں آئے ہیں۔
وانّ وجودَ الممكنات بأسرها كمثل العكوس فى المرايا الصقيلةِ	تمام ممکنات کے وجود کی حقیقت آئینہ کے عکس کی طرح سمجھو۔
وما عالم الامكانِ اِلّا وَاِنّه كظلِّ جدارٍ او سرابٍ بقيعةِ	یہ عالم امکان محض ایک دیوار کے سایہ، یا میدان کے سراب کی مانند ہے۔
هو الله ربُّ الكون لا ربَّ غيرهُ هو الخالق البارى بمحض المشيّةِ	اللہ ہی تمام کائنات کا مربی ہے، اس کے سوا کوئی مربی نہیں اور وہی تمام کائنات

کا خالق اور موجد ہے۔ لہٰذا بندہ کو اپنے
افعال کا خالق کہنا غلط ہے۔

هو الخالق الازواج کالارض والسما — وہی تمام اضداد کا خالق ہے جیسا کہ زمین،
والشمس الضحیٰ واللیلة المدلهمة — آسمان، آفتاب، اور تاریک رات۔

"تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہر خیر و شر اسی کی تقدیر سے ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے"۔
ہر چیز کی حقیقت اس کی ضد سے معلوم ہوتی ہے، ہر چیز کا حسن ضد ہی کی وجہ سے نکھرتا ہے۔ اسی طرح ایمان کا نور، کفر کی ظلمت اور تاریکی کے سامنے ہی چمکے گا۔

اگر رات نہ ہوتی تو دوپہر کے آفتاب کی فضیلت کیسے معلوم ہوتی۔

ایسے ہی اگر کفر نہ ہوتا تو ہدایت کی حقیقت آشکارا نہ ہوتی، اگر اندھاپن نہ ہوتا تو بینائی اور بصارت کی قدر کون جانتا۔!

اگر ابوجہل نہ ہوتا تو لوگ ابوبکر صدیق کو کیسے پہچانتے۔

اسی طرح جبریہ، اور قدریہ، دونوں کے خلاف نقلی اور عقلی دلائل کے ساتھ یہ قصیدہ ختم ہوتا ہے۔

چار پانچ برس پہلے معروف شاعر جوش ملیح آبادی، والد صاحب کے پاس آئے کہنے لگے کہ "مولانا یہ جبر و قدر کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا"؟ والد صاحب نے پوچھا: آپ جبر کے قائل ہیں۔ یا اختیار کے؟ جوش صاحب کہنے لگے: میرا رجحان جبر کی طرف ہے کہ انسان مجبور ہے، ہر چیز پہلے سے اس کے لئے مقدر کر دی گئی ہے، پھر سزا کے کیا معنی؟ والد صاحب نے ان سے کوئی علمی بحث نہیں کی، فرمایا: جوش صاحب اس موضوع پر علماء نے عربی کے علاوہ اردو میں بھی بہت کچھ لکھا ہے آپ اس کا مطالعہ کر لیں، ہو سکتا ہے آپ کو شرحِ صدر ہو، اور آپ کی ذہنی الجھن کا کچھ مداوا ہو جائے، پھر والد صاحب نے یوں ہی سرسری سے انداز میں پوچھا:

آپ جو میرے پاس آئے ہیں، اپنی مرضی اور ارادے سے آئے ہیں یا کسی جبر کے تحت آئے ہیں؟ اس سوال سے غالباً جوش صاحب نے بھی اندازہ لگالیا اور بحث کی راہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور اس موضوع کی طرف نہیں آئے۔

* دہریہ کا رد:

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے سوا جتنی چیزیں ہیں، ان کے مجموعہ کا نام عالَم ہے اور تمام عالم کا خالق اللہ ہے پوری کائنات اور اس کا ہر ذرّہ اللہ کی مخلوق ہے، مخلوق حادث ہے، ازل میں سوائے ذاتِ باری کے کوئی چیز نہ تھی۔ اللہ نے محض اپنی قدرت سے کسی خارجی مدد کے بغیر عالَم کو پیدا کیا۔ اسی پر تمام انبیاء کا اجماع ہے۔

دہریہ، صانعِ عالَم کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ عالَم قدیم ہے، اور وہ فلاسفہ جو صانعِ عالَم کے قائل ہیں، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ صانعِ عالَم بھی قدیم ہے، اور ہیولیٰ بھی قدیم ہے۔ بہر حال عالم کو قدیم ماننے میں دونوں متفق ہیں۔

والدِ محترم نے جہاں اور بہت سے باطل فرقوں، اور نظریات کا رد کیا، وہاں اس نظریے کے رد میں بھی کتابیں، اور رسائل تالیف کئے۔

سب سے پہلے حیدر آباد دکن کے زمانۂ قیام میں (۲۹-۱۹۳۹ء) "حدوثِ مادہ و روح" کے عنوان سے ایک کتاب تالیف کی، "علم الکلام، اور عقائدِ اسلام" میں بھی وجودِ باری، اور حدوثِ عالم پر دلائل ذکر کئے۔

"اثباتِ حدوثِ عالَم و ابطالِ قدامتِ مادہ و روح" کے عنوان سے ایک تحریر وفات سے چند ماہ قبل مرتب کی (جو وفات کے چھ ماہ بعد بحمداللہ طبع ہوگئی ہے) دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

"دل چاہا کہ حدوثِ عالم پر ایک مختصر سی تحریر لکھ دی جائے جس میں

عقلی دلائل سے اس مسئلہ کو واضح کر دیا جائے۔ اور قدیم فلاسفہ کے نظریے کے علاوہ، پیدائش عالم کے بارے میں جدید فلاسفہ کے نظریے کو بھی باطل کر کے دکھایا جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ انبیاء اور مرسلین کے نزدیک جو مسئلہ اجماعی ہے، وہی عقل کے مطابق ہے۔ اور جدید و قدیم فلاسفہ جو کہتے ہیں وہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، اور فلاسفہ جو عالَم کے قدیم ہونے کے مدعی ہیں ان کے پاس قِدَم عالَم کی کوئی دلیل نہیں[1]۔"

قدیم فلاسفہ کا زیادہ زور اس بات پر ہے کہ مادّہ کو قدیم ثابت کیا جائے، ان کا خیال ہے کہ کوئی چیز معدوم اور نیست سے موجود اور ہست نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ہر ایک چیز کسی دوسری موجود چیز سے وجود میں آتی ہے، اور وہ مادّہ ہے۔ کیوں دیکھنے میں آتا ہے کہ اشیائے محسوسہ کی صورتوں میں تغیّر و تبدل ہوتا رہتا ہے، مگر محلِ تغیّر بذاتِ خود غیر متبدل ہے، اور قدیم بھی ہے، اور اس کی حرکت بھی قدیم ہے۔

گویا مادّہ کو قدیم ثابت کرنا، فلاسفہ کے نظریے کی بنیاد ہے، جس پر وہ باقی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ والد محترم نے سب سے پہلے عقلی دلائل سے اس بنیاد کو اکھاڑا ہے۔ مادّہ کے قدیم نہ ہونے، بلکہ حادث ہونے پر دس عقلی دلیلیں پیش کیں۔ لکھتے ہیں:

مادّہ میں کسی طرح بھی قدیم ہونے کی صلاحیت نہیں، اس لئے کہ موجودہ فلاسفہ کی تحقیقات کی بنا پر مادّہ ایک انفعالی قوت کا نام ہے جس کا ظہور صورتِ شخصیہ کے انضمام پر موقوف ہے۔ اور صورتِ شخصیہ ظاہر ہے کہ حادث ہے، پہلے نہ تھی بعد میں پیدا ہوئی، اسی کا نام حادث ہے۔ پس مادّہ جس کا وجود ہنوز بالقوہ ہے اور اس کا ظہور ایک حادث کے انضمام پر موقوف ہے، وہ کیسے قدیم اور ازلی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اتصالِ صورت سے

---

[1] اثباتِ حدوثِ عالم۔ طبع لاہور۔ ص: ۳۰۲

پہلے نہ مادّہ کا وجود تھا، اور نہ صورت کا، اور جب صورت عدم سے نکل کر وجود میں آئی اور مادہ سے اس کا اتصال ہوا تو گویا مادہ کا صورت قبول کرنا یہی اس کا عدم وجود میں آنا ہوا، تو پھر مادہ کیسے قدیم بنا، اور عقلاً یہ امر ناممکن ہے کہ مادّہ بغیر کسی صورت کے موجود ہو سکے، عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ مادّہ قدیم اور ازلی ہو، اور تمام اعراض اور صورتوں سے بالکل خالی ہو۔

پس جب مادّہ کا وجود ہی صورتِ حادثہ کے حدوث پر موقوف ہوا تو لامحالہ مادّہ بھی حادث ہوگا۔ خلاصہ دلیل یہ ہے کہ مادہ کا بغیر کسی صورت پایا جانا عقلاً محال ہے۔ مادہ کا وجود اور ظہور صورت کے وجود پر موقوف ہے اور ظاہر ہے کہ صورت بلاشبہ حادث ہے، لہٰذا جو چیز اپنے وجود میں کسی حادث کے وجود پر موقوف ہوگی وہ بلاشبہ حادث ہوگی پس ثابت ہو گیا کہ مادہ حادث ہے۔" علہ

مادہ کے حادث، اور قدیم نہ ہونے پر یہ صرف ایک دلیل ہے، اسی طرح دس ٹھوس دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ مادہ حادث ہے۔

کتاب کا ایک اہم عنوان: "مذاہبِ امم دربارۂ عالم" اس عنوان کے تحت، عالَم کے بارے میں مختلف مذاہب کا عقیدہ اور نظریہ بیان کیا ہے کہ یہ عالَم کس طرح وجود میں آیا، اور اس کی اصل اور مبدأ کیا ہے۔

پہلے اسلام کا نظریہ بیان کیا ہے، اس کے بعد دہریہ کا، پھر قدیم فلاسفہ کا، جدید فلاسفہ کا، ستارہ پرستوں کا، طبیعین کا، مجوس کا، یہودیوں کا، اور عیسائیوں کا مختلف مذاہب کے نظریات بیان کرنے کے بعد حسب ذیل اہم عنوانات پر اجمال واختصار

علہ ایضاً۔ ص: ۷۷، ۸۰۔

کے ساتھ قرآن کی روشنی میں گفتگو کی ہے:

- سلسلۂ کائنات کی ابتداء
- آخر مخلوقات
- انسان کی پیدائش
- پیدائش عالم کی کیفیت
- عرش، کرسی، لوح و قلم
- کواکب اور نجوم
- آسمانوں کا وجود
- رعد، برق، اور صاعقہ
- بارش

اِن عنوانات کے بعد، قدامتِ مادہ و روح کا باطل ہونا ثابت کیا ہے۔

* فتنۂ انکارِ حدیث کے خلاف جہاد

چودھویں صدی ہجری میں جہاں اور بہت سے فتنے رونما ہوئے، ان میں ایک فتنۂ انکارِ حدیث کا بھی ہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد اس نظریے کے علم بردار بعض لوگوں کو حکومت میں عہدے مل گئے۔ اور انھوں نے اپنے سرکاری اثر و رسوخ کو اپنے باطل عقائد و نظریات کی تلقین و تبلیغ میں پورے طور پر استعمال کیا۔

ان نظریات کو منظم تحریک کی شکل دینے کے لئے کراچی سے ایک رسالہ جاری کیا گیا۔ جب کھلم کھلا اس موضوع پر کتابیں اور رسائل کی اشاعت شروع ہوئی تو علمائے حق بھی اس فتنے کی سرکوبی کے لئے سینہ سپر ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء نے اس موضوع پر اتنی مدلل اور ٹھوس کتابیں تالیف کیں کہ اس طبقے کے لئے علمی محاذ پر مقابلہ ناممکن ہو گیا۔

والد صاحب قبلہ نے بھی متعدد مضامین کے علاوہ "حجیتِ حدیث" کے عنوان سے ایک مستقل کتاب تالیف کی۔ کتاب کے آغاز میں خود مصنف رحمۃ اللہ نے یہ مقصد بیان کیا۔!

"اس وقت جو ایک فتنہ نمودار ہوا ہے، وہ انکارِ حدیث کا فتنہ ہے، منکرینِ حدیث کا گروہ جو "فرقۂ قرآنیہ" کے نام سے موسوم ہے، وہ اس فتنے کا بانی مبانی ہے۔ پہلے بھی یہ فتنہ اُٹھ چکا ہے لیکن اس وقت میں اور پہلے میں یہ فرق ہے کہ پہلے فقط حدیثِ نبوی کے منکر تھے، لیکن اس وقت منکرینِ حدیث، حدیثِ نبوی، صحابہ کرام اور اُمتِ محمدیہ کے چودہ قرون کے محدثین اور مفسرین کے تمسخر اور استہزاء پر تلے ہوئے ہیں، اور ان علمائے ربانیین کی تحمیق وتجہیل اور تحقیر وتذلیل میں ان کا قلم رواں ہے جن کی علمائے اولین وآخرین میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ جس کا دل چاہے امام مالک اور امام بخاری، اور امام مسلم رحہم اللہ کے ساتھ دل کھول کر تمسخر کرے مگر یہ یاد رکھے:

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد | میلش اندر طعنۂ پاکاں زند
علمِ حق با تو مواسا کند | چوں بہ حدت بگذری رسوا کند"

"حجیتِ حدیث" میں گیارہ دلیلیں حدیثِ نبوی کی حجیت پر قرآنِ حکیم سے دی ہیں۔ قرآنِ حکیم کی آیات سے دلائل دینے کے بعد ایک عنوان قائم کیا ہے "منکرینِ حدیث کے امتحان کا طریقہ"، یہ عنوان بہت عجیب ہے۔ دلائل کے بعد یہ ایک طرح کا مناظرہ، بلکہ چیلنج ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ بغیر حدیث نبوی، اور بغیر اقوالِ صحابہ کے

۱۰ے حجیت حدیث۔ طبع لاہور، ۱۳۷۱ھ/، ص: ۱۲ -

قرآن کی تفسیر ممکن ہے تو وہ تفسیر کر کے دکھلائے۔ طریقۂ امتحان یہ ہے کہ کسی عبادت یا معاملے، یا سیاست ملکیہ و مدنیہ کے متعلق آیاتِ قرآنیہ سے چند سوالات مرتب کیے جائیں اور منکرینِ حدیث کو فقط قرآنِ کریم دے کر ایک بند کمرے میں بٹھادو۔ کہ اس سوال کا جواب فقط قرآن سے دو۔ اور کسی حدیث اور کسی صحابی کے قول کا اس میں شائبہ نہ ہو، اور اس کمرے میں سوائے قرآنِ کریم کے، حدیث اور تفسیر کی کوئی کتاب نہ ہو جس سے استفادہ کر کے جواب دے، ورنہ درحقیقت جواب تو ہوگا مفسّرین کا، اور نام ہوگا اِن کا اور دوسرا شخص اسی سوال کا جواب حدیثِ نبوی اور اقوالِ صحابہ کی روشنی میں لکھے، اور پھر دونوں کا موازنہ کیا جائے، انشاء اللہ اس وقت منکرینِ حدیث کی قرآن دانی اور قرآن فہمی کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اور آیت کے صیغے اور اعراب کے متعلق بھی سوال کر لیا جائے تو اور بھی حقیقت واضح ہو جائے گی۔" [1]

یہ چیلنج تو کتاب میں موجود ہے، اور ایک چیلنج والد محترم نے ایک بار جلسہ عام میں دیا۔ اکاڑہ میں چودھری محبوب عالم جنرل سکریٹری مسلم لیگ اکاڑہ کے زیرِ اہتمام عیدگاہ میں ایک بہت بڑا جلسہ تھا۔ والد صاحب قبلہ تقریر کر رہے تھے کسی نے دورانِ تقریر چٹ بھیجی کہ غلام احمد پرویز کراچی سے آئے ہوئے ہیں (اس زمانے میں بسلسلۂ سرکاری ملازمت کراچی میں تھے، یہ غالباً سن ۵۳ یا ۵۴ کا قصہ ہے)۔ وہ جو دعویٰ کرتے ہیں، وہ آپ کو بھی معلوم ہے آپ اُن کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔؟

والد صاحب نے جواب دیا:

حجیتِ حدیث کے موضوع پر ناچیز نے بھی بہت کچھ لکھا ہے، اور موجودہ دور کے دوسرے علمائے کرام بھی اس طرف متوجہ ہیں۔ اور حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ

---

[1] حجیتِ حدیث۔ ص: ۱۴۱۔

وسلم کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں اس وقت صرف یہی عرض کرتا ہوں کہ مجھے قرآن فہمی کا دعویٰ ہے، نہ عربی دانی کا، مجھ سے بہت زیادہ علم و فہم والے حضرات خدا کا شکر ہے اس وقت بھی موجود ہیں۔ پرویز صاحب کو قرآن فہمی کا دعویٰ ہے، یہاں شہر کے کئی ہزار افراد موجود ہیں، میں سب کی موجودگی میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ پرویز صاحب آئیں، وہ ایک بند کمرے میں بیٹھ جائیں، قرآن کا ایک ایسا سادہ نسخہ لے لیں جس کا نہ ترجمہ ہو، نہ اس پر اعراب ہو، بالکل معرّیٰ ہو، وہ ایک رکوع پر اعراب لگائیں، اور تحت اللفظ ترجمہ کریں، میں بھی ایک کمرے میں بند ہو جاتا ہوں، مجھے بھی ایک بالکل سادہ قرآن کا نسخہ دے دیں۔ جس پر نہ اعراب ہو نہ ترجمہ ہو، اس کے علاوہ کسی قسم کی کوئی کتاب نہ ہو، میں بھی ایک رکوع کا لفظی ترجمہ کرتا ہوں۔ وہ دونوں ترجمے عربی کے ماہرین کو دکھائے جائیں اور ان سے رائے لی جائے کہ وہ کیسے ترجمے ہیں، ان میں کونسا صحیح ہے اور کونسا غلط ہے۔" [۱]

والد صاحب قبلہ نے بھرے جلسہ میں یہ اعلان کیا، مگر اس کا کوئی جواب نہ آیا۔

اسی کتاب میں اسی طرح کا ایک اور عنوان باندھا ہے۔ لکھتے ہیں:

"منکرینِ حدیث دینِ اسلام کا نقشہ پیش کریں، اور فقط قرآن سے اپنا جدید علمِ کلام، اور جدید فقہ، اور جدید اصول فقہ و علمِ اخلاق پیش کریں۔ منکرینِ حدیث کو چاہیے کہ فقط قرآنِ کریم سے دینِ اسلام کے عقائد و اعمال، اور حلال و حرام، اور احکامِ معاملات، احکامِ معاشرت، اور احکامِ

---

[۱] ناچیز راقم اس جلسہ میں موجود تھا۔ والد صاحب نے یہاں تک فرمایا کہ پرویز صاحب سے میرا پیغام پہنچا دیں کہ اگر ان کو قرآن فہمی کا دعویٰ ہے تو اس امتحان کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں، میں بھی حاضر ہوں لوگ خود فیصلہ کر لیں گے کہ کون حق پر ہے۔

جہاد، اور احکامِ خراج و جزیہ کا مسلمانوں کے سامنے نقشہ پیش کریں۔ اور پھر اس نقشہ کا علمائے اُمت کے پیش کردہ نقشہ سے موازنہ کیا جائے منکرینِ حدیث اپنا نقشہ فقط قرآن سے مرتب کریں، حدیثِ نبوی، اقوالِ صحابہ و تابعین، اور ائمہ مجتہدین سے کسی قسم کا سرقہ نہ کریں، تب دنیا کو اس گروہ کا مبلغ علم و مبلغ فہم معلوم ہو جائے گا منکرین حدیث علم فقہ میں قدوری، اور اصولِ الشاشی جیسی کتاب لکھ کر دکھائیں تاکہ ان کے علم کا سلف کے علم و فہم سے موازنہ ہو سکے "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک"۔ [1]

حجیت حدیث پر ٹھوس دلائل بیان کرنے کے بعد چند اور عنوانات قائم کئے جو اس موضوع کے لئے بہت ضروری تھے مثلاً: روایتِ حدیث میں صحابہ کرام کی احتیاط۔
حدیثِ نبوی کا سلسلہ روایت اور اس کی صحت و ثقاہت۔
حضراتِ صحابہ کرام کی خصوصیات۔ صحابہ کی دس خصوصیات بیان کیں۔
منکرینِ حدیث، حکیم مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

کو "کلمۃ حق ارید بہا الباطل" کے طور پر استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ ان کے ترجمان مجلہ کی پیشانی پر بھی یہی شعر لکھا ہوا ہوتا۔ والد صاحب نے علامہ مرحوم کے اس شعر پر تضمین کی جو علوم و معارف پر مشتمل ہے اور ہر ہر شعر سے حدیث کے حجت ہونے پر دلائل و شواہد بیان کئے ہیں۔ تضمین فارسی میں ہے۔ پہلا شعر ہے:

بشنو از قرآں چہ می گوید بتو تو ز غیر مصطفیٰ راہے مجو!

ہر شعر کی وضاحت قرآنی آیت سے کی، اس شعر کی وضاحت میں یہ قرآنی آیت پیش کی: وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ۔

---

[1] حجیت حدیث۔ ص: ۴۲۔!

ذاتِ پاکش منبعِ نورِ ھدا　　　کرد قرآں نطقِ او وحیِ خدا

اس شعر کے ذیل میں یہ قرآنی آیات پیش کیں : قد جاء کم من اللہ نورٌ وکتابٌ مبین - اس آیت میں نور سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ وما ینطق عن الھویٰ اِن ھو الا وحی یوحیٰ ۔ ہو کی ضمیر نطقِ رسول کی طرف راجع ہے۔

نطقِ او پاک و منزہ از ہوا　　　شاہد او ہست والنجم ہویٰ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن

ہست لازم مثلِ ایشاں زیستن

قصیدے کے آخر میں ایمان بالرسول کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں :

نیست ایماں نزدِ اربابِ عقول　　　جز بہ تصدیقِ خدا و ہم رسول

چیست ایماں بر نبی مفتوں شدن　　　بر جمالِ شرعِ او مجنوں شدن

چشم بکشا گوش کن سوئے قرآں　　　در وعیدِ منکرِ پیغمبراں !

قصیدے کے اختتامی اشعار دعائیہ ہیں، اللہ کے فضل و کرم، اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی عاجزانہ درخواست ہے۔

فرماتے ہیں :

اے خدائے پاک ربِّ دو جہاں　　　لطف فرما برترا ز وہم و گماں

تو غنیِ مطلقی اے ذوالجلال　　　من فقیرِ مطلقم بے قیل و قال

اے خدائے پاک ربّ ذوالمنن　　　دستگیری کن بایں دورِ فتن

از تو می خواہیم ما قرب و رضا　　　باز ظلِ مصطفےٰ روزِ جزا

لطف فرما اے خدا روزِ عتید　　　رحمتے کن در جزائے ایں نشید

ایں نشید و ایں قصیدم بہرِ تو　　　بہرِ ناموسِ رسولِ پاکِ تو

عارفِ رومی قدس اللہ سرہٗ کے اس شعر پر قصیدہ ختم ہوتا ہے :

ھکذا انعم الیٰ دار السّلام
بالنبی المصطفیٰ خیر الانام

قصیدے کے ستاسی اشعار ہیں۔

حجیتِ حدیث کے علاوہ، ہمیشہ اس موضوع پر مضامین اور تقاریر کا سلسلہ جاری رہا۔ جامعہ اشرفیہ کے بعض سالانہ جلسوں میں جبکہ پنجاب کے اکثر اضلاع کے لوگ جمع ہوتے تھے، آپ نے اس موضوع پر انتہائی مدلّل اور مفصّل تقریریں کیں۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ۱۹۵۴ء کے سالانہ جلسہ میں "والنجم اذا ھویٰ ماضل صاحبکم وماغویٰ وما ینطق عن الھویٰ" کے ضمن میں، حجیتِ حدیث کے موضوع پر معرکۃ الآراء تقریر کی یہ تقریر تین نشستوں میں مکمل ہوئی، اور اوسطاً ساڑھے پانچ گھنٹے ہوئی۔ بعد میں اس تقریر کے کچھ حصّے شائع ہوئے۔

وعظ و ارشاد

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل پاکباز

وعظ وارشاد

کسی تفصیل میں جائے بغیر اگر کسی شخص کی صرف یہ دو صفتیں بیان کر دی جائیں کہ وہ عالمِ دین، اور نائبِ رسول ہے، تو بلاشبہ اس سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی اعزاز اور فخر و مباہات کا کوئی وسیلہ نہیں ہو سکتا۔

درحقیقت کسی مسلمان کے لیے شرعی علوم میں مہارت اور اس پر عمل ایسی نعمتِ کبریٰ ہے

قصیدہ لامیۃ المعراج۔ طبع ملتان۔ ص: ۲۴۔

کہ اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوسکتی۔ قرآنِ حکیم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں آشکارا کیا ہے۔

یؤتی الحکمۃ من یشاء، ومن یؤتَ الحکمۃ فقد اُوتی خیرا کثیرا[1]

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں، حکمت عطا کرتے ہیں، اور جسے حکمت عطا کی گئی اس کو خیر کثیر دی گئی۔

تعمیرِ کعبہ کے وقت ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے تمام دعاؤں کو چھوڑ کر صرف یہ دعا مانگی تھی!

ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم[2]

اے ہمارے پروردگار! ان میں ایسے رسول کو انہی میں سے بھیجئے جو ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے، اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، اور ان کا تزکیہ تطہیر کرے۔

یعنی امت کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ایسا رسول بھیج جو لوگوں کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے تاکہ وہ ہدایت کی طرف آئیں۔

لوگوں کو اپنے فیضِ صحبت کے ذریعے کفر و شرک، اور بے ہودہ رسوم سے پاک وصاف کر دے۔

بنی نوعِ انسان کو کتابِ الٰہی، اور حکمتِ ربانی کی تعلیم دے تاکہ دنیا سے کفر و جہالت کی تاریکیاں چھٹ جائیں۔

انہی آیات کی تائید، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلماتِ حکمت کرتے ہیں۔

من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین۔

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں، اس کو دین کی سمجھ عطا کر دیتے ہیں۔

ایک عابدِ شب زندہ دار کی ریاضتیں، اور شب بیداریاں، یقیناً سراپا رحمت و برکت ہیں۔

---

(۱)۔ سورۂ بقرہ ، آیت :

(۲)۔ سورۂ بقرہ ، آیت

لیکن اس عالمِ دین، اور نائبِ رسول کا مقام جو بھٹکی ہوئی انسانیت کو حق و راستی کی شمعیں دکھاتا ہو، اور کذب و جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں رشد و ہدایت کے دیئے جلاتا ہو، عابد شب زندہ دار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ایک عابد، صرف اپنی ذات کو روشن کرتا ہے، لیکن عالمِ باعمل، اپنی تحریر و تقریر، درس و تدریس اور فیضِ صحبت سے ہزاروں دلوں کو سنوارتا ہے۔

بقول سعدی شیرازی:

صاحب دلے بمدرسہ آمد ز خانقاہ　　بشکست عہدِ صحبتِ اہلِ طریق را

گفتم میانِ عالم و عابد چہ فرق بود　　تا اختیار کردی ازاں ایں فریق را

گفتم آں گلیم خویش بروں می برد ز　　ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

عارفِ شیرازی نے عالم و عابد کے فرق کو کس خوب صورتی سے نمایاں کیا ہے کہ عابد صرف اپنی کملی بچانے کی فکر میں رہتا ہے، لیکن عالم، ڈوبتوں کو سہارا دیتا، اور انھیں بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

بلاشبہ والد محترم نے نصف صدی تک تقریر، تحریر، وعظ، درس و تدریس، اور نجی مجالس کے ذریعے امتِ مسلمہ کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا ہے، کلامِ الٰہی، اور حدیث نبوی کی روشنی سے ہزاروں بندگانِ خدا کے دلوں کی دنیا منور اور تاباں کی ہے۔ خلوص، اور للہیت میں ڈوبی ہوئی تقریروں نے لاکھوں دلوں کی دنیا میں انقلاب بپا کیا ہے۔

میں اگر یہ کہوں تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا کہ موجودہ صدی میں، پنجاب بلکہ برصغیر کے عظیم تاریخی اور ثقافتی شہر لاہور میں تبلیغ و اشاعتِ دین کی جتنی خدمت حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ نے کی وہ کسی اور کا حصہ نہ بن سکی، پنجاب اور بالخصوص لاہور کے مسلمانوں میں جن غلط عقائد، اعمال اور رسوم نے رواج پا لیا تھا، اس کے خلاف حضرتِ لاہوری کا جہاد تمام علمائے دیوبند کے لئے باعثِ فخر ہے، حضرت لاہوری کے بعد یہ سعادت، اللہ جل شانہ، نے حضرت مفتی محمد حسنؒ اور والدِ محترم کو عطا کی۔

والد صاحب، بھاول پور سے اگست ۱۹۵۱ء میں لاہور تشریف لائے۔ اسی وقت سے جامع مسجد نیلہ گنبد میں دعوت وارشاد کے سلسلے آغاز ہوا، ۱۹۶۱ء تک حضرت مفتی صاحب بقیدِ حیات رہے دونوں حضرات کا یہ معمول رہا کہ کسی جمعہ کو مفتی صاحب تقریر فرماتے اور کسی جمعہ کو والد صاحب، مفتی صاحب کا وعظ ہوتا تو والد صاحب ساتھ جاتے اور شروع سے آخر تک سنتے، اور اسی طرح والد صاحب تقریر کرتے تو مفتی صاحب سنتے، مجھے یاد نہیں کہ جب تک مفتی صاحب حیات رہے سوائے خاص مجبوری اور عذر کے کبھی ایسا ہوا ہو کہ دونوں حضرات نے مسجد نیلہ گنبد اکھٹے نمازِ جمعہ ادا نہ کی ہو۔

آج کے دور میں جب ہمارے اکثر ائمہ اور خطباء نے مساجد کے وعظ و تقریر کو اپنا بنیادی حق سمجھ لیا ہے، اور ان کی طبعِ انا پسند کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ان کی موجودگی میں کوئی اور تقریر کرے، ان دونوں حضرات کا عمل نہ صرف یہ کہ روشنی کا مینار ہے بلکہ اس میں بہت کچھ سامانِ فکر و موعظت بھی ہے [۱]، بات صرف وہی ہے کہ اِن حضرات کا مقصد لوگوں تک اللہ کا، اور اللہ کے پیارے رسولؐ کا پیغام پہنچانا تھا، ان کو کوئی دھن تھی تو صرف یہ کہ کلمہ حق بندگانِ خدا تک پہنچ جائے، اپنی زبان سے پہنچے، کسی اور کی زبان سے پہنچے۔ حق بات بہر صورت لوگوں کے کانوں میں پڑتی رہے۔ اپنی ذات اور اپنی شخصیت کو اُبھارنا، ان کا مطمعِ نظر نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جو بات ان کی زبان سے نکلتی اثر رکھتی تھی۔

والد صاحب کی تقاریر، اور مواعظ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عام طور پر افراد کا نام لے کر بات نہیں کرتے تھے، قادیانیوں کا رد کرتے تو ان کے مسلمہ نظریات و عقائد کا حوالہ دے کر ان کا رد کرتے، اسی طرح منکرینِ حدیث کا رد کرتے وقت افراد کا نام لینے سے گریز کرتے؛ اگر کبھی کسی کا نام لیتے بھی تو کبھی توہین آمیز انداز اختیار نہ کرتے، مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ سیالکوٹ میں قادیانیوں کے خلاف تقریر فرما رہے تھے، شہر کے بیشتر علماء بھی موجود تھے دورانِ تقریر مرزا غلام احمد قادیانی کو دو ایک بار "مرزا صاحب" کہا، سامعین میں بڑا جوش و خروش

تھا۔ایک صاحب نے اعتراض کیاکہ : حضرت! آپ ایک جھوٹے مدّعیِ نبوت کو، جس کا بر ملا رد کر رہے ہیں، مرزا صاحب کے لفظ سے کیوں خطاب کر رہے ہیں ؟ ۔اس سوال سے مجمع پر سنّاٹا چھاگیا کہ دیکھئے مولانا کیا جواب دیتے ہیں ۔ او الد صاحب نے فرمایا: آپ نے اچّھا سوال کیا، یہ اسلوب بظاہر ادب کا اسلوب معلوم ہوتا ہے، مگر درحقیقت اِس میں گہرا طنز ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ اللہ جل شانہٗ ابوجہل کو مخاطب کر کے فرمائیں گے ؛ ذُقۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡکَرِیۡمُ " قرآن کا ابوجہل کو "عزیز وکریم" کہنا سراپا طنز ہے کہ آپ تو اپنی قوم، اور قبیلے میں بڑے رتبے والے اور بڑے شان و شوکت والے تھے، مگر اب کیا ہوا ۔ ؟ اب ذرا دوزخ کا عذاب چکھو، یہی تمھارا مقدر ہے، دنیا میں تمھارا رتبہ، اور غلبہ تمھیں عذاب سے نہیں بچا سکے گا ۔

اس برجستہ جواب سے تمام اہلِ علم بہت محظوظ ہوئے، مولانا محمد علی الصدیقی[۱] ناچیز راقم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے فرمانے لگے !

" ہمارے ذہن نے قطعاً اس جواب کی طرف رسائی نہیں کی تھی "۔

---

(۱)۔ مولانا محمد علی الصدیقی ۔صدر دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ ۔

جامع مسجد نیلہ گنبد۔ مواعظ۔ تقاریر

۱۹۶۱ء میں حضرت مفتی صاحب لاہور میں دعوت وارشاد کی تمام تر ذمہ داری والد صاحب کے کاندھوں پر ڈال کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ مفتی صاحب کی وفات (جون ۱۹۶۱ء) سے لے کر ۱۹۷۱ء کے آخر تک نیلہ گنبد میں تقاریر و مواعظ کے لئے ہر جمعہ کو والد صاحب تشریف لے جاتے رہے؛ دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ بنگال کا سانحہ پیش آیا، اُن دنوں کچھ تو پہلے ہی سے طبیعت کمزور ہو گئی تھی اور نیلہ گنبد کبھی کبھی جانا چھوٹنے لگا تھا، مگر اس حادثے نے انھیں بہت ہی مضمحل اور دل برداشتہ کر دیا۔ احباب، نیلہ گنبد اور انار کلی سے آتے، چلنے کے لئے اصرار کرتے مگر یہی فرماتے کہ: بھئی! اب ہمت جواب دے گئی، جب احباب کا تقاضا بہت بڑھتا تو پھر کسی کسی جمعہ کو تشریف لے جاتے۔

مختلف مواعظ میں اہلِ بنگال کا شکوہ کیا، اور ایک روز تو سب نے دیکھا کہ بنگال کا ذکر کرتے کرتے والد مرحوم بہت جذباتی ہو گئے۔ حالانکہ تقریر و وعظ تو درکنار، نجی مجالس میں بھی ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی فرد کا نام لے کر بطورِ خاص اسے تنقید کا نشانہ بنایا ہو۔ عام طور پر بات کا انداز عمومی ہوتا، ذاتیات سے بحث نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ رد کرتے وقت بھی افراد کا نام لینے سے گریز کرتے، صرف غلط نظریات و اصول کا رد کرتے، مگر اس روز تو عالم یہ تھا کہ جیسے ایک بھٹی ہے جو دہکنے کے لئے بے قرار ہے، ایک لاوا ہے جو پھوٹ پڑنے کے لئے مضطرب ہے، بنگال کے ذکر تک پہنچے تو فرمانے لگے: میرے عزیز بھائیو، سن لو! بنگال میں بہاری، اور پنجابی مسلمانوں پر جو ظلم ہوا ہے ان کا خون انشاءاللہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ جو درندہ صفت، دشمنانِ اسلام کے آلۂ کار بن کر

ناحق مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہے ہیں، قدرت ضرور ان سے انتقام لے گی،

فرمایا: جو لوگ شیطان کا مشن پورا کر رہے ہیں، وہ مجیب الرحمان نہیں مجیب الشیطان ہیں۔

ایک مجلس میں یحییٰ خان کی غداری کا ذکر آگیا تو فرمانے لگے: میں علامہ اقبال کے ایک شعر میں ترمیم کر کے یوں کہتا ہوں:۔

جعفر از بنگال و صادق در دکن
خانِ یحییٰ را ببیں در ایں زمن

پھر فرمایا۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کے ملک کو دو پارہ کیا، ان کی عزت و عظمت کو مجروح کیا؛ میں ان کی ہلاکت و بربادی کی دعا نہیں کرتا، بلکہ یہ کہتا ہوں کہ خدایا! تو ان کو طویل عمریں عطا فرما، اور یہ خود، اور ساری دنیا، ان کی ذلت و رسوائی کا منظر دیکھے۔

بہر حال نیلہ گنبد میں آپ کے وعظ و ارشاد کی مدت کم و بیش بیس بائیس پر پھیلی ہوئی ہے۔ نیلہ گنبد کے مواعظ اور تقاریر نے تبلیغ دین، اور دعوتِ حق کا کتنا بڑا فریضہ ادا کیا، یہ تو وہ ہزاروں اور لاکھوں فرزندان توحید بخوبی سمجھتے ہیں جو برسوں نیلہ گنبد آتے رہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ نہ صرف لاہور کے دور و دراز علاقوں سے لوگ جمعہ کی تقریر سننے آتے بلکہ شیخوپورہ، گوجرانوالہ، اور گکھڑ منڈی تک سے بعض حضرات محض آپ کی تقریر کی خاطر نیلہ گنبد آکر جمعہ پڑھتے۔

ہمارے ہاں عام طور پر جمعہ کی تقاریر زیادہ علمی نہیں ہوتیں خاص جلسوں، اور خاص مواقع پر ہونے والی تقریروں میں تو مقرر حضرات محنت کرتے ہیں، لیکن جمعہ کی تقریر "معمول کا کام" سمجھ کر کر دیتے ہیں۔ لیکن والد صاحب جمعہ کی تقریر کو بھی بہت اہمیت دیتے، جمعہ کے روز باقاعدہ مطالعہ فرماتے، اور اس کے بعد تقریر کے لئے تشریف لے جاتے۔ کوئی کہتا: حضرت! آپ کو مطالعہ کی کیا ضرورت ہے۔! تو فرماتے، کہ مطالعہ کی ضرورت ہر شخص کو ہے اور ہر وقت ہے۔ بغیر مطالعے کے تقریر کرنا کوئی کمال کی بات نہیں، میں کبھی دیکھے

بھائے بغیر کوئی وعظ یا تقریر نہیں کرتا، اور جو مضمون بیان کرنا ہوتا ہے، اُسے پہلے سے مرلوط کر لیتا ہوں " اکثر فرماتے : نیلہ گنبد کی تقریر جلسوں کی تقریر سے زیادہ اہم ہے، یہاں سب پڑھے لکھے لوگ آتے ہیں، کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کا اچھا خاصا مجمع ہوتا ہے۔ انارکلی اور نیلہ گنبد کی تمام آبادی پڑھی لکھی، اور باشعور ہے، مجھے ان کی علمی اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر بات کہنی ہوتی ہے " یہی وجہ ہے کہ نیلہ گنبد کی اکثر تقریروں میں اتنے دقیق علمی مضامین بیان کئے جو عام طور پر کتابوں میں بھی بیان نہیں کئے جاتے۔ الحمدللہ ایسی بے شمار تقریریں محفوظ ہیں، جن کی جمع وتدوین، اور اشاعت کی کوشش کی جارہی ہے۔

چند یادگار، اور معرکۃ الآراء تقاریر کے اقتباسات پیش کرتا ہوں، ان سے اندازہ ہوگا کہ نیلہ گنبد کی تقریریں کس درجہ عالمانہ، اور حقائق سے پُر ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ عقل، اس کی تعریف، فضیلت، اور اقسام پر تقریر کی، بیان اتنا طویل ہوا کہ چار جمعہ تک جاری رہا۔ عقل کی حقیقت سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں :

" اب اس کی حقیقت بھی سمجھ لیجئے کہ عقل کیا چیز ہے ؟ علماء نے اس کی حقیقت میں کلام کیا ہے۔ ایک گروہ نے تو یہ کہا ہے کہ اس کی حقیقت معلوم نہیں۔ لیکن جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اس کی حقیقت معلوم ہے۔ چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ عقل جوہر لطیف ہے۔ یعنی ایک امر جوہری ہے جو قائم بذاتہ ہے۔ یہ ایک اصطلاح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک " امر " عرضی ہوتا ہے ایک " امر " جوہری۔ امر عرضی اس کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کے ساتھ پایا جائے، جیسے سیاہی اور سفیدی کہ مثلاً کپڑے وغیرہ میں ہوتی ہے اور امر جوہری وہ ہے جو خود اپنے وجود میں مستقل ہو، یعنی اپنے قیام اور وجود میں کسی کا محتاج نہ ہو، پس عقل کی ایک تعریف تو یہ کی گئی ہے کہ عقل ایک جوہر نورانی ہے، جس سے حقائق کا ادراک اور حق وباطل کا فرق معلوم ہوتا ہے اور کسی نے کہا کہ عقل ایک قوت واستعداد کا نام ہے۔ جس سے ادراک ہوتا ہے۔ ایک تعریف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو حواس خمسہ ظاہری پیدا فرمائے ہیں۔ ان

میں سے سر کی آنکھیں ظاہری اشیاء کو دیکھنے کے لئے پیدا کی ہیں اور ایک آنکھ اللہ تعالیٰ نے دل میں پیدا کی ہے۔ جس سے حق و باطل کا فرق معلوم ہوتا ہے اور اسی دل کی آنکھ کو عقل کی آنکھ کہتے ہیں، جس سے حق و باطل کی رنگتوں کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح آنکھ اگر رنگتوں کے فرق کا صحیح صحیح ادراک کرتی ہے تو وہ تندرست آنکھ ہے، ورنہ وہ آنکھ بیمار ہے۔ اسی طرح عقل اگر حق و باطل کے فرق کو صحیح صحیح سمجھ رہی ہے تو تندرست ورنہ وہ عقل بیمار ہے، اگر آنکھ سے ایک کے دو دکھائی دینے لگیں، تو اس کو بھینگا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر دل کی آنکھ سے کسی کو ایک اسلام کے دو اسلام اور ایک رسول کے دو رسول اور ایک قرآن کے دو قرآن نظر آنے لگیں تو سمجھ لو اس کے دل کی آنکھ بھینگی ہو چکی ہے، اگر بینائی درست ہو تو ایک نظر آنے لگے۔"

عقل کی فضیلت اور برتری پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عقل کی فضیلت اور برتری تمام کائنات میں مسلّم ہے۔ چنانچہ اس عقل کی بدولت تمام چیزیں انسان کے تصرف میں ہیں۔ ایک ذرا سے ڈنڈے سے پورے گلّہ کو آگے کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گائے، بھینسیں وغیرہ نہ انسان کی جسامت اور ڈیل ڈول سے ڈر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود اس سے کہیں زیادہ جسیم ہیں، اور نہ ان کو اس کے گز بھر کے ڈنڈے کا خوف ہے، کیونکہ بڑے بڑے درخت وغیرہ ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ مگر وہ کبھی کسی سے نہیں ڈرتے، معلوم ہوا کہ وہ انسان کی عقل سے ڈرتے ہیں اور اسی لئے مطیع ہیں۔ جیسے کوئی بادشاہ ہو۔ اور اپنے غلاموں سے پردے میں بیٹھا ہو کہ وہ اس کو نہ دیکھ رہے ہوں، مگر بادشاہ ان کو دیکھ رہا ہو۔ اب اگرچہ بادشاہ ان کے سامنے نہیں، مگر کبھی کبھی تصور اس کا بندھ جاتا ہے اور اس کا رعب اور ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عقل ہے کہ دکھائی نہیں دیتی مگر اس کا تصرف سب پر چل رہا ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عقل منبع ہے، علوم اور ادراکات کا، منبع کے معنی سرچشمہ کے ہیں یعنی جس طرح چشمہ سے اہلِ حاجت سیراب ہوتے ہیں اسی طرح عقل ہے کہ اس سے انسان علوم و کمالات کا حصول کرتا ہے اور عقل مطلع ہے انوار و برکات کا۔ مطلع اُفقِ مشرق کو کہتے ہیں۔ جس

طرح اُفق سے آفتاب طلوع ہوتا ہے اور عالم کو منور کرتا ہے اسی طرح عقل بھی انوار و برکات کا اُفق ہے اور عقل اساس العلوم ہے۔ یعنی علوم کی بنیاد ہے۔ اگر عقل نہیں، تو نہ دنیا کی عمارت بنتی ہے، نہ آخرت کی۔"

عقل اور نفس کا باہمی فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اب ایک اور پہلو پر غور کیجئے۔ یہ کہ خدا تعالیٰ کا قضا و قدر کا کارخانہ عجیب و غریب ہے اور اس کی کنہ اور حقیقت کو سمجھنا محال ہے۔ خدا تعالیٰ نے عقل کے ساتھ ایک اس کا دشمن بھی پیدا فرمایا ہے اور وہ ہے نفس۔ جو کہ انسان کو رزیل اور کمینہ باتوں کی طرف رغبت دلاتا ہے اور گناہوں پر اور لذات پر ابھارتا ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھو کہ جسم انسانی ایک شہر ہے، بس جس طرح شہر میں ایک بادشاہ ہو اور ایک اس کی مجلس وزراء و امراء ہو۔ اور دوسری طرف کچھ اس کے مخالف اور باغی لوگ بھی ہوں۔ سو جسم انسانی میں عقل بمنزلہ بادشاہ کے ہے۔ اور فکر و خیال و قوت اور ہمت بمنزلہ وزراء کے ہیں اور اعضاء و جوارح بمنزلہ رعایا کے اور نفس باغی ہے، جو بادشاہ (عقل) کے مقابلہ پر تلا ہوا ہے اور جوارح کو حرکات رذیلہ اور افعال کمینہ پر آمادہ کرتا ہے۔ سو اگر عقل نے تدبیر سے کام لیا نفس کو قید کر کے ڈال دیا کہ اس کے تمام قویٰ کو بے کار کر دیا۔ تو امن رہے گا ورنہ فساد۔ اب نفس مختلف قسم کے ہیں۔ کسی کا نفس تو پھانسی دیدینے کے قابل ہے اور کسی کا اس قابل ہے کہ اس کو قید و بند میں رکھا جائے اور بعض زجر و توبیخ سے بھی ٹھیک رہ سکتے ہیں۔ غرض یہ بادشاہ کا کام ہے کہ وہ مناسب حال سزا تجویز کرے۔ جیسے بادشاہ کے لئے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ باغیوں اور مفسدوں کی کڑی نگرانی رکھے کہ کوئی سر نہ اُٹھا سکے، اسی طرح عقل کا بھی سب سے بڑا کام یہ ہے کہ نفس کی نگرانی کرے اور اس کو ڈھیل نہ دے کہ وہ اس کے خلاف کوئی سازش نہ کرے اور رعایا کو بغاوت پر آمادہ نہ کر سکے۔"

اہلِ علم و دانش کے نزدیک یہ بات بحث و تمحیص کا موضوع رہی کہ عقل کا منصب اور مقام کیا ہے۔؟ اس حقیقت کو اتنے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ گویا سمندر کو کوزے میں

بند کر دیا، اور بات بھی واضح ہو گئی۔ فرماتے ہیں :۔

"عقل، عالِم ہے، حاکم نہیں، مطلب اس کا یہ ہے کہ عقل کا کام یہ ہے کہ جو احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے آئیں اُن کو سمجھے، اور ان کا ادراک کرے، اور پھر اُن احکام کی پیروی کرے۔ عقل کا یہ منصب نہیں کہ وہ یہ حکم کرے کہ فلاں کام کرو، فلاں مت کرو۔ حکم دینا عقل کا مقام و منصب نہیں۔ بلکہ حکم کی تعمیل کرنا اس کا منصب ہے۔"

۲، ستمبر ۱۹۵۹ء کو قائدِ اعظم سوسائٹی کے زیرِ اہتمام میلاد النبی کے سلسلے میں وائی، ایم سی ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا، آپ نے معنیٰ نبوت و رسالت کی تحقیق میں ایسی پُرمغز تقریر کی کہ پورا مجمع عش عش کر اٹھا، سب سے پہلے اس حقیقت کو واضح کیا کہ انسانیت کو نبوّت و رسالت کی کیوں ضرورت ہے۔؟ فرماتے ہیں :

" انبیائے کرام کا مبعوث ہونا اہلِ جہاں کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمتِ کبریٰ ہے۔ اگر ان حضرات کا واسطہ اور ذریعہ نہ ہوتا تو ہم بے سمجھوں کو اس واجب الوجود کے وجود، اور اس کی وحدت کی طرف کون ہدایت کرتا، اس کے اوامر، نواہی، مرضیات، اور نامرضیات میں تمیز کرنا کون بتاتا۔ ہمارے مبداء و معاد سے، اور دنیا و آخرت کے احکام سے کون آگاہ کرتا، یونان کے حکماء، اور فلاسفہ باوجود علم، کمالِ فہم، فراست اور کمالِ دانائی کے، صانعِ عالَم کے وجود کی طرف ہدایت نہ پا سکے، اور کائنات کے وجود کو دہر یعنی زمانے کی طرف منسوب کر بیٹھے۔

وما یہلکنا الا الدھر — اور ہم کو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔

لیکن جب حضراتِ انبیاء کے دلائل و براہین آفتاب کی طرح جلوہ گر ہوئے تو متاخرین فلاسفہ طوعاً و کرہاً وجودِ صانع کے قائل ہوئے۔"

لا اقسم بھذا البلد وانت حِلٌّ بھذا البلد ووالدٍ وما ولد لقد خلقنا الانسان فی کبد(۱) اس آیت کریمہ پر وعظ فرمایا، دو جمعہ تک بیان ہوا، عجیب و غریب حقائق بیان کئے، آیت کے اس جزء "لقد خلقنا الانسان فی کبد" کہ بلاشبہ ہم نے انسان

کو مشقت میں پیدا کیا، پر انسانی مشقت اور کلفت و مصیبت کا عجیب نقشہ کھینچا، فرماتے ہیں:

"انسان پیدا بھی مشقت سے ہوا، ڈیڑھ دو برس بے اختیار مردوں کی طرح جھولے میں پڑا رہا۔ یہ بھی مشقت ہوئی، کچھ بڑا ہوا تو ماں باپ نے پڑھنے بٹھا دیا، وہاں مار پیٹ شروع ہو گئی، یہ زمانہ بھی تکلیف میں گزرا، پھر تعلیم سے فارغ ہوا، روزگار کی تلاش ہوئی، نوکری ملی، اس میں بھی مشقت اٹھائی، اس کے بعد شادی ہوئی، لوگوں کا تو خیال ہے کہ شادی مسرتوں اور راحتوں کا سرچشمہ ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تو سراسر مشقت کا باعث ہے، گھر کی فکر، بچوں کے خرچ کی فکر، ہر وقت بیوی کی ناز برداریاں کرتے رہو، کچھ بھی کر و لا کر اس کو دیتے رہو۔"

اسی ضمن میں حضرت علی کا ایک مکالمہ نقل کیا جو دلچسپ و عجیب بھی ہے، اور عبرت آموز بھی، فرماتے ہیں:

"حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ نکاح کی حقیقت بیان کیجئے۔ آپ نے فرمایا: لزوم مہر، یعنی سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مہر لازم ہو جاتا ہے، سوال کرنے والے نے پوچھا۔ ثم ماذا؟ پھر کیا ہوتا ہے۔؟ آپ نے جواب دیا: سرور شہر، ایک مہینے یعنی چند روز کی خوشی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس نے پھر سوال کیا۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔؟ آپ نے فرمایا: ہموم دہر، زندگی بھر کا غم پیچھے لگ جاتا ہے، واقعی یہ ایسا غم ہے جس سے انسان کو چھٹکارا نہیں ملتا، پرانے قسم کے لوگوں کو تو کچھ کم غم ہوتا تھا، مگر آج کل کے مہذب اور متمدن لوگوں کو تو بہت ہی سخت غم ہوتا ہے، کما کما کر سارا بیگم صاحبہ کو دے دو، اور اوپر سے نخرے اٹھاؤ، ان کے رحم و کرم پر پڑے رہو، جو دیدیا خرچ کر لیا، ان سے بڑھ کر ہموم دہر کا مصداق اور کون ہو سکتا ہے! غرض یہ کہ شادی کے بعد انسان مشقت میں گرفتار ہو جاتا ہے، سائل اس کے بعد بھی باز نہ آیا: پھر پوچھا حضرت! اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔؟ فرمایا: کسور ظہر، کمر ٹوٹ جاتی ہے ۔ واقعی مشقتیں جھیلتے جھیلتے کمر ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد سائل نے آپ سے سوال نہیں کیا، مگر

میرا خیال ہے کہ اگر سوال کرتا تو یہ جواب ملتا: نزول قبر۔ یعنی اس کے بعد انسان قبر میں اُتر جائے گا تو یہ ہے انسان کی شادی، اور اس کا انجام"۔

۹، ۱۰، ۱۱ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ / ۱۱، ۱۲، ۱۳۔ اگست ۱۹۶۲ء کو لاہور میں عظیم الشان سیرت کانفرنس منعقد ہوئی، کانفرنس کے ایک اجلاس میں والد محترم نے "نبوت کبریٰ و رسالت عظمٰی" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ مقالہ مختصر ہونے کے باوجود انتہائی ٹھوس اور جامع ہے اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت، دین و دنیا، شریعت وحکومت، دونوں کی جامع ہے۔ لیکن شریعت اصل ہے اور ریاست وحکومت، شریعت کی خادم، اور تابع ہے۔

دوسری تمام آسمانی شریعتوں پر، اسلامی شریعت کی جامعیت، اور برتری بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شریعت اسلامیہ نے اگر ایک طرف اعتقادات اور عبادات اور مکارم اخلاق کو علیٰ وجہ الکمال والتمام بیان کیا تو دوسری طرف معاملاتِ تجارت کے احکام اور معاشرے اور تمدن کے حقوق وآداب، اور حکمرانی و عدلِ عمرانی، اور ممالک کے نظم و نسق کو درست رکھنے کے لئے ایسے قواعد کلیہ اور اصول وضوابط بتائے کہ جن کی روشنی میں چل کر خلفائے راشدین نے باوجود بے سروسامانی کے آدھی دنیا کے دو حکمرانوں قیصر وکسریٰ کو بیک وقت زیر کیا۔ اور کسی دوسری حکومت کی مدد، اور تعاون کے بغیر ان کا تختہ اُلٹا"۔

دینِ اسلام نے جس طرح اعتقادیات کو مدلل و مبرہن کیا، مکارمِ اخلاق اور محاسنِ اعمال کی تعلیم دی، اسی طرح معاملات دنیویہ۔ بیع وشراء، ہبہ، اجارہ رہن، وکالت، شہادت، میراث، وصیت، وقف وقضاء، اور عدالت کے احکام واصول اور قواعدِ کلیہ وضع کر کے دنیا کی راہنمائی کی۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دستور مکمل ہے، ابدی ہے، اور پوری نوعِ

انسانی کے لئے کامل ضابطۂ حیات ہے، اس حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قانونِ اسلام غایت درجہ مکمل ہے، اور ابدی ہے، جس میں قیامت تک کے وقتی تقاضوں کی پوری گنجائش موجود ہے۔ بشرطیکہ وہ تقاضے عقل سلیم اور فطرتِ صحیحہ کے مطابق ہوں، نفسانی اور شہوانی خواہشات پر مبنی نہ ہوں۔ شریعت مطہرہ میں ناپاک تقاضوں کی کوئی گنجائش نہیں شریعت مطہرہ ومعطرہ بمنزلہ عطر اور گلاب کے ہے، اور نفسانی تقاضے نجاست کی طرح ہیں۔ ظاہر ہے کہ گلاب کی صراحی میں پیشاب کے ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں۔"

یہ اقتباسات، والد مرحوم کی چند تقاریر سے ماخوذ ہیں۔ ایسی ہی علم وحکمت، اور عجیب وغریب مضامین سے بھری ہوئی بے شمار تقریریں محفوظ ہیں، انشاء اللہ مستقبل قریب میں ان کے علمی، تصنیفی، تبلیغی کام کا مکمل جائزہ مرتب کیا جائے گا تو اس علمی ذخیرے کو ہدیۂ قارئین کیا جائے گا۔

"اُن کی باتوں میں گُلوں کی خوش بُو"

مجلسی گفتگو:

والد صاحب سے ملنے ملانے زیادہ تر اہلِ علم ہی آتے تھے، ان سے علمی گفتگو ہوئی، جو شخص جس موضوع کا ہوتا اس سے زیادہ تر اسی موضوع پر بات چیت کرتے۔ اور پھر جس کی جو علمی سطح ہوتی، اسی کے مطابق بات کرتے۔ مفتی محمد شفیع صاحب تشریف لاتے تو قرآن کے اسرار و حکم زیرِ بحث رہتے، مولانا یوسف بنوری تشریف لاتے تو علامہ انور شاہ کاشمیری کی دورانِ درس بیان کردہ تحقیقات کا ذکر ہوتا، اور عجیب و غریب حدیثی نکات بیان ہوتے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی آجاتے تو محی الدین ابنِ عربی اور مثنوی مولانائے روم کے اسرار و رموز پر بحث ہوتی۔ مولانا محمد علی الصدیقی آتے تو امام ابو حنیفہ اور ان کی فقہ کے خصائص پر کلام ہوتا۔ بہرحال عام طور پر مجلس میں علمی باتیں ہوتیں۔ ناچیز راقم جن مجلسوں میں شریک ہوتا، اور بعد میں گفتگو کا جو خلاصہ اور ماحصل ذہن میں رہ جاتا، وہ لکھ لیتا۔ افسوس بہت کم مجلسوں کی علمی گفتگو کے خلاصے کاغذات کے سینے میں محفوظ کر سکا ہوں، چند مجالس کی علمی گفتگو قارئین کی نظر ہے۔

ایک مرتبہ نماز کی حکمتیں بیان فرما رہے تھے۔ فرمایا کہ:

"قرآنِ حکیم میں ہے۔ "الم تر ان اللہ یسبح لہ من فی السموات والارض" اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف انسان ہی نہیں، کائنات کی ہر چیز خدا کی عبادت میں مصروف ہے، کس کی عبادت کس نوعیت کی ہے؟ یہ خود اسی کو معلوم

ہے۔ چنانچہ اس سے آگے ہے "کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ، خدا خود تمام مخلوق کی عبادت کی خبر دیر ہے ہیں؛ اب دیکھنا یہ ہے کہ کونسی مخلوق کیسی عبادت میں مشغول ہے۔ تو غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اشجار کی عبادت، بحالت قیام ہے، بہائم اور چوپائے رکوع کی حالت میں ہیں۔ تمام حشرات الارض سر بسجود ہیں، پہاڑوں کی عبادت قعود کے ذریعے ہے، مطلب یہ ہوا کہ ساری مخلوق کی عبادت ان چار طریقوں میں منحصر ہے انسان کیوں کہ اشرف المخلوقات بھی ہے، اور ساری کائنات کا خلاصہ، نچوڑ اور لب لباب بھی ہے، اس لیے اس کے لیے جو عبادت یعنی نماز مقرر کی گئی، وہ بھی تمام مخلوقات کی عبادت کا خلاصہ اور نچوڑ ہے نماز میں چاروں طریقے جمع کر دیے گئے۔"

اس کے علاوہ ایک اور حکمت بیان فرمائی۔ فرمایا:

"جب آدمی کسی کی تعظیم کرتا ہے تو اس کے تین رتبے ہوتے ہیں۔ سب سے ادنیٰ مرتبہ تو یہ ہے کہ آدمی کھڑا ہو جائے، اوسط رتبہ یہ ہے کہ جھک جائے اور سب سے اعلیٰ رتبہ یہ ہے کہ سر بسجود ہو جائے۔ نماز میں اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں طریقے جمع کر دیئے ہیں، آخر میں قعدہ ہے، التحیات کے لیے بیٹھتے ہیں، یہ تعظیم کی تینوں حالتوں کا تتمہ اور تکملہ ہے، اور التحیات میں تین حقوق جمع ہیں، اللہ کا، اللہ کے رسول کا، اور عام مسلمانوں کا، اور آخر میں دعا رہے ہے۔"

بات خاصی طویل ہو گئی حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری کے حوالے سے کئی نکات نقل فرمائے وہ ناچیز کو یاد نہیں رہے، آخر میں سلام کے متعلق، کہ نماز کا اختتام دو سلاموں سے کیوں ہوتا ہے، شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے حوالہ سے اس کی یہ حکمت بیان فرمائی کہ:

"شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ نماز کے اختتام پہ دو سلام رکھنے کی وجہ یہ معلوم

ہوتی ہے کہ جب آدمی نماز میں داخل ہوا تو دنیا سے بے تعلق ہو کر خدا کی بارگاہ میں پہنچ گیا، اور جب نماز سے فارغ ہو رہا ہے تو گویا خدا کی بارگاہ میں حاضری دے کر پھر دنیا میں لوٹ رہا ہے، تو ایک سلام بارگاہِ خداوندی کے لئے ہوا کہ وہاں سے رخصت ہو رہا ہے، اور دوسرا سلام اہلِ دنیا کیلئے ہوا کہ دنیا میں داخل ہو رہا ہے "۔

سردار عبدالرب نشتر مرحوم، پنجاب کے گورنر تھے انھوں نے والد صاحب قبلہ اور مفتی محمد حسن صاحب کو (گورنر ہاؤس میں) مدعو کیا۔ کم و بیش ایک گھنٹہ کی مجلس رہی سردار صاحب مرحوم نہ صرف یہ کہ صاحبِ علم تھے، سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے، بلکہ دینی معاملات سے بہت شغف رکھتے تھے، علماء کی مجلس میں بیٹھتے تو دینی اُمور دریافت فرماتے، سردار صاحب نے والد صاحب سے سوال کیا؛

مولانا! جمعہ کی نماز سے پہلے دو خطبے کیوں ہوتے ہیں، ایک بھی ہو سکتا تھا، درمیان میں وقفے کی کیا حکمت ہے۔؟

والد صاحب نے جواب دیا:

" خطبۂ جمعہ کے دو حصّے ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پر مشتمل ہے، اور دوسرے حصّے میں صحابہ تابعین اور عام مسلمانوں کے لئے دعائیں ہیں، اور خلفائے راشدین کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، اس لئے دونوں میں فرق و امتیاز کرنے کے لئے درمیان میں وقفہ رکھ دیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساتویں روز مسلمانوں پر ظہر کی بجائے جمعہ فرض کر دیا۔ اور اس کی دو رکعتیں رکھیں، حالاں کہ ظہر کی چار رکعتیں ہیں، تو یہ دو خطبے اِن دو رکعتوں کے قائم مقام ہوئے "۔

ایک مجلس میں قرآنی ارشاد وعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

کے بارے میں وضاحت کر رہے تھے کہ اتفاق سے کیا مراد ہے۔ اور تفرقہ کا کیا مفہوم ہے؟ اور قرآن کس اتحاد کا طلب گار ہے۔ فرمایا:

"نہ ہر اتفاق محبوب ہے، اور نہ ہر اختلاف مذموم، چوروں، اچکوں اور غلط جماعتوں کا اتفاق ہرگز محبوب اور پسندیدہ نہیں، قرآن کا منشا یہ ہے کہ حق پہ متفق ہو کر رہو۔ اور ولاتفرقوا کا مطلب یہ ہے کہ حق سے جدائی اختیار مت کرو، حق سے جدا ہونا ناپسندیدہ بھی ہے اور تباہی کا باعث بھی، لیکن باطل سے جدا ہونا ہی بہتر ہے۔

ارباب حکومت اعلان کرتے ہیں کہ اتفاق سے رہو، فرقہ واریت مت پھیلاؤ، اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ قانونِ حکومت کی پیروی کرو، اور اسی پر اتحاد رکھو۔ جو قانونِ حکومت کے خلاف چلے گا، وہ تفرقہ انداز کہلائے گا۔ اسی طرح قانونِ خداوی کو سمجھو، جو اس کے مطابق چلے گا وہ اتفاق کرنے والا اور متحد ہونے والا کہلائے گا، اور جو اس کے خلاف چلے گا، اسے تفرقہ انداز اور اختلاف پیدا کرنے والا کہیں گے۔"

ملفوظات

والد صاحب کے مزاج، اور طبیعت میں علم اتنا رچ بس گیا تھا کہ ان کی عام گفتگو بھی علمی نکات سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ بعض بالکل معمولی اور سادہ سی بات میں بھی علم کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے تھے۔ ان کے پاس ہر طبقے، ہر مکتبِ فکر، اور ہر علمی سطح کے لوگ آتے، جس انداز کی مجلس ہوتی ویسی ہی گفتگو کرتے، باقاعدہ کسی مجلس یا نشست کا اہتمام کبھی نہیں کیا، جس وقت جو بھی آیا، اسے خوش آمدید کہا۔ کبھی کسی سے ملنے سے انکار نہیں کرتے تھے بلسا اوقات لوگ سخت گرمی میں دوپہر کو آجاتے تب بھی انھیں بٹھاتے اور بعض حضرات شدید سردی میں عشاء کے بعد چلے آتے۔ اس وقت اگرچہ بیٹھنے میں تعب ہوتا مگر کبھی کسی کو واپس نہیں کرتے تھے۔

والد مرحوم کی تمام مجالس کی گفتگو کے اگر آج ٹیپ ہوتے یا انھیں قلم بند کرنے کا اہتمام کیا جاتا تو یقیناً انہی کی دس بارہ جلدیں ہوتیں۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔ اپنے سب بھائیوں میں ناچیز فقیر کو والد صاحب کے ساتھ رہنے کی سب سے زیادہ سعادت نصیب ہوئی ہیں بعض مرتبہ مجلسی گفتگو کا خلاصہ لکھ لیتا۔ بہت سی باتیں مولوی حکیم انیس احمد صدیقی نے قلم بند کی ہیں۔ والد صاحب کے بعض تلامذہ نے بھی لکھا ہے کہ وہ ان کے کچھ ملفوظات اور علمی گفتگو کے اقتباسات بھیجیں گے۔

بہر کیف میرے پاس جو کچھ تحریر کی صورت میں محفوظ ہے اس میں سے بہت تھوڑا پیشِ خدمت ہے۔ قارئین اندازہ لگائیں گے کہ مرحوم کے ملفوظات، اور نجی مجالس کی باتیں بھی ان کی علمی سوانح کا ایک اہم حصہ ہیں۔

میں نے جن مجالس کی گفتگو نوٹ کی ہے، ان میں سے اکثر پر تاریخ موجود ہے، مگر یہاں میں نے پر دانستہ تاریخ نہیں دے رہا ہوں، کیونکہ اس کی نوعیت خلاصے اور انتخاب کی ہے:

ایک مرتبہ نماز کی حکمتیں بیان فرما رہے تھے۔ فرمایا کہ:

قرآن حکیم میں ہے۔ "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف انسان ہی نہیں، کائنات کی ہر چیز خدا کی عبادت میں مصروف ہے۔ کس کی عبادت کس نوعیت کی ہے؟ یہ خود اسی کو معلوم ہے، چنانچہ اس سے آگے ہے۔ "کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ"، خدا خود تمام مخلوق کی عبادت کی خبر دے رہے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ کونسی مخلوق کیسی عبادت میں مشغول ہے۔ تو غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اشجار کی عبادت، بحالتِ قیام ہے۔ بہائم اور چوپائے رکوع کی حالت میں ہیں، تمام حشرات الارض سر بسجود ہیں، پہاڑوں کی عبادت قعود کے ذریعے ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ساری مخلوق کی عبادت ان چار طریقوں میں منحصر ہے، انسان کیونکہ اشرف المخلوقات بھی ہے، اس لئے اس کے لئے جو عبادت یعنی نماز مقرر کی، وہ بھی تمام مخلوقات کی عبادتوں کا خلاصہ، اور نچوڑ ہے۔ نماز میں چاروں طریقے جمع کر دیئے گئے"

اور یہ بھی فرمایا کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج کے لئے تشریف لے گئے تو ملکوت سموات میں آپ نے ملائکہ کو دیکھا کہ بعضے صرف حالت قیام میں اللہ کا حق عبودیت ادا کر رہے ہیں اور بعضے رکوع میں ہیں اور بعض سر بسجود ہیں اور کچھ حالتِ التحیات میں بیٹھے اللہ کی حمد و تسبیح کر رہے ہیں تو حق تعالیٰ نے آپ کے لئے نماز جیسی عبادت میں ملائکہ کی تمام انواع و اقسام کی عبادات جمع فرما دیں۔ گویا بندہ جب نماز پڑھے تو وہ فرشتوں کا قیام و قعود اور انواع و سجود تسبیح و تحمید اور تحیہ سب کچھ بجا لائے۔

اس کے علاوہ ایک اور حکمت بیان فرمائی۔ فرمایا:

جب آدمی کسی کی تعظیم کرتا ہے تو اس کے تین رتبے ہوتے ہیں، سب سے ادنیٰ مرتبہ تو یہ ہے کہ آدمی کھڑا ہو جائے، اوسط رتبہ یہ ہے کہ جھک جائے، اور سب سے اعلیٰ مرتبہ کہ سر بسجود ہو جائے۔ نماز میں اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں طریقے جمع کر دیئے ہیں، آخر میں قعدہ ہے۔ التحیات کے لئے بیٹھتے ہیں، یہ تعظیم کی تینوں حالتوں کا تتمہ ہے، اور تکملہ ہے، اور التحیات میں تین حقوق جمع ہیں۔ اللہ کا، اللہ کے رسُول کا، اور عام مسلمانوں کا، اور آخر میں دُعا ہے یا

بات خاصی طویل ہو گئی، علامہ انور شاہ کاشمیری کے حوالے سے کئی نکات نقل فرمائے، وہ ناچیز کو یاد نہیں رہے۔ آخر میں سلام کی، شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے حوالے سے یہ حکمت بیان کی۔ فرمایا:

"شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ نماز کے اختتام پر دو سلام رکھنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب آدمی نماز میں داخل ہوا تو دنیا سے بے تعلق ہو کر خدا کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ اور جب نماز سے فارغ ہو رہا ہے تو گویا خدا کی بارگاہ میں حاضری دے کر پھر دنیا میں لوٹ رہا ہے، تو ایک سلام بارگاہِ خداوندی کے لئے ہوا کہ وہاں سے رخصت ہو رہا ہے، اور دوسرا سلام اہلِ دنیا کے لئے ہوا کہ دنیا میں داخل ہو رہا ہے۔"

سردار عبدالرب نشتر مرحوم پنجاب کے گورنر تھے، انھوں نے والد صاحب قبلہ اور مفتی محمد حسن صاحبؒ کو مدعو کیا، گھنٹہ بھر کی مجلس رہی، تمام وقت علمی باتیں ہوتی رہیں، سردار صاحب مرحوم نہ صرف یہ کہ صاحب علم اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے بلکہ دینی معاملات سے بہت شغف رکھتے تھے۔ علماء کی مجلس میں بیٹھتے تو دینی امور پر زیادہ گفتگو کرتے، دورانِ گفتگو والد صاحب سے سوال کیا:

مولانا! جمعہ کی نماز سے پہلے دو خطبے کیوں ہوتے ہیں، ایک بھی ہو سکتا تھا۔ درمیان میں

وقفے کی کیا حکمت ہے۔؟

والد صاحب نے جواب دیا:

"خطبۂ جمعہ کے دو حصّے ہیں۔ایک اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پر مشتمل ہے۔اور دوسرے حصہ میں صحابہ، تابعین، اور عام مسلمانوں کے لئے دعائیں ہیں اور خلفائے راشدین کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔اس لئے دونوں میں فرق و امتیاز کرنے کے لئے درمیان میں وقفہ رکھدیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساتویں روز مسلمانوں پر ظہر کے بجائے جمعہ فرض کر دیا، اور اس کی دو رکعتیں رکھیں، حالاں کہ ظہر کی چار رکعتیں ہیں، تو گویا یہ دو خطبے اُن دو رکعتوں کے قائم مقام ہوئے۔"

ایک مجلس میں قرآنی ارشاد۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا (۱) کے بارے میں وضاحت کر رہے تھے کہ اتفاق سے کیا مراد ہے، اور تفرقہ کا کیا مفہوم ہے۔؟ اور قرآن کس اتحاد کا طلب گار ہے۔

فرمایا:

" نہ ہر اتّفاق محبوب ہے، اور نہ ہر اختلاف مذموم۔ چوروں، اُچکّوں، اور غلط جماعتوں کا اتّفاق ہرگز محبوب اور پسندیدہ نہیں۔ قرآن کا منشا یہ ہے کہ حق پر متّفق ہو کر رہو۔ اور ولا تفرّقوا کا مطلب یہ ہے کہ حق سے جدائی اختیار مت کرو۔ حق سے جدا ہونا، ناپسندیدہ بھی ہے، اور تباہی کا باعث بھی۔ لیکن باطل سے جدا ہونا ہی بہتر ہے۔

ارباب حکومت اعلان کرتے ہیں کہ اتفاق سے رہو، فرقہ واریت مت پھیلاؤ۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ قانونِ حکومت کی پیروی کرو، اور اسی پر اتحاد رکھو، جو قانونِ حکومت کے خلاف چلے گا، وہ تفرقہ انداز کہلائے گا، اِسی طرح قانونِ خداوندی کو سمجھو، جو اس کے

مطابق چلے گا، وہ اتفاق کرنے والا، اور متحد ہونے والا کہلائے گا، اور جو اس کے خلاف چلے گا، اُسے تفرقہ انداز اور اختلاف پیدا کرنے والا کہیں گے۔"

ایک بار فرمایا:

"امام، عربی کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنی مقتدیٰ اور پیشوا کے ہیں۔ امام باعتبار دین کے بھی ہوسکتا ہے، اور باعتبار دنیا کے بھی۔

باعتبار دین کے جیسے امام ابوحنیفہ، امام مالک، اور امام شافعی وغیرہ۔ اور باعتبار دنیا کے بھی، مثلاً جو بادشاہ ہوگا، امیر مملکت ہوگا وہ بھی امام کہلائے گا۔ جیسے قرآن میں ہے۔ وقاتلوا ائمة الکفر انهم لا ایمان لهم[1]۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام کا اطلاق ہر ایک پر ہوتا ہے، چاہے دین کا پیشوا ہو یا دنیا کا۔ امام کے یہ معنیٰ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

" امام کے ایک اور معنیٰ ہیں، اور وہ ہیں خلیفہ کے۔ اب اگر کوئی شخص مسلمانوں کے دین اور دنیا دونوں کا مقتدیٰ اور پیشوا ہو تو اُسے خلیفہ راشد کہیں گے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدّیق اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہما۔ یہ حضرات دین کے بھی پیشوا تھے، اور دنیا کے بھی اسی لئے انھیں خلیفہ راشد کہا جاتا ہے۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ، اور حضرت علیؓ کی خلافت پر گفتگو ہو رہی تھی، اہل سُنّت والجماعت کے دلائل بیان فرما رہے تھے کہ حضرت ابوبکر صدّیق ہی کو خلیفہ اوّل ہونا چاہیئے تھا۔ فرمایا:

" خلافت و امارت کا مدار نسب پر نہیں، صلاح و تقویٰ اور عدل و انصاف پر ہے یہ صرف ہمارا ہی عقیدہ نہیں، دنیا کے کسی بھی دانا اور زیرک آدمی سے پوچھو گے تو وہ یہی بتائے گا، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو،

ہم کہتے ہیں کہ اچھا اگر خلافت کا مدار نسب ہی پر ہے تو پھر یزید پر کیوں اعتراض ہے اور نسب پر اعتبار تسلیم کر لیا جائے تو حضرت علی خلیفہ اوّل پھر بھی نہیں ہوتے ۔ اوّل لڑکے کو حق پہنچتا ہے، لڑکا نہ ہو تو لڑکی کو، تو اس حساب سے پہلے حضرت فاطمہ خلیفہ ہوتیں، پھر حضرت حسن اور اس کے بعد حضرت حسین، چوتھے نمبر پر حضرت علی خلیفہ ہوتے ۔ اور یہ چوتھے نمبر پر بھی انھیں ہم نے خلیفہ بنایا۔ شیعہ تو قاعدہ ہی بگھارتے رہے ۔"

اس کے بعد فرمایا :

" میں اپنی تقاریر اور مواعظ میں بھی یہ بات بار بار کہہ چکا ہوں کہ اہلِ سنّت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی کو اس لئے خلیفہ نہیں بنایا گیا کہ وہ حضور کے داماد تھے، بلکہ انھیں اس لئے خلیفہ بنایا گیا کہ حضرت عثمان غنی کی شہادت کے بعد روئے زمین پر صلاح و تقویٰ اور عدل و انصاف میں حضرت علی سے بڑھ کر کوئی نہ تھا، اس لئے صحابہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اب فیصلہ کرو کہ ہم نے ان کی زیادہ تعظیم کی یا شیعہ حضرات نے ؟ "

کچھ ملفوظات مولانا غلام ربانی صاحب نے جوہر آباد سے بھیجے ہیں، ان میں سے بعض یہاں نقل کرتا ہوں :۔

فرمایا سبق میں یا تقریر میں کبھی کسی کا نام لے کر رد نہ کرنا اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، حق بات بیان کرو، جو اس کے خلاف ہوگا اس کا خود ہی رد ہو جائے گا۔

فرمایا آدمی اپنا کام ٹھیک رکھے، دوسروں کی فکر میں نہ پڑے۔ پھر کوئی کچھ نہیں کہتا۔

آدمی دیکھ بھال کے وعظ کہے۔ اور حق بات کہے، پھر ہر ایک سنتا ہے۔

وعظ اتنا کہنا چاہیئے کہ لوگ اکتا نہ جائیں۔

علم ایک حسین چیز ہے آدمی اس پر فدا نہ ہو جائے یہ توجہ نہیں کرتا۔ اور نہ کچھ حاصل ہوتا ہے۔

علم صفت ہے اللہ کی اور تدریس و تعلیم ہے انبیاء کی، جس شخص میں دونوں صفتیں جمع ہو جائیں اس کی فضیلت ظاہر ہے۔

آدمی جب کامل ہوتا ہے، جب اس میں تین صفتیں موجود ہوں، اس کا علم فقہا جیسا ہو، عبادت اولیا جیسی ہو اور اس کے اعتقادات متکلمین جیسے ہوں

کتابت اور حساب ضرور سیکھنا چاہیئے۔ یہ دونوں عمدہ فن ہیں، حضرت فاروق اعظمؓ نے ان دونوں کو پسند فرمایا ہے۔

فرمایا۔ حضرت مدنیؒ جب دیوبند میں ہوتے تو اپنے محلہ کی مسجد میں صبح کی نماز خود پڑھاتے قاری نہ تھے مگر قرآن ایسے خشوع خضوع سے پڑھتے کہ بعض لوگوں کے آنسو جاری ہو جاتے، میں صبح کی نماز انہی کے پیچھے پڑھتا۔

فرمایا۔ ایک مرتبہ دار العلوم میں حضرت مدنی نے میرے ذمہ زیادہ اسباق رکھ دیئے۔ میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ دو ایک روز بعد حضرت سے ملاقات ہوگئی فرمانے لگے۔ مولوی ادریس ہی عمر میں تم سے بڑا ہوں (حالانکہ حضرت ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے تھے) اسباق میں نے تجویز کئے ہیں اس پر

---

(۱)۔ مولانا غلام ربانی۔ والد صاحب کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔

میں نے کہا، حضرت اب ضرور پڑھاؤں گا۔

فرمایا: آج کل بچّوں کو تعلیم کی رغبت دلانے کے لئے زدوکوب کے بجائے انعام مقرر کرنا چاہیئے کہ اتنا پڑھو گے تو اتنا انعام ملے گا۔

فرمایا: رمضان میں سفر نہ کرنا چاہیئے۔ اس سے عبادت میں خلل پڑے گا۔ (خود بھی رمضان میں سفر نہیں کرتے تھے)

جو ہدیہ بلا اشرافِ نفس ملے اس میں خیر و برکت ہوتی ہے

فرمایا: آدمی کی عزّت ایک جگہ رہنے سے ہوتی ہے، جگہ جگہ پھرتے رہنے سے کوئی عزّت نہیں ہوتی بلکہ آدمی بے وقوف ہو جاتا ہے۔

فرمایا: بزرگوں کے تبرکات اپنے پاس رکھنا جائز ہیں۔ اور تبرّک بآثار الصالحین کے متعلق وہ آیت تلاوت کی جس میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی اشیاء اور تابوت کا ذکر ہے۔

فرمایا: عزّت کی تعریف یہ ہے کہ کسی کے دل میں کسی کی اتنی عظمت اور احترام پیدا ہو جائے کہ اس کے لئے جان اور مال دینے سے دریغ نہ کرے۔ باقی جسے لوگ آج کل عزّت سمجھتے ہیں، وہ تملّق اور چاپلوسی ہے۔

فرمایا: جس طرح جب تک سو پچاس راویوں کے نام یاد نہ ہوں تو حدیث کا صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا، اسی طرح جب سو پچاس شیطانوں کے نام معلوم نہ ہوں اخبار سمجھ میں نہیں آتا۔

فرمایا: آدمی کو باپ کی قدر جب ہوتی ہے جب خود باپ بنتا ہے۔ قدرِ بابا نہ دانی تا بابا نہ شوی۔

فرمایا: آدمی نہ تو اتنا قیمتی لباس پہنے کہ طبیعت میں فخر اور غرور آ جائے اور نہ اتنا گھٹیا پہنے کہ دوسرے لوگ حقیر سمجھیں۔ پھر فرمایا۔ لباس کے تین درجے ہیں، ایک درجہ آسائش کا، جو ضروری ہے۔ دوسرا زیبائش کا، جو جائز ہے، اور تیسرا درجہ نمائش کا ہے، جو حرام اور ناجائز ہے۔

بعض احباب کہتے ہیں کہ چند کرسیاں منگا کر رکھ لیں تاکہ آنے والوں کو سہولت ہو۔ میں

کہتا ہوں۔ جو دوست کرسیاں پسند کرتے ہیں، انھیں میرے پاس آنے کی ضرورت ہی کیا ہے
فرمایا: محبت کے تین سبب ہوتے ہیں، کبھی کسی سے محبت ہوتی ہے اس کے حسن و جمال کی وجہ سے، کبھی جود و نوال کی وجہ سے، اور کبھی محبت ہوتی ہے فضل و کمال کی وجہ سے اور یہ تینوں سبب علیٰ وجہ الکمال جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم میں موجود ہیں۔
فرمایا: اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کی عصمت و نزاہت کو قرآن حکیم میں جا بجا بیان فرمایا مگر جس اسلوب اور بسط کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت و نزاہت کو سورۂ والنجم کی ابتدائی آیتوں میں بیان فرمایا، اس اسلوب اور تفصیل سے کسی نبی کی عصمت کو بیان نہیں فرمایا۔
فرمایا: میں اہلِ علم کا ہدیہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہوں، کیونکہ اس میں خیر و برکت ہوتی ہے
پورا دین تین رکعتوں کے قائم مقام ہے، اور وِتر ہے، پہلی رکعت بمنزلِ ایمان ہے، دوسری رکعت بمنزلِ اسلام ہے، اور تیسری رکعت بمنزلِ احسان ہے، تو ایمان، اور اسلام بدونِ احسان یعنی تصوف کے نامکمل رہتا ہے۔
فرمایا: فلاسفہ، انبیائے کرام کے مزاج شناس نہیں ہوتے اس لئے معجزات کے منکر ہوتے ہیں، اور یہ شعر پڑھا:

فلسفی چون منکرِ حنانہ است
از حواسِ انبیاء بیگانہ است

فرمایا: اپنے کو دیوبندی کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس اہلِ سنّت والجماعت کہدیا کرو۔
فرمایا: بعض لوگ نور و بشر کے جھگڑے میں پڑے رہتے ہیں، یہ نازک مقام ہے۔ کسی وقت بے ادبی سے بشر کہدیا تو پیغمبر کی تنقیص لازم آئے گی جس سے ایمان سلب ہونے کا اندیشہ ہے۔
فرمایا: زہد کا آخری درجہ یہ ہے کہ مال آنے پر آدمی اتنا خوش نہ ہو کہ غرور اور تکبر میں مبتلا ہو جائے اور مال کے چلے جانے پر اتنا غم نہ ہو کہ یاس اور ناامیدی لازم آئے اتنا

فرمایا: عدم الفرح بالموجود وعدم الحزن بالمفقود۔

فرمایا: حدیث میں آیا ہے۔ الدنیا مزرع الآخرۃ، کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جس طرح دنیا کی کھیتی کا دارومدار چھ چیزوں پر ہے، اسی طرح آخرت کی کھیتی کا مدار بھی چھ چیزوں پر ہے، اول زمین ہے جو محلِ کاشت ہے، دوسرے بیج ہے جس کو کاشت کیا جاتا ہے، تیسرے آسمان ہے جس سے بارش برستی ہے، چوتھی چیز کسان ہے جو کھیتی باڑی کرتا ہے اور زمین میں ہل چلاتا ہے۔ پانچویں چیز سورج ہے جس کی تمازت سے کھیتی پک کر تیار ہوتی ہے۔ چھٹی چیز چاند ہے جس کی خنک آمیز روشنی سے غلہ جات اور میووں میں مٹھاس اور شیرنی پیدا ہوتی ہے۔ ان چھ چیزوں میں سے اگر ایک چیز بھی نہ ہو تو کھیتی تیار نہیں ہو سکتی، اسی طرح آخرت کی کھیتی کے لئے پہلی چیز انسان کا جسم ہے جو بمنزل زمین کے ہے جس میں نیک و بد اعمال کی کاشت کی جاتی ہے، دوسری چیز انسان کے نیک و بد اعمال ہیں جو بیج کے قائم مقام ہیں۔ تیسری چیز انسان کا نفس اور روح ہے جو بمنزل کاشتکار اور کسان ہے، چوتھی چیز شریعت ہے جو بمنزل آسمان ہے کہ جس طرح آسمان زمین کو محیط ہے، اسی طرح شریعت انسان کے اعمال و افعال کو محیط ہے، پانچویں چیز نبوت ہے جو بمنزل سورج ہے، چھٹی چیز صوفیا ہیں جو بمنزل چاند ہیں، سورج کی موجودگی میں چاند کی ضرورت نہیں پڑتی مگر اس کے غروب کے بعد چاند کی ضرورت پڑتی ہے۔

فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول قرآن کریم نے نقل کیا ہے "انی لا احب الآفلین"، کہ میں غروب ہونے والی چیزوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ یہ چیزیں جنھیں تم معبود بناتے ہو یہ قابل پسند بھی نہیں ہیں چہ جائے کہ ان کو معبود بنایا جائے اور اس میں دلیل بھی بیان ہو گئی کہ جو چیز غروب ہو جاتی ہے وہ مستور ہو جاتی ہے اور جو مستور ہو جاتی ہے وہ مقہور ہو گئی اور جو مقہور ہو گئی وہ مغلوب ہو گئی اور جو مغلوب ہو گئی وہ غالب نہ رہی۔ اور جو غالب نہ ہو وہ خدا کیسے ہو سکتی ہے۔ خدا تو وہ ہے جو غالب ہو۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

عشقِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم:

نبوت و رسالت کے عقیدے کا لازمی نتیجہ حضور علیہ السلام سے والہانہ محبت اور عشق، اور آپؐ کی اطاعت و پیروی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اپنے رسُول کی جیسی پیروی چاہتے ہیں وہ اسی وقت ممکن ہے جب آدمی کا دل نبی کے عشق و محبت سے سرشار ہو۔ اگر کوئی شخص آپؐ کو نبی مانتا ہے مگر اس کا دل آپؐ کی غایت درجہ محبت سے محروم ہے تو اس کا ایمان ہی مشکوک و مشتبہ ہے۔ کیونکہ کامل محبت کے بغیر اطاعت و فرماں برداری کی منزلیں طے نہیں ہو سکتیں۔ خود حضور علیہ السلام کا فرمان یہی ہے کہ کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ مجھے اپنے، اپنی اولاد، اپنے ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان علماء، فضلا اور شعراء نے اپنے اپنے رنگ میں حضور علیہ السّلام سے اپنے والہانہ عشق کا اظہار کیا ہے۔

عشقِ رسُول کا سب سے بڑا مظہر نعت گوئی کو سمجھا گیا ہے، اس کا آغاز خود حضورِ اقدس کے دور ہی سے ہوتا ہے۔ مشہور صحابی حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس کی خدمت میں اپنا منظوم نذرانۂ عقیدت و محبت پیش کیا۔

امام شافعی اور امام ابو حنیفہ جیسے جلیل القدر ائمہ اور علماء نے منظوم نذرانۂ محبت و عقیدت پیش کیا۔ عربی، اُردو، اور فارسی میں مسلم شعراء نے حضور کے عشق کے لازوال

نغمے تخلیق کئے اور نعت کے ایسے ایسے لعل و گہر پیش کئے جن کی مثال دنیا کا ذخیرۂ شعر و ادب پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مولانا روم، مولانا جامی، شیخ فریدالدین عطار، امیر خسرو، امیر مینائی، حاجی امداد اللہ، مولانا احمد رضا خاں، اور علامہ اقبال ایسی بلند پایہ ہستیوں نے بارگاہِ رسالت میں محبت و عقیدت کے ایسے نذرانے، اور نعت کے ایسے سدا بہار پھول پیش کئے جن کے امامِ جان فزا سے عاشقانِ رسول قیامت تک سرور و کیف میں ڈوبے رہیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل عشقِ رسول یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو اسوۂ رسول کے تابع بنا دے، کسی معاملے میں اپنی رائے اور ارادے کو باقی نہ رکھے، اس کے پیشِ نظر ہر وقت یہ بات ہو کہ حضور اقدس کا عمل کیا تھا، اور حکم کیا تھا، محض زبان سے عشق کے دعوے کرنا، اور عمل سے اس کی نفی کرنا کسی صورت عشقِ رسول نہیں کہلا سکتا۔

والدِ محترم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے عشق و محبت کا اظہار جہاں ایک طرف آپ کی ایک مستند اور تحقیقی سیرت لکھ کر کیا، زندگی بھر حدیثِ رسول اور سنتِ رسول علیہ السلام کی بہر نوع خدمت کی، خود اپنی زندگی کو اُن کے اسوہ اور نمونہ کے مطابق ڈھالا۔ وہاں حضورؐ کے مقامِ رفیع کو شعر اور قصیدہ کی زبان میں بھی بیان کیا۔ اور آپ کی سیرتِ طیبہ اور حیاتِ مقدسہ کے مختلف پہلوؤں کو قصیدے کے قالب میں ڈھالا۔

حضور اقدس فداہ ابی و امی کی مدح میں جو سب سے پہلے قصیدہ کہا اس میں حضور کے ان تمام اسمائے مبارکہ کو جمع کیا ہے جو قرآنِ حکیم اور دیگر کتب سماویہ میں مذکور ہیں۔ یہ نعتیہ قصیدہ شرح مقاماتِ حریری کی ابتدا میں درج ہے۔ عربی میں ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شفیع مطاع نبی کریم   قسیم جسیم نسیم وسیم
بشیر نذیر و مدثر   رسول مبین رشید حلیم

سراج منیر کشمس الضحیٰ — وخیر البرایا ونور قدیم
ومولی الوریٰ رحمۃ العالمین — ثمال الیتیم وماوی العدیم
دلیل الی الخیر دار الحکیم — سمیع بصیر خبیر علیم
وعبد شکور صبور ھجود — سعید سدید حمید حکیم
صدوق امین حفی مکین — نبیہ وجیہ وعین النعیم
تقی نقی صفی وَ فِیٌّ — زکی رضی وخلق عظیم
حبیب الالٰہ خلیل الالٰہ — وقائد غُرٍّ جلیل فخیم
واخشی البرایا واتقی الوریٰ — منیب حنیف عفیف رحیم
نبی المراحم والمجتبیٰ — حسیب نسیب نجیب صمیم
ھو الصالح الصادق المؤتمن — رواء الغلیل شفاء السقیم
ھو الفاتح الخاتم المقتفِی — مُلقی القرآنِ ووحی رقیم
ھو الشاھد المنذر الحائد — شفیق رفیق وَ لِیٌّ حمیم
ھو الاحسن الاجود الاشجع — اَغَرُّ الجبین جمیل وسیم
بشارۃ عیسیٰ و وعظ الکلیم — دعاء البراھیم عند الحطیم
محمد والمرسل المنتقی، المقدس عن کل وصفٍ ذمیم
وکل النبیین والمرسلین — بہ بَشَّرُوا منذ عصر قدیم
شہید علی الناس یوم الحساب — عماد ملاذ شفیع الانیم
نبی الوریٰ خاتم الانبیاء — رسول اتانا بدین قویم
امام النبیین والمرسلین — فصیح البیان کدُرٍّ نظیم
ختام السّلام کمسک الختام — لختم الکرام نبی فخیم
واصحابہ الاصفیاء الکرام — مدی الدھر مادام یجری النسیم

حضورؐ کی مدح و ثنا میں ایک اور قصیدہ لکھا، یہ قصیدہ بہت عجیب و غریب ہے۔ امرأالقیس کے مشہور قصیدے کے مطلع "قفا نبک من ذکری حبیب و منزل" پر تضمین ہے۔

علامہ اقبال کے معروف شعر:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

پر تضمین کی ہے۔ اس میں بھی حضور علیہ السلام کی محبت کو جزوِ ایمان قرار دیتے ہیں، اور حضور کی ذات بابرکات کو منبع نورِ ہدیٰ کہتے ہیں!

ذاتِ پاکش منبعِ نورِ ہدا
کرد قرآں نطقِ او وحیِ خدا

نیست ایماں نزدِ اربابِ عقول
جز بہ تصدیقِ خدا و ہم رسول
چیست ایماں بر نبی مفتوں شدن
بر جمالِ شرعِ او مجنوں شدن

ایں نشید و ایں قصیدم بہرِ تو
بہرِ ناموسِ رسولِ پاکِ تو

عربی اور فارسی کے بے شمار اشعار ہیں جو خاتم المرسلین جناب رسالتِ مآب کی شان میں کہے۔

چار جلدوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ لکھی، اس کا بھی

ایک ایک لفظ عشقِ رسُول میں ڈوبا ہوا ہے۔ حضور اقدس کی ولادت باسعادت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"سرورِ دو عالم سید وُلدِ آدم محمد مصطفےٰ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ و صحبہ و بارک وسلم و شرف کرم، واقعۂ فیل کے پچاس یا پچپن دن بعد بتاریخ ۸ ربیع الاوّل یوم دوشنبہ مطابق ماہ اپریل ۵۷۰ عیسوی مکہ مکرمہ میں صبح صادق کے وقت ابو طالب کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ولادت باسعادت کی تاریخ میں مشہور قول تو یہ ہے کہ حضور پُر نور ۱۲ ربیع الاوّل کو پیدا ہوئے لیکن جمہور محدثین اور مورخین کے نزدیک راجح اور مختار قول یہ ہے کہ حضور ۸ ربیع الاوّل کو پیدا ہوئے۔

عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ، فاطمہ بنت عبداللہ فرماتی ہیں کہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت حضرت آمنہ کے پاس موجود تھی تو اس وقت یہ دیکھا کہ تمام گھر نور سے بھر گیا اور دیکھا کہ آسمان کے ستارے جھکتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ مجھکو یہ گمان ہوا کہ یہ ستارے مجھ پر آن گریں گے۔

عرباض بن ساریہؓ سے مروی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ نے ولادت باسعادت کے وقت نُور دیکھا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔" (۱)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا "محمد" نامِ نامی و اسمِ گرامی رکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

---

(۱) سیرۃ المصطفیٰ ۔ جلد اول، ص : ۴۰، ۴۱ ۔

"عبدالمطلب نے آپ ولادت باسعادت سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا، جو اس نام کے رکھنے کا باعث ہوا۔ وہ یہ کہ عبدالمطلب کی پُشت سے ایک زنجیر ظاہر ہوئی جس کی ایک جانب آسمان میں، ایک جانب زمین میں اور ایک جانب مشرق میں اور ایک مغرب میں ہے، کچھ دیر بعد وہ زنجیر درخت بن گئی جس کے ہر پتے پر ایسا نور ہے جو آفتاب کے نور سے ستّر درجے زائد ہے، مشرق و مغرب کے لوگ اس کی شاخوں سے چمٹے ہوئے ہیں، قریش کے کچھ لوگ بھی اس کی شاخوں کو پکڑے ہوئے ہیں اور قریش ہی کے کچھ لوگ انھیں کاٹنے کا ارادہ کرتے ہیں۔

معبّرین نے اس خواب کی یہ تعبیر دی کہ تمھاری نسل سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جس کی مشرق سے لے کر مغرب تک لوگ پیروی کریں گے، اور آسمان و زمین والے اس کی حمد و ثنا کریں گے۔ اس وجہ سے عبدالمطلب نے آپؐ نام "محمّد" رکھا۔" (۱)

اس بحث کے ضمن میں کہ حضراتِ انبیائے کرام منصب نبوّت و رسالت کی تفویض سے پہلے بھی ہر قسم کے فحشاء اور منکر سے محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔ اور اعلیٰ درجے کے ولی، عارف باللہ اور صدیق ہوتے ہیں، تحریر فرماتے ہیں:-

"حضرات انبیاء اللہ، نبی ہونے سے پیشتر بھی کفر و شرک اور ہر قسم کے فحشاء اور منکر سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں، ابتدا ہی سے اِن حضرات کے قلوبِ مُطہّرہ، توحید و تفرید اور خشیت و معرفت سے لبریز رہتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو حضرات عنقریب کفر اور شرک کو مٹانے کے لئے اور ہر

---

(۱) سیرۃ المصطفیٰ۔ جلد اوّل، ص: ۴۸

فحشاء اور منکر سے بچانے کے لئے اور خیر کی طرف دعوت دینے کے لئے من جانب اللہ مبعوث ہونے والے ہیں، اور خدا کے مجتبیٰ اور مصطفیٰ اور برگزیدہ و پسندیدہ بندے بننے والے ہیں، معاذ اللہ وہ خود ہی منصب نبوت و رسالت اور خلعتِ اجتبار و اصطفار کی سرفرازی سے پیشتر کفر اور شرک کی نجاست میں ملوث اور فواحش و منکرات کی گندگی سے آلودہ ہوں۔! حاشا ثمہ حاشا یہ قطعاً ناممکن اور محال ہے، حضرات انبیار، نبوت وبعثت سے پیشتر اگرچہ نبی اور رسول نہیں ہوتے مگر اعلیٰ درجے کے اولیار اور عرفا ضرور ہوتے ہیں، صفاتِ خداوندی سے بے خبر نہیں ہوتے، اور نہ ان کو کسی وقت صفاتِ خداوندی میں کسی قسم کا دھوکہ اور مغالطہ ہوتا ہے، اور نہ کسی قسم کا شک واشتباہ پیش آتا ہے۔"

(سیرۃ المصطفیٰ۔ ج: ۱، ص: ۹۰، ۹۱)

۱۹۷۲ء میں ناچیز راقم نے علامہ یوسف نبہانی کی کتاب "الوسائل الوصول الی شمائل الرسول" کا اردو ترجمہ کیا، چھپا تو پیش کیا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور علامہ نبہانی کے بارے میں اپنا ایک واقعہ سنایا۔ فرمایا:

"میں ۱۳۵۶ھ میں فلسطین گیا، وہاں ایک عالم دین سے ملاقات ہوئی، وہ علامہ نبہانی کے احباب اور رفقاء میں سے تھے۔ (علامہ نبہانی کا انتقال ۱۳۵۲ھ میں ہوا تھا، آپ فلسطین کے رہنے والے تھے) وہ کہنے لگے کہ۔ نبہانی کے انتقال کے کچھ روز بعد مجھے خواب میں حضور اقدس کی زیارت نصیب ہوئی، میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! نبہانی ہمارا ساتھی تھا، اس نے آپ کی مدح، تعریف اور فضائل میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ اس کا انتقال ہو گیا، اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟۔ حضورؐ نے فرمایا: نبہانی

تو ہمارا احسان تھا ۔ حضور نے صرف اتنا فرمایا ۔"

والد صاحب فرمانے لگے کہ علّامہ نبہانی نے تقریبًا پچاس کتابیں حضور اقدس کے بارے میں تالیف کیں ۔ وہ اللہ کے اور اس کے رسُول کے مقبول بندوں میں سے تھے ۔ پھر دعا کی کہ اللہ تعالیٰ میرا ، اور میری اولاد کا انجام بخیر کرنا ، ہم سب حضور کی محبّت سے سرشار رہیں ، اور قیامت میں حضور کی شفاعت میسّر ہو ۔ (آمین)

تعلیمی نظریات

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم!
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف

والد صاحب کے بارے میں ان کے تمام احباب، اور شاگرد جانتے ہیں کہ وہ انگریزی زبان کے سخت مخالف تھے۔ یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے، وہ نہ صرف انگریزی زبان کے خلاف تھے بلکہ اس بات کے بھی خلاف تھے کہ دینی و دنیوی تعلیم ایک ساتھ دی جائے۔

انگریزی زبان کے خلاف بِلا دلیل نہیں تھے، اور نہ مطلقاً اس کی تعلیم سے منع کرتے تھے بلکہ وہ شرعی اور عقلی نقطۂ نظر سے ایک پیمانہ مقرر کرتے تھے اور اس کی روشنی میں عربی اور انگریزی تعلیم اور اس کے احکام کا تجزیہ کرتے تھے۔

ان کا نظریہ تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے علمِ دین مقصودِ اوّل ہے، اور علمِ دنیا مقصودِ ثانوی کے درجے میں ہے۔

انگریزی تعلیم ان کی نظر میں شرعاً کیا حکم رکھتی ہے، اس کے بارے میں شرعی اور عقلی دلائل کے ساتھ بحث کرتے ہوئے اپنے ایک رسالے میں لکھتے ہیں:

"انگریزی تعلیم کا حکم شرعی کہ انگریزی اپنی ذات سے ایک زبان ہے، اور باعتبار عرف کے ایک خاص نصاب کا نام ہے جو مختلف علوم وفنون کا حامل ہے، شریعت نے کسی زبان، یا کسی علم، اور فن کا سیکھنا ممنوع قرار نہیں دیا، البتہ قبائح اور مفاسد کے مل جانے کے باعث ممنوع ہونے کا حکم لگایا گیا ہے۔"

ایک تحریر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ محض کسی زبان کی تعلیم وتدریس کو خواہ وہ انگریزی ہو یا اور کوئی زبان، ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ انگریزی زبان کے مخالف صرف اس بنا پر تھے کہ اس کا نظامِ تعلیم، اور اس کے تعلیمی اداروں کا ماحول ایسا ہے جو انسان کو دین سے دُور لے جاتا ہے۔ چنانچہ اس مشروط مخالفت کی دلیل میں اپنا یہی مشاہدہ اور تجربہ بیان کرتے ہیں:

"مشاہدہ اور تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ موجودہ انگریزی تعلیم کا یہ لازمی اثر ہے کہ وضع قطع شرعی نہیں رہتی، بسا اوقات عقائد تک متزلزل ہو جاتے ہیں، اسلامی تہذیب وتمدّن نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے، بجائے اسلامی مزاج کے مغربی مزاج بن جاتا ہے۔ ان قبائح اور مفاسد کی بنا پر علماء انگریزی تعلیم کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔"

موصوف انگریزی زبان کی تعلیم کو تین درجوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ہر ایک کا الگ الگ حکم بیان کرتے ہیں۔ قبائح اور مفاسد کی موجودگی کی صورت میں عدمِ جواز کے قائل ہیں، مفاسد نہ ہونے کی صورت میں جواز کا حکم دیتے ہیں اور بعض ایسی صورتیں بیان کرتے ہیں جن میں اس کا حصول لازمی اور واجب قرار پاتا ہے۔ خود ہی اس صورت کو واضح کرتے ہیں:

"اگر کسی دینی ضرورت سے انگریزی پڑھے۔ مثلاً مخالفین کو دعوتِ اسلام دینے کی خاطر، کفّار سے اسلامی حکومت کے معاملات طے کرنے کی

خاطر، دشمنانِ اسلام کا جواب دینے کے لئے، تو ان تمام صورتوں میں (یا اس جیسی دوسری صورتوں میں) صرف جائز ہی نہیں بلکہ عین قربت و عبادت ہے۔"

بلا شبہ یہ ایک متوازن اور حقیقت پسندانہ رائے اور نظریہ ہے۔ بلا دلیل کسی بات پر فتویٰ لگا دینا عقلاً و شرعاً پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن اس طرح کے تجزیہ سے شاید وہ لوگ بھی اختلاف نہ کریں جو خود انگریزی کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہیں۔

والد صاحب سب سے زیادہ خلاف تعلیم کے نظریہ امتزاج کے تھے۔ یعنی قدیم و جدید کا امتزاج، ۱۹۴۹ء میں جب جامعہ عباسیہ بہاولپور کے شیخ الجامعہ بن کر آئے تو اسی نظریہ امتزاج کی خرابی بلکہ ناکامی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ جامعہ عباسیہ میں دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم بھی تھی۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جامعہ عباسیہ سے نہ کوئی ایسا عالمِ دین پیدا ہوا جس پر ملک و قوم فخر کر سکے اور نہ دنیوی علوم کا ایسا ماہر نکلا جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور سے نکلے جنھوں نے دنیوی معاملات میں برِ صغیر کے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

جامعہ عباسیہ کو چھوڑنے کی جہاں اور وجوہ تھیں، وہاں ایک بنیادی وجہ اس کا مخلوط نظامِ تعلیم بھی تھا جس کے وہ شدید مخالف تھے، ان کی واضح، اور حتمی رائے یہ تھی کہ درس گاہیں صرف دو قسم کی ہونی چاہئیں۔ ایک دینی علوم کی، اور دوسری دنیوی علوم کی۔

"مسئلہ تعلیم" کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا، اس میں "نظریہ امتزاج پر ایک نظر" کے عنوان سے، اس بارے میں اپنی رائے اور نظریہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"بعض لوگوں کو بلحاظ ضرورتِ زمانہ یہ خیال آتا ہے کہ اگر عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم بھی شامل کر لی جائے تو قدیم اور جدید کے امتزاج سے مؤثر نتائج پیدا ہوں گے۔ تین سال ہوئے کہ بہاولپور میں جامعہ اسلامیہ اسی نظریہ امتزاج کے تحت قائم کیا گیا ہے۔

اور مثال میں جامعہ ازہر مصر کو پیش کیا گیا ہے۔ اس وقت یہ ناچیز اس نظریہ امتزاج کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ فاقول وباللہ التوفیق وبیدہ ازمۃ التحقیق وسواء لہادی الی سواء الطریق۔

مدارس دینیہ کے قیام سے نقطہ آخرت مقصود ہے تاکہ علوم دینیہ کا احیاء اور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین کے علم اور عقائد اور طرزِ عمل کی تعلیم دی جائے تاکہ علمِ دین محفوظ ہو جائے۔ علم کی حفاظت کا ذریعہ تعلیم ہے۔ جس علم کی تعلیم نہ ہو وہ علم ختم ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ دینی مدارس کی غرض وغایت علم دین کا تحفظ ہے اور دنیاوی علوم کے مدارس کی ملک میں کوئی قلت نہیں، چپّہ چپّہ پر کالج اور اسکول کھلے ہوئے ہیں۔ جسے دنیاوی علوم حاصل کرنا مقصود ہو وہ جس کالج اور اسکول میں چاہے داخل ہو جائے۔

(۱)۔ اور ایک وقت میں علومِ دینیہ اور علوم دنیویہ کی تحصیل کی فکر میں پڑنا۔ طلب الکل فوت الکل کا مصداق ہے نہ دین نہ دنیا کچھ بھی نہ ہوگا۔

(۲)۔ پھر یہ کہ دونوں تعلیموں کے ملانے سے وقتِ تعلیم بڑھے گا اور مدّتِ تعلیم زیادہ ہو جائے گی، دو چند اور دُگنا وقت نہ ہوگا۔ تو دو چند اور دُگنے کے قریب تو ضرور ہو جائیگا جو طلبہ پر اور ان کے والدین پر موجبِ گرانی ہوگا۔ اس لئے علماء نے یہ خیال کیا کہ جسے دارِ آخرت کی فکر ہو وہ تھوڑی مدت میں بقدرِ ضرورت علمِ آخرت حاصل کرے اور مسلمان کا اصل مقصود آخرت ہے اور کافر سے ہمیں بحث نہیں اور پھر جس کو دنیاوی علم کی ضرورت ہو وہ اس کو حاصل کرے۔ مسلمان کے لئے دار باقی کا علم حاصل کرنا دارِ فانی کے علم سے مقدم ہے، امیر و فقیر سب کو وہیں جانا ہے۔

(۳)۔ نیز دنیوی علوم بہت ہیں۔ ہر ایک علم کے لئے علیحدہ علیحدہ کالج ہیں۔ انجنیری اور ڈاکٹری اور بحری اور بری اور فضائی تربیت گاہیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسی درسگاہ نہیں جہاں سب علوم کی بیک وقت تعلیم دی جاتی ہو۔

(۴)۔ پھر ان مفکّرین امتزاج کو یہ تو فکر ہے کہ علوم دینیہ کے ساتھ انگریزی تعلیم کو لازم قرار دیا جائے مگر یہ فکر نہیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں علوم دینیہ اور اعمال دینیہ کو لازم قرار دیا جائے، جس کا مطلب یہ نکلا کہ ان مفکّرین امتزاج کے نزدیک خالص دین کا علم تو مسلمان کے لیے ضروری نہ رہا۔ اور نصرانیوں کا علم اور ان کی زبان کا سیکھنا اتنا فرض ہو گیا کہ خالص دین کی تعلیم بھی بغیر انگریزی کے امتزاج کے غیر مؤثر اور غیر مفید نظر آنے لگی۔

یہ نظریۂ امتزاج، انگریزی علم کے ساتھ عشق کی آخری منزل ہے۔ جس کو علماء دین حیرت اور حسرت کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں کہ اللہ اکبر مسلمانوں کا ایک گروہ اس فکر میں ہے کہ خالص دینی تعلیم کو ملک سے ختم کر دیا جائے۔ خوب سمجھ لو کہ یہ نظریۂ امتزاج مغربیت سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔

(۵)۔ مدارس دینیہ کی تاسیس سے دو غرضیں ہیں۔ ایک تو علوم دینیہ کا احیاء اور بقاء، اور دوسری غرض صبغۃ اللہ ہے یعنی اسلامی رنگ کا تحفّظ اور بقاء ہے۔

اس لئے علماء کرام نے دینی مدارس کو انگریزی تعلیم سے محفوظ رکھا تاکہ انگریزی تعلیم کی وجہ سے مدارس میں نصرانیت کا کوئی اثر نہ آنے پائے اور دینی مدارس کا رنگ وہ ہے جو الذین انعمت علیہم کا تھا۔

خالص علم دین بارش کے پانی کی طرح بلاشبہ آب طہور اور عرق گلاب ہے لیکن اگر اس میں نصرانیت کی نجاست گر جائے اور چشمۂ شریعت کے آب طہور کے لون (رنگ)، اور طعم (مزہ) اور ریح (بو) کو متغیر کر دے تو ایسی صورت میں وہ آب طہور نجس ہو جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ان الماء طھور لا ینجسہ شئ الا ما غیر لونہ او طعمہ اوریحہ۔

مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ نام تو اسلام کا رہے مگر عملی زندگی اور معاشرہ

سب کا سب نصرانی اور مغربی ہو۔ اس طرح اسلام اور مغربیت میں ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ مغربی تہذیب و تمدن میں نفسانی اور شہوانی جذبات کیلئے پوری آزادی ہے اور اسلام میں نفسانی خواہشوں پر پابندیاں ہیں

اگر یہ لوگ تاریخ اسلام میں غزالی اور عطار اور رومی جیسے اکابر کا تذکرہ پڑھتے تو مدرسی زندگی کو حقیر نہ سمجھتے۔ شیخ فریدالدین عطارؒ فرماتے ہیں۔

۵ گرچہ درویشی بود سخت اے پسر ہم ز درویشی بنا شد خوب تر

(۶)۔ جس جگہ بھی انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اسی وقت سے اس جگہ سے خدا پرستی رخصت ہونی شروع ہو جاتی ہے اور نفس پرستی اور شہوت پرستی اور دنیا طلبی اپنا قدم جمالیتی ہے۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آتی ہے کہ نماز اور قرآن سے اس کو نفرت ہو جاتی ہے اور بجائے مسجد کے سینما اس کو مرغوب اور محبوب ہو جاتا ہے اور خانقاہ کے بجائے اس کو تماشا گاہ لذیذ اور خوشنما معلوم ہونے لگتی ہے اور اخلاق حسنہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے دین رخصت ہو چکا ہے۔

لہٰذا جب علوم جدیدہ کا علوم قدیمہ کے ساتھ امتزاج ہوگا تو جس قدر اور جس درجہ کا امتزاج ہوگا اسی قدر اور اسی درجہ وہاں سے دین رخصت ہو جائے گا۔

(۷)۔ اس گزشتہ نصف صدی میں نظریۂ امتزاج کے تمام تجربے ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ اسی نظریۂ امتزاج کے ماتحت لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا اور کانپور میں مدرسہ الٰہیات قائم ہوا اور دہلی میں جامعہ ملّیہ قائم ہوا۔ اس پچاس سال کی مدت میں ان درس گاہوں سے ایک بھی عالم دین پیدا نہیں ہوا جس سے مسلمانوں کو کوئی دینی فائدہ پہنچتا۔ اور اس نظریۂ امتزاج کی جو بہترین مثال پیش کی جاتی ہے وہ جامعہ ازہر کی مثال ہے۔

جامعہ ازہر ایک قدیم دینی درس گاہ ہے۔جو اب سے صدہا سال پیشتر خالص علومِ دینیہ کے لئے قائم ہوئی اور جس سے صدہا اور ہزارہا عالمِ دین پیدا ہوئے۔ اور اس وقت انگریزی اور اس کے فنونِ جدیدہ کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔

اس میں اب سے تیس پینتیس سال پہلے تک خالص دینی تعلیم ہوتی تھی۔اب کچھ عرصہ سے اس میں علومِ جدیدہ کی تعلیم کو بھی شامل کر لیا گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ اب جامعۂ ازہر وہ دینی جامع ازہر نہیں رہا۔جو اب سے تیس سال قبل تھا۔اب اس کا رنگ ہی دوسرا ہو چکا ہے۔اس قدیم دینی درسگاہ سے دین کا رنگ رخصت ہو گیا۔اور اس کے فضلاء کی وضع قطع اور معاشرہ سب مغربی ہو گئی۔

"یہ سب نظریۂ امتزاج کا کرشمہ ہے جب اور جہاں یہ امتزاج اپنا قدم رکھتا ہے دین وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے اور اگر برائے نام کچھ دین رہتا ہے تو غلبہ مغربیت اور نصرانیت ہی کا رہتا ہے۔اور اس کلیہ کے احاطہ میں دین فقیرانہ زندگی گزارتا ہے۔

(۸)۔جس طرح لڑکوں اور لڑکیوں کا مخلوط کالج موجبِ فتنہ ہے،اسی طرح علومِ دینیہ اور علومِ دنیویہ کی مخلوط درسگاہ دین کے لئے موجبِ صد فتنہ ہے۔

(۹)۔علومِ دینیہ عربیہ کا نصابِ تعلیم علیحدہ ہے اور علومِ عصریہ اور انگریزی علوم کا نصابِ تعلیم علیحدہ ہے۔ہر ایک کی نوعیت علیحدہ ہے اور دو مختلف النوع نصابوں کو بیک وقت تعلیم میں جمع کرنا گویا کہ اجتماعِ ضدین کی درسگاہ کھولنا ہے۔

(۱۰)۔دینی اور دنیوی تعلیم کی مخلوط درسگاہ کا وقف آمدنی سے قائم کرنا شرائط وقف کے منافی ہے۔وقف کی آمدنی خالص دینی کاموں پر خرچ ہو سکتی ہے۔دنیوی تعلیم پر اس کا کلاً یا جزواً خرچ کرنا جائز نہیں۔واقف کا وقف سے مقصود فقط آخرت ہے اور یہ غرض جب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ جب وہ آمدنی کلیتہً فقط دینی مقاصد پر خرچ کی جائے، جس میں دنیوی مقاصد کا امتزاج نہ ہو۔" فتلك عشرة كاملة

نصابِ تعلیم :

دینی علوم کا نصاب کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق بنیادی بات لکھتے ہیں کہ :

"دینی علوم کا نصاب ایسا ہونا چاہیئے جس میں بعثتِ نبوی کے اغراض ومقاصد پورے ہو سکیں یعنی کتاب وسنت کی صحیح تعلیم ہو سکے۔ اس کے حصول کے بعد قضا اور عدل کے فرائض سرانجام دے سکے۔ مسلمانوں کو وعظ وتلقین کر سکے؛ اہلِ باطل سے مناظرہ اور بحث وتمحیص ممکن ہو۔"

مدتِ تعلیم :

لکھتے ہیں :

"تعلیم کی مدت نہ اتنی طویل ہو کہ طالب علم گھبرا جائے اور والدین پر مصارف تعلیم کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہو جائے، نہ اتنی مختصر ہو کہ تعلیم برائے نام ہو، صرف سند اور ڈگری مل جائے مگر قابلیت نہ ہو، متوسط مدت آٹھ سال ہے۔ دو سال درجۂ تکمیل اور تخصص کے بڑھائے جا سکتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، جب حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس مدین تشریف لے گئے تو آٹھ سال قیام وتربیت کے لئے تجویز فرمائے اور فرمایا کہ اگر دس سال پورے کر دو تو زیادہ بہتر ہے۔ فان اتممت عشراً فمن عندک"

نیز لکھتے ہیں کہ تعلیم دین کے نصاب میں امورِ ذیل کا ہونا ضروری ہے :

ا۔ نصاب میں ایسی کتابیں داخل کی جائیں جن کے مصنفین کا علم اور تقویٰ امت میں مسلّمہ ہو۔

(۲)۔ کتابیں مختصر اور جامع ہوں جس سے ٹھوس استعداد پیدا ہو۔
(۳)۔ اتنی سہل اور آسان کتابیں نصاب میں نہ رکھی جائیں جنھیں طلبہ خود مطالعہ سے حل کرلیں، ایسی کتابوں سے استعداد پیدا نہیں ہوگی۔
(۴)۔ جدید فلسفہ، سائنس، اور جغرافیہ بھی اگر ضرورت کے مطابق شاملِ نصاب کرلیا جائے تو کوئی حرج نہیں مگر شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم، دینی تعلیم کے تابع ہو۔"

دینی تعلیم کے بارے میں ایک بات بڑے شدومد کے ساتھ یہ کہی جاتی ہے کہ اس سے دنیاوی ترقی رُک جاتی ہے، اور دینی تعلیم، دنیوی اور مادی ترقی میں مانع ہے۔

یہ اعتراض دراصل وہ لوگ کرتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ، جغرافیہ، صنعت وحرفت، تجارت وزراعت۔ یہ سب امور، دین سے الگ ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دین، پوری زندگی کو حاوی ہے۔ قرآن، حدیث، اور فقہ کو دینی علوم اصطلاحاً بولتے ہیں، اس سے یہ مقصد نہیں کہ تجارت، صنعت وحرفت، زراعت اور رفاعی علوم۔ دینی نہیں ہیں۔ مسلمانوں کو وہ تمام علوم سیکھنے چاہئیں جو ترقی، اور حکومت وسلطنت کے لئے ضروری ہیں۔

اس بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

جدید تعلیم یافتہ حضرات کا یہ خیال ہے کہ علم دین دنیاوی ترقی سے مانع ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ اس کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ حضرت صحابہ کرام نے جو دنیوی ترقی کی، یورپ بھی اس کو حیرت اور استعجاب کی نظر سے دیکھتا ہے اگر کتاب وسنّت اور علم شریعت ترقی کا مانع ہوتا تو حضرات صحابہ کبھی اس طرف نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھتے اور قیصر وکسریٰ کا تختہ اُلٹنے کے لئے ان کے قدم نہ اُٹھتے۔ تفصیلی جواب یہ ہے کہ دنیاوی ترقی کا دارومدار چار چیزوں پر ہے، ایک زراعت دوم صنعت وحرفت، سوم تجارت، چہارم اجارہ یعنی ملازمت، اس وقت تمام حکومتوں کا پہیہ ان ہی چار چیزوں پر گھوم رہا ہے۔

شریعت نے ان میں سے کسی چیز کو بھی منع نہیں کیا بلکہ ان تمام اُمور کو مسلمانوں کے لئے

فرض علی الکفایہ قرار دیا کہ اگر بستی کے تمام مسلمان زراعت یا صنعت و حرفت کو ترک کر دیں تو سب گنہ گار ہوں گے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کسب معاش میں مختلف طریقے رہے ہیں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام زراعت فرماتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اُجرت پہ بکریاں چراتے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام زرہیں بناتے تھے تاکہ جہاد میں دشمن کے وار سے بچاؤ ہو سکے۔

قرآنِ کریم میں ہے :-

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم واٰخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم۔

اور کافروں سے لڑائی اور مقابلہ کے لئے جو قوت اور طاقت تم فراہم کر سکتے ہو وہ کر گزرو مثلاً گھوڑے پالو اور ہتھیار جمع کرو۔ غرض یہ کہ اتنی قوت جمع کرو کہ جس سے تم اللہ کے دشمنوں کو مرعوب اور خوف زدہ بنا دو اور دوسری حکومتوں پر بھی اپنا رعب جما دو کہ جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ ان کو جانتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانوں تم پہ کافروں سے جہاد فرض ہے اور سامانِ جہاد کا فراہم کرنا بھی تم پہ فرض ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گھوڑے کی سواری اور شمشیر زنی اور تیر اندازی سامانِ جہاد تھا اور آج کل بندوق اور توپ اور ہوائی جہاز اور آبدوز کشتیاں وغیرہ سامانِ جہاد ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے سامان کی فراہمی بھی اس آیت کے تحت داخل ہو گی اور عین منشا خداوندی ہو گی۔

تیر اور تلوار کا بنانا اور تیر اندازی کی مشق کرنا۔ گھوڑوں کو جہاد کے لئے تیار کرنا۔ دشمنوں کے مقابلہ کے لئے خندقیں کھودنا اور جنگ میں منجنیق کا استعمال کرنا، ان تمام امور کی ترغیب

اور تاکید احادیث میں بکثرت آئی ہے۔ ان سب آیات اور احادیث کا مطلب ہی یہ ہے کہ دشمنانِ خدا کے مقابلے اور مقاتلے کے لیے جس قدر مادی طاقت اور قوت فراہم کرسکو اس میں دریغ نہ کرو۔

ان دو سو سال میں اسلامی حکومتوں پر جو زوال آیا اس کا بڑا سبب اعدوالھم مااستطعتم کے حکم سے غفلت ہے۔ اگر اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کرتے تو ذلت کے یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ترقی کا دارومدار جن امور پر ہے شریعت نے خود ان کی تاکید اکید کی ہے۔ انگریزی تمدن اور نصرانی وضع قطع پر ترقی موقوف نہیں۔ اور اے میرے عزیزو یہ خوب سمجھ لو کہ شریعت نے بلاشبہ جہاد اور قتال کا حکم دیا اور اسلامی حکومت اور سلطنت حاصل کرنے کی تاکید اکید کی مگر مقصود خود سلطنت نہیں بلکہ مقصود بالذات دین ہے اور سلطنت اس کی حفاظت کے لیے ہے۔

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔

مسلمانوں کو اگر ہم زمین میں قوت اور اقتدار عطا کریں یعنی بادشاہی اور فرماں روائی ان کو عطا کریں تو یہ صحابہ کی جماعت خاص طور پر اقتدار ملنے کے بعد خدا سے غافل نہ ہوں گے بلکہ نماز کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور دوسروں کو اچھی بات کا حکم دیں گے اور ہر بری بات سے منع کریں گے اور ہر کام کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے''

یہ پوری بحث والد صاحب مرحوم کے ایک رسالہ " احسن التفہیم لمسئلۃ التعلیم" سے ماخوذ ہے۔ یہ رسالہ وفات سے تقریباً دو سال قبل طبع کرایا۔
اس رسالہ کے علاوہ نصاب تعلیم کے بارے میں والد صاحب کی اور بھی تحریریں

ہیں۔ان کی ایک رائے اور خواہش یہ بھی تھی کہ عام مروج درسِ نظامی سے ہٹ کر ایک ایسا مختصر اور آسان نصاب رائج ہونا چاہیے جس سے اسلام کے بنیادی عقائد اور احکام کا علم ہو جائے اور جو ہر شخص گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے یومیہ کی تعلیم سے صرف چند ماہ میں اسے پڑھ سکے۔اس طرح کا نصاب انھوں نے خود مرتب کیا تھا، اور اس میں شامل تمام کتابیں اردو کی ہیں، کوئی عربی کتاب نہیں۔اور نہ ہی ایسی کوئی کتاب ہے جس سے فقہی مسالک کے اختلاف کی کوئی الجھن پیدا ہو۔

تحریکِ پاکستان سے وابستگی

مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان پاس ہوئی، اور اس کے بعد پورے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک قائم کرنے کی تحریک شروع ہوگئی۔ ۱۹۴۵ء تک اس تحریک نے ہمہ گیر صورت اختیار کرلی اور آسام سے لے کر درۂ خیبر تک ہر صوبے میں یہ تحریک عروج پر پہنچ گئی۔ ۱۹۴۵ء ہی میں کلکتہ میں مسلم لیگ کی حمایت کے لئے برّصغیر کے ان تمام علماء اور مشائخ نے مل کر جمعیتہ علمائے اسلام کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ علّامہ شبیّر احمد عثمانی کو صدر منتخب کیا گیا۔ اور اس طرح برّصغیر کے وہ تمام علماء جو کانگرس کے نظریۂ متّحدہ قومیت کے خلاف، اور دو قومی نظریے کے قائل تھے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے۔

والد صاحب بھی دو قومی نظریے کے زبردست حامی تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے ماحول پر مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کا زیادہ اثر تھا، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اکثر اساتذہ، اور طلبہ مسلم لیگ کے خلاف، اور کانگریس کے حامی تھے۔ اور صورت ایسی تھی کہ کھل کر مسلم لیگ، قائداعظم، اور دو قومی نظریے کی بات کرنا بہت مشکل مرحلہ بن گیا تھا۔ لیکن والد صاحب برملا ایک قومی نظریے کی تردید اور دو قومی نظریے کی حمایت کرتے، دورانِ درس کئی بار مولانا ابوالکلام آزاد کا رد کیا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں دیوبند میں مسلم لیگ کا عظیم الشان جلسہ ہوا، سردار عبدالرب نشتر مرحوم اس میں شرکت کے لیے دیوبند آئے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے سردار نشتر کے اعزاز میں ضلع کے مسلم لیگی زعمار کی دعوت کی، والد صاحب بھی شریک تھے۔ اس موقع پر والد صاحب نے سردار نشتر کو مخاطب کر کے ایک شعر کہا:

عبدِ ربّم بہرِ کافر نشترم
دستِ اخواں، بہرِ اعدا خنجرم

۱۹۴۷ء میں پاکستان عالم وجود میں آگیا، تقریباً ہر مسلمان خاندان کے کچھ نہ کچھ افراد نے بھارت سے پاکستان ہجرت کی۔ ہم لوگ دیوبند میں تھے۔ ملک کی تقسیم عمل میں آتے ہی ہر طرف فسادات کی آگ بھڑک اٹھی، ہندو اپنے اصل روپ میں ظاہر ہو گیا، کچھ وقت کے لیے اس نے منافقت اور عیّاری کی وہ دبیز چادر اتار دی جو ہمیشہ اس کے چہرہ پر رہتی ہے۔ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر تو وہ قیامت ٹوٹی جس نے ہلاکو اور چنگیز خاں کی داستانوں کو لوگوں کے دلوں سے دھندلا کر دیا۔ بہار، اڑیسہ، دہلی، میرٹھ، بمبئی، ناگپور کوئی علاقہ ایسا نہ بچا جہاں امن کے دیوتاؤں، اور عدم تشدد کا پرچار کرنے والوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی نہ کھیلی ہو۔

ان خوں چکاں ہنگاموں میں والد صاحب نے پاکستان آنے کا ارادہ نہ کیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی تقسیم ہند سے دو ہفتے قبل کراچی آگئے تھے، انھوں نے بھی بارہا پیغامات بھجوائے کہ آپ پاکستان آجائیں مگر والد صاحب نے ترکِ وطن کا ارادہ نہ کیا، ایک سال بعد سقوطِ حیدرآباد دکن کا سانحہ پیش آیا۔ اس نے بھارتی مسلمانوں پر ایک اور ضرب لگائی۔ اسی طرح ہندو سامراج کو غالب آئے دو برس گزر گئے۔ اس دو برس میں ہندوؤں نے مسلم تہذیب و تمدن کو مٹانے، اور مسلمانوں کی نئی نسل کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لئے اتنی کوشش کی جو انگریز ۱۹۰ برس میں نہ کر سکا تھا۔ دو ہی سال بعد سکولوں میں پڑھنے والے

بچوں کے طور طریقے بدل گئے۔ سلام کی جگہ آداب نے لے لی۔ مسلمان بچے تو بچے بڑے لوگ بھی ہندوانہ طریق پر دونوں ہاتھوں سے ڈنڈوت کرنے لگے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر والد صاحب نے بھارت میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا، اور حتمی طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ اب پاکستان چلے جائیں گے۔

بارہا اس بات کا اظہار کیا کہ: میں فسادات سے کبھی خائف نہیں ہوا مگر اب تعلیم اور تربیت کا جو رنگ دیکھ رہا ہوں، اس سے یہ اندیشہ ہے کہ اس سرزمین میں دین کی سلامتی مشکل ہو جائے گی۔ انگریز نے مسلمانوں کا جتنا ذہن ایک صدی میں تبدیل کیا ہندو پچیس برس میں اتنا ذہن بدل دے گا۔

چنانچہ مئی ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم دیو بند سے استعفیٰ دے دیا۔ اور دارالعلوم دیو بند کو بادلِ ناخواستہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر اپنے آبائی وطن کاندھلے چلے گئے۔

دارالعلوم کو چھوڑنے کی خبر بھارت کے تمام شہروں، اور علمی اداروں کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان پہنچی۔ بھارت کے مختلف تعلیمی اداروں نے آپ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، مگر آپ نے ان کو یہی لکھا کہ میں نے اب بھارت میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے، اگر رہتا تو دارالعلوم سے ترکِ تعلق ہرگز نہ کرتا۔

★ دارالعلوم ہاٹھ ہزاری چاٹگام سے دعوت:

مشرقی پاکستان میں والد صاحب کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی، بے شمار احباب اور ساتھی بھی تھے۔ وہاں اہلِ علم کو دارالعلوم سے ترکِ تعلق کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ دارالعلوم ہاٹھ ہزاری چاٹگام مشرقی پاکستان کا قدیم اور بہت بڑا مدرسہ تھا، انھوں نے لکھا کہ آپ شیخ الحدیث کی حیثیت سے ہمارے ہاں تشریف لے آئیں۔ ایک ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ ہوگا اور رہائش مدرسہ کے

کے ذمّے ہوگی۔

۱۹۴۹ء میں ایک ہزار روپے ماہانہ بہت بڑی بات تھی۔ مگر والد صاحب نے کبھی مالی منفعت پر نظر نہیں کی، وہ ہمیشہ علمی اور دینی ماحول کے متلاشی رہے، انھوں نے چاٹگام والوں سے معذرت کردی، اور گھر والوں سے کہنے لگے کہ میں نے مغربی پاکستان جانے کا ارادہ کیا ہے۔ اور اپنے اللہ سے یہی دعا مانگی ہے کہ وہ میرے لئے مغربی پاکستان میں کوئی صورت پیدا کردے۔ مجھے دین کی خدمت کا موقع مل جائے کہ کسی کی احتیاج نہ رہے، اور جب تک زندگی ہے اللہ کے بندوں کو اللہ کا اور اس کے رسول کا پیغام سناتا رہوں۔

خدا نے آپ کی دعا قبول کی۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں وزارتِ تعلیم ریاست بھاولپور کا مراسلہ ملا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی کو جامعہ عباسیہ کا رئیس الجامعہ اور آپ کو شیخ الجامعہ (پرنسپل) مقرر کیا گیا ہے، منظوری سے اطلاع دیں تاکہ آپ کو پاکستان بلانے کا انتظام کیا جاسکے۔ والد صاحب نے منظوری کا خط لکھدیا، اور ۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہم لوگ پاکستان کے لئے روانہ ہوگئے۔

اس وقت تک امرتسر والا راستہ مامون نہ تھا، اس لئے والد صاحب نے بمبئی کے راستے کراچی آنے کا عزم کیا۔ بمبئی کا راستہ اختیار کرنے میں ایک غرض یہ بھی تھی کہ ذاتی کتب خانہ ساتھ لاسکیں۔ چنانچہ آپ نے پہننے کے کپڑوں کے علاوہ گھر کا سارا سامان چھوڑ دیا مگر تمام کتابیں لکڑیوں کی پیٹیوں میں بند کر کے پہلے بمبئی روانہ کیں، اور بحری جہاز کے ذریعہ کراچی بھجوائیں۔ ہم لوگ بھی بمبئی سے کراچی بحری جہاز سے آئے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہم لوگ کراچی پہنچے، اور آپ کی پاکستان آنے کی خواہش پوری ہوئی۔

★ جامعہ عباسیہ بھاولپور سے وابستگی:

۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو شیخ الجامعہ کی حیثیت سے آپ نے چارج لیا،

جامعہ عباسیہ کا ماحول نہ تو دینی مدارس کی طرح تھا، اور نہ کالجوں کی طرح۔ دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کے اختلاط نے وہاں کے ماحول سے وہ للّٰہیت اور ذہنی یکسوئی ختم کردی تھی جو دینی مدارس کا خاصہ تھی۔ آپ ابتدا سے دینی اور دنیوی تعلیم کے اختلاط کے خلاف تھے۔ نظریاتی طور پر آپ اس بات کے قائل تھے کہ دارالعلوم، اور علی گڑھ کے طرز پر جو درسگاہیں قائم ہوں گی، وہ کامیاب ہوں گی، اور جہاں امتزاج و اختلاط کا تجربہ کیا جائے گا، وہ خاطر خواہ نتائج پیدا نہ کرسکے گی۔

جامعہ عباسیہ میں جو حضرات تدریسی خدمات پر مامور تھے، ان میں سے اکثر علم اور دین کی خدمت سے زیادہ تنخواہوں کے اسکیل اور ایک دوسرے سے مسابقت میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس صورتِ حال نے والد صاحب کو جامعہ عبّاسیہ سے دل برداشتہ کیا، اور تمام تر ظاہری اور مادی مراعات اور سہولتیں حاصل ہونے کے باوجود وہاں سے طبیعت اُکتا گئی۔

★ جامعہ اشرفیہ لاہور سے تعلّق :

۱۹۵۱ء کے اوائل میں جامعہ اشرفیہ لاہور کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ والد صاحب بھی تشریف لائے۔ جامعہ اشرفیہ کے بانی اور مہتمم مفتی محمد حسن صاحب نے والد صاحب کی تقریر سنی، تقریر نے ان کے دل میں ایسی کشش پیدا کی کہ جلسہ کے بعد ہی خاص احباب کی مجلس میں فرمانے لگے :۔ کاش مولانا صاحب (مولانا ادریس کاندھلوی) ہمارے مدرسہ میں آجائیں۔ بعض حضرات نے کہا، حضرت! جامعہ عبّاسیہ کی اتنی اچھی، اور بڑی تنخواہ کو چھوڑ کر مولانا یہاں کیسے آسکتے ہیں۔۔! مگر قدرت نے مفتی صاحب کے دل میں ایک جذبہ پیدا کردیا، اور انھوں نے ہر حال میں والد صاحب کو جامعہ اشرفیہ میں بلانے کا عزم کرلیا۔

جلسہ ختم ہوگیا، والد صاحب بہاولپور چلے گئے۔ چند روز گزرے تھے کہ مفتی صاحب

کے منتوسلین میں سے ایک صاحب نے خواب دیکھا کہ !

"علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد مدنی، اور بعض دیگر بزرگ دارالعلوم دیوبند میں جمع ہیں، اور یہ مشورہ کر رہے ہیں کہ پاکستان بن گیا، وہاں علم دین کی تبلیغ کے لئے علماء کی ضرورت ہے، دارالعلوم سے کس کو تبلیغ دین کے لئے پاکستان بھیجا جائے۔ حضرت مدنی اور علامہ عثمانی نے مولانا ادریس کو منتخب کیا، اور اس کے بعد حضرت مدنی اور علامہ عثمانی۔ مولانا ادریس کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ حضرت مدنی، مولانا کو لاہور کی سرحد پر چھوڑ کر واپس چلے گئے اور مولانا عثمانی پرانے جامعہ اشرفیہ کے صحن تک آئے اور وہاں مولانا کو کھڑا کر کے چلے گئے۔"

یہ خواب مفتی محمد حسن صاحب نے سب حضرات سے بیان کیا، اور فرمانے لگے کہ: مولانا کا اب لاہور آنا مقدر ہو چکا ہے، میں ان کو جامعہ اشرفیہ میں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ چنانچہ مفتی صاحب نے والد صاحب کو بہاول پور خط لکھا۔ خط بہت مختصر تھا، اور اس میں مفتی صاحب کا ایک فقرہ عجیب تھا۔ لکھا: "میں آپ کو پلاؤ اور بریانی چھوڑ کر دال روٹی کی دعوت دے رہا ہوں۔"

والد صاحب نے جواب میں لکھا کہ: یہاں کے پلاؤ زردے کے مقابلے میں مجھے جامعہ اشرفیہ کی دال روٹی منظور ہے۔

جس وقت والد صاحب نے بہاول پور میں لوگوں سے اس امر کا اظہار کیا کہ میں نے جامعہ عباسیہ چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تو لوگ حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے۔ لوگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ جہاں آنے کے لئے لوگ خواہشیں اور کوششیں کرتے ہیں، اسے یہ چھوڑ کر کیسے جا رہے ہیں۔

سید حسن محمود ریاست کے وزیر تعلیم تھے، جب والد صاحب نے ان سے اجازت

چاہی کہ میں جامعہ عباسیہ چھوڑنا چاہتا ہوں تو وہ بھی حیران ہوتے ہوئے کہنے لگے: مولانا ہم تو آپ کے لئے کوٹھی بنوا رہے ہیں، جامعہ کی نئی بلڈنگ بن رہی ہے[1] ایک گاڑی بھی خرید رہے ہیں، اور آپ چھوڑنے کی سوچ رہے ہیں۔؟

والد صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا، اور معذرت کی کہ میں جو توقعات لے کر یہاں آیا تھا، وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتیں، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ بخاری اور بیضاوی پڑھا دوں، لوگوں کو وعظ و نصیحت کر دوں، اس کے علاوہ میرے ذمّے کوئی انتظامی جھگڑا نہ ہو، مجھے تنخواہ کی کمی بیشی سے کوئی بحث نہیں ہے۔

بالآخر ۶ اگست ۱۹۵۱ء کو والد صاحب جامعہ عبّاسیہ بہاول پور سے استعفیٰ دے کر جامعہ اشرفیہ لاہور آ گئے۔ اور زندگی کے آخری لمحہ تک جامعہ اشرفیہ سے آپ کا تعلق باقی رہا۔

اگر والد صاحب کی تدریسی زندگی کا احاطہ کیا جائے تو خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ آپ نے اپنی عمر عزیز کے چوہتّر (۷۴) میں سے ۵۳ برس قرآن و حدیث کی تدریس میں گزارے۔

۱۹۲۱ء	۱۹۲۲ء	مدرسہ امینیہ دہلی
۱۹۲۲ء	۱۹۲۹ء	دارالعلوم دیوبند۔ (دورِ اوّل)
۱۹۲۹ء	۱۹۳۹ء	حیدرآباد دکن
۱۹۳۹ء	۱۹۴۹ء	دارالعلوم دیوبند۔ (دورِ ثانی)
۱۹۴۹ء	۱۹۵۱ء	جامعہ عباسیہ بہاول پور
۱۹۵۱ء	۱۹۷۴ء	جامعہ اشرفیہ لاہور

---

[1] جامعہ عباسیہ کی اُسی بلڈنگ میں اب جامعہ اسلامیہ ہے، جسے یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

ایک قومی نظریے کی مخالفت

جیسا کہ میں نے "تحریک پاکستان سے وابستگی" عنوان کے تحت مختصراً ذکر کیا کہ والد صاحب ابتداء ہی سے تحریک پاکستان سے وابستہ تھے۔ عام مجالس، اور تحریر و تقریر کے علاوہ درس میں بھی جب کفار سے جہاد و قتال کی آیات آتیں تو ایک قومی نظریے کا خوب کھل کر رد کرتے۔ مستقل دو کتابیں دستور اسلام، اور نظام اسلام اسی موضوع پر لکھیں۔ حتیٰ کہ معارف القرآن، اور سیرۃ المصطفیٰ میں بہت سے مقامات پر مختلف آیات کی تفسیر کے ذیل میں ایک قومی نظریے کی تردید کی۔

سیرۃ المصطفیٰ میں "جہاد" کے موضوع پر بہت طویل کلام کیا ہے۔ جہاد کی حقیقت اور غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے جو جنگ کی جائے اس کا نام جہاد ہے، اور وطنی کافروں کے ساتھ مل کر غیر وطنی کافروں سے بلا لحاظ اسلام محض وطن کی آزادی کے لئے جنگ کرنے کا نام ہرگز جہاد نہیں۔ حضرات انبیائے کرام نے اپنے ہم وطن کافروں سے نہ کبھی اتحاد کیا اور نہ ان کے ساتھ مل کر کوئی مشترک حکومت بنائی بلکہ اپنے اصحاب کو لے کر ہجرت فرمائی، اور اپنی قوم کے کافروں سے ہٹ کر اپنا الگ ٹھکانہ بنایا، اور جہاد کی تیاری کی، اور سب سے پہلے اپنی کافر قوم پر حملہ آور ہوئے۔ اور اس کو فتح کیا۔ پھر

رسول نے سب سے پہلے اپنی قوم کے کافروں سے جہاد کیا۔ غیر قوم کے کافروں سے بعد میں جہاد کیا۔ حضور پر نور کے تمام غزوات اور جہادات اپنی ہی قوم اور اپنے ہی خویش واقارب اور اپنے ہی اعزا و احباب سے ہی تو تھے، کسی غیر ملکی اور اجنبی قوم سے تو نہ تھے۔ جنگِ بدر میں مہاجرین کے سامنے کسی کا باپ تھا، کسی کا بیٹا اور کسی کا بھانجا اور بھتیجا۔ کسی کا ماموں اور کسی کا چچا۔ عام رشتہ دار تو سبھی تھے۔ محض اللہ اور اس کے رسول کے دین کے لئے صحابہ کی تلوار اپنے ہی عزیز واقارب پر چل رہی تھی۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"میرے دوستو۔ اور عزیزو۔! قومیت اور وطنیت ایک فتنہ ہے، بت پرستی کے بعد قوم پرستی اور وطن پرستی کا درجہ ہے۔ کُفرٌ دون کفرٍ شِرکٌ دون شرکٍ وظلمٌ دون ظُلم کا مصداق ہے۔ انما المؤمنون اخوۃ، اور ان الکافرین کانوا لکم عدوًّا مبینًا کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اپنا بھائی، اور کافروں کو اپنا دشمن سمجھو۔"

"سیرۃ المصطفیٰ" میں ایک مستقل عنوان باندھا "قوم پرستوں کا مغالطہ" اس عنوان کے تحت عقلی انداز میں ایک قومی نظریہ کا رد کرتے ہیں:

"قوم پرستوں کا یہ کہنا کہ ایک وطن اور ایک ملک کے باشندے، ایک قوم ہیں۔ یہ ان کا محض ایک مغالطہ اور دھوکہ ہے، اس گروہ کا ایک خاص نظریہ اور خاص عقیدہ ہے۔ جو شخص اس عقیدے اور نظریے میں ان کا موافق اور ہم خیال ہے۔ وہ ان کا دوست ہے اگرچہ وہ دوسرے ملک اور دوسرے وطن کا باشندہ ہو۔ اور جو شخص اس نظریے اور اس عقیدے میں ان کا مخالف ہو، وہ ان کا دشمن ہے، اگرچہ وہ ان کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔"

مشرق اور مغرب کے باشندے جو اشتراکی عقیدہ رکھتے ہوں، وہ دونوں

باوجود بعد المشرقین کے قریب اور ایک ہیں۔ اور دو حقیقی بھائی ایک گھر کے رہنے والے، اگر مختلف المسلک ہوں تو وہ دونوں ایک دوسرے سے غایت درجہ بعید ہیں۔ معلوم ہوا کہ اتحاد کا دارومدار وطنیت اور قومیت پر نہیں بلکہ اتحاد کا مدار مسلک کے اتحاد پر ہے۔ پس اگر شریعت اتحاد اور اخوت کا مدار اسلام اور کفر کو قرار دیتی ہے تو اس کو تعصب اور تنگ نظری کیوں بتلاتے ہو۔"[1]

اہل سنت والجماعت کے عقائد پر ایک مفصل کتاب "عقائد الاسلام" کے نام سے تالیف کی۔

یہ کتاب حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ کے بعض مکتوبات کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے، اس میں جہاں اہل سنت کے عقائد پر عقلی اور نقلی دلائل سے بحث کی، وہاں کتاب کے آخر میں ایک قومی، اور دو قومی نظریے کو بھی خالص قرآن اور سنت کی روشنی میں پرکھا اور اس کا تجزیہ کیا۔

"فتنہ قومیت متحدہ" ایک مستقل عنوان باندھا اور مختصر مگر محکم اور جچے تلے انداز میں قرآن و سنت کا حکم اور فیصلہ بیان کیا۔

لکھتے ہیں :-

"ایک ملک کے باشندے اور ایک زبان کے بولنے والے، زمانے کی اصطلاح میں اگرچہ ایک قوم کہلاتے ہیں مگر شریعت مطہرہ کی نظر میں قومیت اور اخوت کا دارومدار، ایمان اور کفر ہے۔ شریعت کی نظر میں کافر اور مسلمان دو قومیں علیحدہ ہیں۔ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، اگرچہ ان میں باپ اور بیٹے کا رشتہ ہی کیوں نہ ہو۔

---

(۱)۔ سیرۃ المصطفیٰ۔ ج: ۲، ص: ۱۷، ۱۸، ۱۹۔

مسلمان کے جنازے میں کافر کو حاضر ہونے تک کی اجازت نہیں جیسا کہ قرآنِ حکیم میں آیا ہے :

کسی نبی کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دعا کریں، اگرچہ وہ ان کے عزیز و اقارب ہی کیوں نہ ہوں۔ اس امر کے ظاہر ہونے کے بعد کہ یہ لوگ بلاشبہ اہلِ نار میں سے ہیں (۱)

شریعت نے کافروں سے جہاد فرض کیا، اور صرف ضرورت کے وقت، مصلحت اور ضرورت کی حد تک صلح کی اجازت دی۔ اور صلح کے معنیٰ ترکِ جنگ کے ہیں، نہ کہ اتحاد کے، اس لئے کہ فقہاء نے صلح کا نام موادعت رکھا ہے۔ جو وَدَعَ یَدَعُ سے مشتق ہے، اور اس کے معنیٰ چھوڑنے کے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس سے لڑائی اور کوئی معارضہ نہ کیا جائے۔

قرآن نے کافروں کو اللہ کا اور اس کے رسول کا دشمن بتایا ہے، اور ان سے موالات اور دوستی کرنا جائز قرار دیا ہے۔ اگرچہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ ان احکام کے ہوتے ہوئے کافروں سے اتحاد کب اور کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ ؟

قرآن میں کافروں سے دوستی نہ کرنے کا جو حکم آیا ہے اس کی علت کفر ہے نہ کہ غیر ملکی اور پردیسی ہونا " (۲)

آپ نے بعض تحریروں میں بڑے عالمانہ انداز میں دو قومی نظریے کی وضاحت کی ہے۔ وفات سے ایک سال قبل، ایک مسودہ مکمل کیا۔ اس کا بنیادی موضوع "دو قومی نظریہ اور اسلامی مملکت کا قیام و بقا" ہے۔

سب سے پہلے دو قومی نظریے پر جو عالمانہ استدلال کرتے ہیں، وہ سنیئے :

---

(۱)۔ سورۃ ، آیتہ : ۔

(۲)۔ عقائد الاسلام۔ حصہ دوم۔ ص : ۱۱۲ ، ۱۱۳ ، طبع لاہور ۱۹۷۱ء/۱۳۹۱ھ

" دو قومی نظریے کا اعلان خود قرآن کرتا ہے، قرآن کا ارشاد ہے:۔
وہ ذات پاک ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پس تم میں کافر بھی ہیں، اور
مؤمن بھی اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔"
(سورۃ ، آیتہ :)

"اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو ایک رنگ اور ایک ڈھنگ پر نہیں بنایا، مجموعۂ اضداد و متقابلات بنایا۔ آسمان کو بلند، اور زمین کو پست کیا تاکہ اس کی قدرت کا کمال ظاہر ہو، سارے عالم کو تغیّر و تبدل کے چکّر میں ڈال دیا تاکہ یہ تغیّر و تبدل اور انقلاب اہلِ بصیرت کے لئے دلیل ہو جائے کہ ان تمام مظاہر اور شئون میں کوئی دست قدرت کارفرما ہے۔ یہ ممکن تھا کہ کوئی عالم کو یکساں دیکھ کر اس کو فطرت اور طبیعت کا نتیجہ سمجھ لیتا۔
یہ عالم خیر و شر کا مجموعہ ہے، نور ہو یا ظلمت، طہارت ہو یا نجاست، گلفام ہو یا سیہ فام، ایوانِ صدر ہو یا جیل خانہ، عالم ہو یا جاہل، کوئی چیز اس کے حیطۂ تکوین و تخلیق سے باہر نہیں، اسی طرح مومن و کافر اور ایمان و کفر کو سمجھو۔ زیرِ نظر آیت، سورۂ تغابن کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اوّل آسمان اور زمین یعنی بلندی اور پستی کی پیدائش کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ خدا وہی ہے جس نے تم کو عدم سے نکال کر وجود اور ہستی کا خلعت پہنایا اور طرح طرح کی نعمتوں سے تم کو سرفراز کیا تاکہ تم اپنے خالق اور منعم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔ اور اس کی اطاعت کرو۔ اور اس کی معصیت سے بچو۔ خدا تعالیٰ کی اس ایجاد و تکوین کا حق تو یہ تھا کہ تم سب اس پر ایمان لے آتے لیکن باوجود اس کے تم میں سے بعض اس کے منکر ہوئے اور بعض ایمان لانے والے ہوئے اور اللہ تعالیٰ تمھارے اعمالِ ایمانیہ اور اعمالِ کفریہ سب کو دیکھ رہا ہے۔ ہر ایک کے مناسب اس کی جزا و سزا دے گا۔
" خلاصہ کلام یہ کہ اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے دو قومی نظریے کا واضح الفاظ میں اعلان فرمادیا کہ دنیا میں صرف دو گروہ ہیں، ایک اہلِ ایمان و اہل

اسلام کا ہے، یعنی خدا اور رسول کو ماننے والا گروہ، اور دوسرا گروہ نہ ماننے والوں کا یعنی کافروں کا ہے اور شریعت کے احکام خاص کر ہجرت اور جہاد اسی ایمان اور کفر کی تقسیم پر مبنی ہیں، اور اسلامی اور ایمانی تعلق پر ہے، کسی نسل، نسب وطن، رنگ، اور زبان کی بنیاد پر نہیں۔"

دو قومی نظریے کے ثبوت میں مدلل اور جامع کلام کے بعد ہجرت اور جہاد کے حکم کی مختصر طریقے سے وضاحت کرتے ہیں، دو قومی نظریے پر قرآن حکیم سے واضح استدلال کے بعد ہجرت اور جہاد کے حکم کا ذکر بھی بالواسطہ دو قومی نظریے پر زبردست دلیل ہے۔

اگر مکہ میں ایک ہی قوم آباد تھی اور سب ایک قوم کے افراد تھے تو پھر خدا نے اپنے نبی اور اس کے ماننے والوں کو وہاں سے نکل جانے کا حکم کیوں دیا؟ قومیت کی بنیاد اگر وطن نسل اور علاقہ تھا تو پھر مکہ کے لوگ (حضرت) محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، اور ان کے ساتھیوں کے درپئے آزار کیوں ہو گئے تھے۔ ہر وقت ان کی ایذا رسانی پر کیوں آمادہ رہتے تھے؟ ہجرت اور جہاد کے حکم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"طویل عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ خدا کے کافروں کو آسمانی عذاب سے تباہ و برباد کیا جاتا رہا۔ اس کے بعد ہجرت اور جہاد کا حکم نازل ہوا۔

ہجرت کے معنی یہ ہیں کہ جب دشمنانِ خدا، حق اور اہلِ حق کی عداوت اور ایذا رسانی پر تُل جائیں اور اہلِ حق کو دینِ حق پر رہ کر زندگی گزارنا دشوار ہو جائے تو اس جگہ کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلے جائیں جہاں سکون اور اطمینان کے ساتھ قانونِ شریعت پر عمل کر سکیں اور بلا مزاحمت دینِ حق کی تبلیغ کر سکیں، چنانچہ سرورِ عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ مکہ مکرمہ میں رہ کر دین پہ عمل کرنا، اور دوسروں تک اُسے پہنچانا دشوار ہو گیا تو بحکم خداوندی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی، وہاں پہنچ کر مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور کھلم کھلا اسلام کی دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا اور اسلامی حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا۔

ہجرت کے ایک سال بعد کافروں سے جہاد کا حکم نازل ہوا۔ آنحضرتؐ کی نبوت ورسالت کا آغاز فقیری اور درویشی سے ہوا۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں حضور پُر نور کی حیثیت ایک قلندر شہر کی سی تھی۔ وہاں پہنچ کر خدا نے آپ کو اور اہل اسلام کو شوکت و عزت کی زندگی بخشی۔

اس کے بعد ارادۂ خداوندی ہوا کہ اسلام دنیا میں غالب اور حاکم بن کر رہے۔ کفر اگر اسلام کا تابع اور وفادار بن کر رہنا چاہتا ہے تو رہے مگر دنیا میں غلبہ اسلام اور مسلمانوں کا ہی ہو، اس لئے جہاد کا حکم نازل ہوا۔"

حضور نبی کریمؐ نے اپنی زندگی میں جہاد کیا، اور ایک مضبوط اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اس کو مزید استقامت بخشی اور پھر حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں اسلامی مملکت کی حدود اس حد تک پھیلیں کہ عرب کے علاوہ ایشیا کا وسیع رقبہ، افریقہ، اور یورپ کے بہت سے علاقے اس کا حصہ بنے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ تیس پینتیس برس کی مختصر مدت میں اتنی زبردست اور وسیع حکومت کا قیام کس چیز کی برکت تھی؟ یہ صرف دو قومی نظریہ پر عمل کی برکت تھی، اس کا نتیجہ تھی۔

★ علاقائی عصبیت اور صوبائی خود مختاری، اسلامی وحدت کے خلاف ہے

جب تک مسلمان مسلمان کی حیثیت سے سوچتے رہے، دنیا پر ان کی عظمت و ہیبت قائم رہی اور کسی قوم کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ ان کی وحدتِ ملی اور عظمت قومی کو چیلنج کر سکے مگر جب انھوں نے عربی، ایرانی، مصری، شامی اور ترکی کی حیثیت سے سوچنا شروع کیا تو ان کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی، عظمت و شوکت قصۂ پارینہ بن گئی اور بالآخر بیشتر علاقوں میں انھیں اپنی آزادی تک سے ہاتھ دھونا پڑے۔

آپ علاقائی عصبیت اور صوبائی خود مختاری کو نہ صرف اسلامی وحدت کے سراسر خلاف قرار دیتے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ اپنی آزادی سے ہاتھ دھو کر غیروں اور دشمنوں کی غلامی کا طوق اپنے

"خلافتِ راشدہ اور خلافت بنی امیہ میں اسپین سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک ایک ہی سلطنت تھی، تمام صوبے اور علاقے ایک ہی مرکز کے ماتحت تھے۔ ایشیا کے بیشتر علاقہ افریقہ اور یورپ کے سرسبز خطّے اسلامی حکومت کے صوبے تھے، جو سب ایک مرکز کے تابع تھے۔ خلافت بنی عباس کا دَور آیا۔ ابتداءً اس میں بھی ایسا رہا اور جب تک ایک مرکز رہا، پورا ملک ہر لحاظ سے ترقی کرتا رہا، جب مختلف علاقوں میں نیم آزاد ریاستیں قائم ہوگئیں، ملک اور قوم دونوں میں ضعف آگیا، ملک کی ترقی رک گئی، اسی طرح ہندوستان میں دسویں صدی ہجری تک تمام صوبے اور علاقے ایک مرکز کے تحت رہے، حکومت مضبوط رہی اور کسی دشمن طاقت کو ایک چپّہ ہتھیانے کی جراُت نہیں ہوئی، مگر جب علاقائی حکّام ہوسِ اقتدار میں مبتلا ہوئے تو دشمنوں کو سازوں کی راہ ملی، انھوں نے صوبہ داروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ہر صوبہ، اور ہر علاقہ مرکز سے جدا ہو کر آزاد اور خود مختار ریاست بن جائے، اس طرح ہندوستان میں سینکڑوں ریاستیں اور حکومتیں بن گئیں۔ شاطرانِ مغرب نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کی مرکزی وحدت ختم ہو چکی ہے، تو بعض والیانِ ریاست اور جاگیرداروں کو اپنے ساتھ ملا کر دوسری کمزور اسلامی ریاستوں کو مغلوب کیا، اور انگریز آہستہ آہستہ نظامِ دکن، میر صادق اور میر جعفر جیسے غداروں اور حریص لوگوں کی مدد سے پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔

اس وقت پاکستان میں جو لوگ صوبائی خود مختاری کا نعرہ لگا رہے ہیں، خدا کی قسم یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے ہرگز خیر خواہ نہیں، یہ اپنے چند روزہ موہوم اقتدار کی خاطر مسلمانوں کو غلام اور ان کی عظیم حکومت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔ خوب سمجھ لو۔ یہ لوگ میر جعفر، اور میر صادق کے مثنّیٰ اور جانشین ہیں۔ ان کا ارادہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی حکومت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کردیں۔

صوبائی خود مختاری ایک فریب ہے ؛ اس کی حقیقت اس سے بڑھ کر کچھ نہیں کہ چند حریصانِ اقتدار کی خواہش کے مطابق ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تاکہ اس علاقے کی

زمامِ اقتدار وہاں کے کسی بڑے جاگیردار و سرمایہ دار کے ہاتھوں میں آجائے۔ ظاہر میں یہ خود مختاری ہے مگر اندرونی طور پر، اور بانجام کار کسی کافر یا کافرہ کی غلامی اور ایسی غلامی ہے جس سے چھٹکارے کے لئے صدیوں جان و مال اور عزّت و آبرو کی قربانی دینی پڑتی ہے۔"

بہرکیف آپ نے بڑی شدومد کے ساتھ دو قومی نظریے کی حمایت کی ہے۔ اسلامی حکومت، اس کے قیام، اور ترقی و استقلال کا مدار اسی کو ٹھہرایا ہے اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ جب تک مسلمان، وحدت اسلامی پر قائم رہے۔ ہر اعتبار سے باعزّت اور طاقتور رہے اور جب انھوں نے اپنے آپ کو اسلامی وحدت کے دائرے سے نکال کر صوبائی اور علاقائی عصبیتوں میں بانٹنا شروع کیا، کمزور اور بے وقار ہو گئے۔

دستورِ اسلامی کی تدوین میں حصّہ

دستورِ اسلامی کی تدوین میں حصّہ

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی اسلامی مملکت کا رنگ اُبھرا، تقسیم ملک کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے جس وحشت اور بربریت کا مظاہرہ کیا، اور تاریخ کے صفحات میں جس خونی باب کا اضافہ کیا، اس نے وقتی طور پر مسلمانوں کے فکر و ذہن کو مفلوج کر دیا۔ لیکن جب سات آٹھ ماہ گزر گئے، اور مسلمانوں کو کچھ ہوش آیا تو انھیں فکر ہوئی کہ جس غرض کیلئے پاکستان بنایا تھا، جس کی خاطر لاکھوں مسلمانوں نے جان و مال کی قربانی دی، ہزاروں خاندانوں کی بربادی برداشت کی گئی، اب اس مقصد کو بروئے کار لایا جائے۔ وہ مقصد یہ تھا کہ پاکستان کا دستور، قرآن و سنّت کی اساس پر قائم ہو، اس مملکتِ خداداد کے کروڑوں مسلمان اسلامی نظام کی برکات کا مشاہدہ کریں، اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہوں، اور اس دور کی بھٹکی ہوئی انسانیت کے لئے نشانِ راہ بن سکیں۔

اس جد و جہد کا آغاز سب سے پہلے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے کیا، جو تحریکِ پاکستان

میں قائدِ اعظمؒ کے دست و بازو تھے، اور جنھیں بانیانِ پاکستان میں سے ہونے کا فخر حاصل تھا۔

علاّمہ عثمانی نے چند اہلِ علم و دانش کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان کا دستور کتاب و سنّت کی روشنی میں مرتّب کرنے کے لئے ایک خاکہ تیار کیا جائے جو دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ باہمی مشورے سے اس کام کی انجام دہی کے لئے چار علماء کے نام تجویز ہوئے۔

۱۔ علاّمہ سیّد سلیمان ندوی۔

۲۔ مولانا محمّد شفیع دیوبندی۔

۳۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔

۴۔ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی۔

لیکن اتّفاق سے اس وقت ان میں سے کوئی بھی پاکستان میں موجود نہ تھا سب کے سب بھارت میں تھے۔ ان حضرات کو پاکستان آنے کی دعوت دی گئی، سیّد صاحب تو اس وقت نہ آسکے، باقی تینوں حضرات کام کی اہمیّت کے پیشِ نظر پاکستان آگئے، اور وسطِ ۱۹۴۸ء سے ایک دستوری خاکہ مرتّب کرنے میں مصروف ہو گئے تین ماہ کے مختصر عرصے میں علاّمہ عثمانی کی زیرِ ہدایت دستوری خاکہ مرتّب کیا گیا، باقی حضرات بھارت چلے گئے لیکن مفتی محمد شفیع صاحب کو کراچی روک لیا گیا، کیوں کہ ان کا کام تکمیل کے لئے ان کا پاکستان میں رہنا اشد ضروری تھا۔

علماء، اور ارکانِ دستوریہ کے درمیان اسلامی آئین کے ضامن صرف قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ ہی تھے۔ انھوں نے اگرچہ اپنی ایک ملاقات میں علاّمہ شبیر احمد عثمانی۔ اور ان کے رفیقِ خاص مولانا ظفر احمد عثمانی کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ:

"میں پاکستان کے مقدمے میں مسلمانوں کا وکیل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مقدمے میں کامیاب کیا، انھیں پاکستان مل گیا میرا کام ختم ہوا۔ اب مسلمانوں

کی اکثریت و جمہوریت کو اختیار حاصل ہے کہ جس طرح کا چاہے نظام قائم کرے۔
اور چونکہ پاکستان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے، تو اس کے سوا کوئی دوسری
صورت ہو ہی نہیں سکتی کہ یہاں نظامِ اسلامی قائم ہو۔" (۱)

عوام، اور علماء، دونوں کی امیدیں قائدِ اعظمؒ کی ذات سے وابستہ تھیں، مگر قدرت کو پاکستانی مسلمانوں کا ایک اور امتحان مقصود تھا، قائدِ اعظمؒ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے، علامہ عثمانیؒ نے پاکستان کے دستور کو قرآن و سنت کے سانچہ میں ڈھالنے کے لیے جو ابتدائی کام کیا تھا، اس کو شدید دھچکا لگا۔ لیکن علامہ عثمانیؒ اور ان کے رفقاء اس حادثے سے تھک ہار کر نہیں بیٹھے، انھوں نے اپنا وطن گھر بار، اور عزیز و اقارب، ذاتی اغراض کی خاطر نہیں چھوڑے تھے، وہ اس ملک میں اسی دستور اور اسی نظام کو سربلند دیکھنا چاہتے تھے جس کے نام پر یہ بنا تھا۔ علامہ عثمانیؒ دستور ساز اسمبلی میں اس ارادے کے ساتھ داخل ہوئے تھے کہ اپنی قدرت کی حد تک اسلامی دستور کے لیے کوشش کریں گے۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ اربابِ اقتدار کے مایوس کن طرزِ عمل کے خلاف احتجاجاً مستعفی ہو جائیں۔

ایوانِ اقتدار میں جو لوگ ہر گھڑی اسلام کا نام لیتے تھے، مگر زیرِ زمین ان کی کوششیں یہ تھیں کہ اسلام کو ملکی، سیاسی، اور عملی زندگی میں آنے سے روکا جائے، علامہ کی طبع زیرک اُن سیاستدانوں کے تیور بھانپ گئی تھی، ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے ۹، ۱۰ فروری ۱۹۴۹ء کو ڈھاکہ میں جمعیۃ علمائے اسلام کی ایک کانفرنس بلائی گئی۔ علامہ عثمانی نے بصیرت افروز خطبہ صدارت پڑھا، اور اربابِ حکومت کے عزائم پر سے پردہ اٹھایا۔

لیاقت علی خاں مرحوم، وزیرِ اعظم تھے۔ علامہ عثمانی کو عوام میں جو بے پناہ مقبولیت اور مرکزیت حاصل تھی، انھیں اپنے الیکشن میں اس کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ خدا نے انھیں ایسا سحر آفریں اندازِ خطابت عطا کیا تھا کہ لاکھوں کے مجمع میں آگ لگا دیتے تھے۔ لیاقت علی خاں نے

---

(۱) - تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی۔ طبع ملتان ۱۹۵۶ء۔ ص: ۱۷۹ - ۱۸۱

اندازہ لگا لیا کہ اگر شبیر احمد عثمانی بگڑ گیا تو ملک میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہو گا جسے کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔ اور خود علامہ نے اسمبلی کو یہ چیلنج کیا کہ آپ کھل کر انکار کر دیں کہ ہم اسلامی دستور نہیں بنانا چاہتے ہیں اسمبلی سے استعفا دوں گا اور مسلمانوں کو بتاؤں گا کہ تمھیں دھوکا دیا گیا ہے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر لیاقت علی خاں مرحوم نے علامہ عثمانی سے قراردادِ مقاصد کا مسودہ تیار کرنے کی درخواست کی۔ علامہ عثمانی نے ان کی درخواست پر قراردادِ مقاصد کا مسودہ تیار کیا۔ جو مختصر ہونے کے باوجود انتہائی جامع تھا۔ اربابِ اقتدار کی بحث و تمحیص کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی نے معمولی ترمیمات کے ساتھ پاس کیا۔

قراردادِ مقاصد کی منظوری علامہ شبیر عثمانی کا ایسا کارنامہ تھا جو تاریخ پاکستان میں سُنہری حروف سے لکھا گیا۔

مگر یہ ملک کی بدقسمتی تھی کہ قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد علامہ عثمانی زیادہ دیر اس دُنیا میں نہ رہ سکے کہ ان کی مساعی سے دستورِ اسلامی کی تدوین کے اگلے مراحل طے ہوتے، ابھی بنیادی اصول پر غور و فکر جاری تھا کہ علامہ کی صحت خراب ہو گئی۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو آپ نے جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد، پاکستان کا دستور کتاب و سُنّت کے مطابق بنانا لازمی ہو گیا۔ اس عظیم کام کے لئے ماہرین کی ضرورت تھی، علامہ عثمانی نے ۱۹۴۹ء میں جس بورڈ کی تجویز پیش کی تھی، اربابِ حل و عقد نے اس کی منظوری دے دی، بورڈ کی صدارت کے لئے نظرِ انتخاب قدیم و جدید علوم کے جامع، اور مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ، علامہ سیّد سلیمان ندوی پر پڑی سیّد صاحب اس وقت بھوپال میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدے پر فائز تھے۔

لیاقت علی خاں مرحوم نے سیّد صاحب سے خط و کتابت شروع کی، اسی سال وزیرِ داخلہ خواجہ شہاب الدین حج کے موقع پر خیرسگالی وفد لے کر حجاز گئے۔ سیّد صاحب بھی بھارت سے حج کے لئے وہاں آئے ہوئے تھے، خواجہ صاحب نے وہاں سیّد صاحب سے متعدد ملاقاتیں کیں۔

نگران کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، بالآخر لیاقت علی خاں مرحوم نے مولانا احتشام الحق تھانوی کو سیّد صاحب کو پاکستان آنے، اور تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے بھوپال بھیجا، مولانا احتشام الحق تھانوی اس اہم مشن پر بھوپال گئے اور آپ نے سیّد صاحب کو پاکستان میں دستورِ اسلامی کی تدوین میں تعاون کرنے بلکہ اس کی نگرانی وسر قبول کرنے پر آمادہ کرلیا۔ سیّد صاحب جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے آئے۔

لیاقت علی خاں مرحوم نے مروّجہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ای لا رکمیشن مقرر کیا، جسٹس رشید، جسٹس میمن، اور سیّد صاحب رکن منتخب ہوئے، ماہرِ فقہ ا کی حیثیت سے مفتی محمد شفیع صاحب کو بھی کمیشن کا رکن بنایا گیا۔

لیکن بورڈ کی رپورٹ، اور سفارشات ارباب اقتدار کی طبعِ نازک پر گراں گز انھوں نے اسے رازِ سربستہ بنادیا، اور اتنی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ عمل نہ سہی، کم سے کم ع کی آگاہی کے لئے اس رپورٹ ہی کو شائع کردیا جائے۔ اسلام کے "نام لیواؤں" کا اصل نقد تو "اسلامی اداروں" کی نمائش تھی، ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ نام اسلام کا رہے، مگر کام کوئی اسلام کا نہ ہونے پائے۔ بعض اربابِ اقتدار نے یہ کہنا شروع کیا کہ: بورڈ کوئی معقول اور قابل رپورٹ پیش نہیں کرسکا۔ اخبارات اور علمار نے مطالبہ کیا کہ اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو تعلیمات اسلامی بورڈ کی رپورٹ شائع کی جائے تاکہ عوام خود فیصلہ کرسکیں کہ رپورٹ قابلِ عمل ہے یا نہیں۔ مگر اس سے اسلام کے نام لیواؤں کا بھرم کھل جاتا اس لئے اُسے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ علمار کو یہ بھی طعنہ دیا گیا کہ وہ کسی ایک بات پر متفق نہیں ہیں، اس لئے لوگوں کے سامنے کوئی اسلامی دستوری خاکہ پیش کرنا بے سود ہے۔

علمار نے اس چیلنج کو قبول کیا، مولانا احتشام الحق تھانوی کی مساعی سے کراچی میں مکاتبِ فکر کے علمار کا ایک نمائندہ اجتماع ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء کو منعقد جس میں مشرقی ومغربی پاکستان کے ۳۱ علماء نے شرکت کی۔

اس اجتماع میں والد صاحب بھی شریک ہوئے، اور آئین پاکستان کو قرآن و سنّت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے دوسرے علماء کے ساتھ مل کر بھرپور جد وجہد کی، مختلف الخیال علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا، اور انھیں ایک فارمولے پر متحد کرنا بہت مشکل کام تھا۔ مگر مولانا احتشام الحق تھانوی کی ہمّت بلند نے اس مشکل کام کو آسان بنا دیا، اور وہ ملک کے مختلف الخیال علماء کو یک جا بٹھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس اجتماع میں مشرقی و مغربی پاکستان کے ۳۱ علماء نے شرکت کی اور اس اجتماع کو تمام مکاتبِ فکر کی مکمل نمائندگی حاصل ہوئی:

حسب ذیل علماء نے شرکت کی:

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔	کراچی۔	
۲۔ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔	رکن بورڈ تعلیماتِ اسلام۔	(کراچی)
۳۔ مفتی محمد حسن صاحب۔	مہتمم جامعہ اشرفیہ۔	لاہور
۴۔ مولانا احمد علی لاہوری۔	امیر انجمن خدام الدین۔	〃
۵۔ مولانا اطہر علی۔	صدر جمعیۃ علمائے اسلام۔	مشرقی پاکستان
۶۔ مولانا احتشام الحق تھانوی۔	مہتمم دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار۔	سندھ
۷۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔	شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ۔	بھاولپور
۸۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔	امیر جماعتِ اسلامی پاکستان۔	لاہور
۹۔ مولانا شمس الحق فرید پوری۔	مہتمم مدرسہ اشرف العلوم۔	ڈھاکہ
۱۰۔ مولانا محمد یوسف بنوری	شیخ التفسیر دار العلوم الاسلامیہ۔ ٹنڈو الہ یار	
۱۱۔ مولانا محمد بدر عالم میرٹھی	شیخ الحدیث 〃 〃	〃
۱۲۔ مولانا خیر محمد جالندھری	مہتمم خیر المدارس۔	ملتان
۱۳۔ مولانا شمس الحق، افغانی۔	وزیر امورِ مذہبی،	ریاست قلات
۱۴۔ قاضی عبد الصمد سربازی۔	قاضی	〃 〃

۱۵۔ مولانا ابوجعفر محمد صالح ۔	امیر حزب اللہ،	مشرقی پاکستان
۱۶۔ مولانا حبیب اللہ ۔	مدرسہ عربیہ دار الہدیٰ ٹھیڑی شریف سندھ	
۱۷۔ مولانا محمد صادق ۔	مدرسہ عربیہ مظہر العلوم	کھڈہ ۔ کراچی
۱۸۔ مولانا راغب احسن ۔	نائب صدر جمعیۃ المدرسین سرسینہ شریف مشرقی پاکستان	
۱۹۔ مولانا محمد حبیب الرحمٰن ۔	" "	"
۲۰۔ مولانا محمد علی جالندھری ۔	صدر مجلس احرار اسلام پاکستان ۔	ملتان
۲۱۔ مولانا عبد الحامد بدایونی ۔	صدر جمعیۃ علمائے پاکستان ۔	کراچی
۲۲۔ مولانا مفتی صاحب داد ۔	مدرسۃ الاسلام ۔	کراچی
۲۳۔ پیر محمد ہاشم مجددی ۔	ٹنڈو سائیں ۔	سندھ
۲۴۔ مولانا محمد داؤد غزنوی ۔	صدر جمعیۃ اہل حدیث پاکستان ۔	لاہور
۲۵۔ مولانا محمد اسماعیل ۔	ناظم " " "	"
۲۶۔ مفتی جعفر حسین مجتہد ۔	رکن بورڈ تعلیمات اسلام ۔	کراچی
۲۷۔ مفتی کفایت حسین مجتہد ۔	ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان ۔	
۲۸۔ پیر محمد امین الحسنات ۔	مانکی شریف ۔	سرحد
۲۹۔ حاجی خادم الاسلام محمد امین ۔	خلیفہ حاجی ترنگ زئی ۔	سرحد
۳۰۔ مولانا ظفر احمد انصاری ۔	سکریٹری بورڈ تعلیمات اسلام ۔	کراچی
۳۱۔ پروفیسر عبد الخالق	رکن " " "	"

ملک کے تمام مذہبی مکاتبِ فکر کے اِن مقتدر رہ نماؤں نے متفقہ طور پہ اسلامی مملکت کے لیئے رہ نما بنیادی اصول مرتب کرکے، اتحاد و اتفاق کی بے مثال یادگار قائم کی جس کام کو اربابِ لبست وکشاد، جن کے پاس تمام وسائل کی فراوانی تھی، چار برس کی مدت میں پورا نہ کرسکے۔ ان علمار نے جو تمام تر مادی ذرائع سے محروم تھے، صرف چار روز

میں مکمل کر کے قوم کے سامنے رکھدیا۔

وہ لیڈرانِ قوم جو علمار کو سیاست، اور اُمورِ مملکت سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیتے تھے، وہ علمار کی پیش کردہ بنیادی سفارشات پر چونک گئے، اور مسٹر بروہی جیسے دانشوروں کے لئے بھی، جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ: قرآن میں دستورِ مملکت کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں ہے" غور و فکر کا ایک باب کھل گیا۔ (۱)

مفتی شفیع صاحب، اور والد صاحب نے مستقل رسائل لکھے، والد صاحب نے ایک رسالہ "نظامِ اسلام" کے نام سے اور کتاب "دستورِ اسلام" کے عنوان سے لکھی، ان حضرات کو اگرچہ کسی منظم جماعت کی پشت پناہی، اور اس کے وسائل حاصل نہ تھے، مگر اس کے باوجود انھوں نے ارکانِ اسمبلی کو اتنا مواد بہم پہنچا دیا کہ سردار عبدالرّب نشتر جیسے مخلص افراد نے اسلامی دستور کی ضرورت و اہمیت، اور اس کے دور رس نتائج و ثمرات پر مؤثر اور پُر مغز تقریریں کیں، اور اس حد تک خوش آئند تبدیلی رونما ہوئی کہ وہی مسٹر بروہی جو قرآن میں دستورِ مملکت کی موجودگی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے، انھوں نے وزیرِ قانون کی حیثیت سے اس دستور کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جس میں یہ ضمانت دی گئی کہ: پاکستان میں قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی۔"

والد صاحب نے بے شمار تقریروں کے علاوہ متعدد ٹھوس مضامین، رسائل اور کتابیں تالیف کیں، جن میں اسلامی نظامِ مملکت کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ اس موضوع پر جو سب سے مفصل، اور مدلل کتاب تالیف کی، وہ "دستورِ اسلام" ہے۔

دستورِ اسلامی کی تدوین و نفاذ کے سلسلے میں ہونے والی کوششوں میں اربابِ اقتدار میں لیاقت علی خان پیش پیش تھے، کیونکہ علمار کا متفقہ فارمولا ان کی پیش کردہ قراردادِ مقاصد کے عین مطابق تھا۔ مگر بدقسمتی سے علامہ شبیر عثمانی سے محرومی کے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء میں قوم لیاقت علی

---

(۱)۔ مسٹر بروہی نے اس زمانے میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ: "قرآن میں دستورِ مملکت کے متعلق ایک لفظ بھی موجود نہیں۔"

خاں جیسے مخلص رہنما سے بھی محروم ہو گئی، لیاقت علی خاں مرحوم کی شہادت کے بعد، خواجہ ناظم الدین وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔

خواجہ ناظم الدین اور سردار عبدالرب نشتر جیسے چند ایک رہنماؤں کے سوا، جو ملک، قوم، اور مذہب، سبھی کے لئے مخلص تھے، زمامِ اقتدار ایسے ہاتھوں میں آنا شروع ہو گئی، جو مذہب کو اپنے محلوں سے بہت دُور رکھنا چاہتے تھے، انھیں ملک اور قوم کے مفاد سے زیادہ اپنا ذاتی مفاد عزیز تھا، بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ پاکستان کے انتظامی ڈھانچے پر نوکر شاہی کی گرفت کا آغاز ہو گیا۔

حالات پر یاس کے دبیز پردے گرتے دیکھے تو پھر علامہ عثمانی کے رفقاء سرگرم عمل ہوئے ۱۴، ۱۵ر نومبر ۱۹۵۲ء کو ڈھاکہ مولانا احتشام الحق تھانوی ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ علمائے اسلام کی زیرِ صدارت ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی گئی، اس کانفرنس میں پچاس ہزار علماء اور ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں نے شرکت کی، علماء اور مسلمانوں کے اس عظیم اجتماع نے حکومت کو صاف الفاظ میں بتایا کہ "کوئی ایسا دستور قبول نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے نام پر بنایا گیا ہو، مگر اس کی روح سے خالی ہو"

علماء، اور مسلمانوں کے اس نمائندہ اجتماع سے ایوانِ اقتدار میں زلزلہ آ گیا، کانفرنس ختم ہوتے ہی اگلے روز خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کی طرف سے اکابر علماء کو دعوت نامے جاری کئے گئے، ۱۹ نومبر ۱۹۵۲ء کو حسب ذیل علماء کو گفتگو کے لئے کراچی بلایا گیا:

۱۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ	ڈھاکہ	
۲۔ مولانا اطہر علی	مشرقی پاکستان۔	کشور گنج
۳۔ مولانا محمد داؤد غزنویؒ	صدر جمعیۃ اہلحدیث پاکستان،	لاہور
۴۔ مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی	جامعہ اشرفیہ	لاہور
۵۔ مولانا مفتی محمد حسن رحؒ	"	"

۶۔ مولانا احتشام الحق تھانوی۔ کراچی
۷۔ مولانا شمس الحق فرید پوری۔ ڈھاکہ
۸۔ مولانا خیر محمدؒ جالندھری ملتان
۹۔ مولانا عبد الحق اکوڑہ خٹک
۱۰۔ مولانا دین محمد ڈھاکہ

یہ تمام علماء مقررہ وقت پر رات کے نو بجے (۱۹ نومبر ۱۹۵۲ء) پرائم منسٹر ہاؤس پہنچے، خواجہ ناظم الدین نے باہر آکر علماء کا استقبال کیا۔ مولانا احتشام الحق نے علماء کا تعارف، خواجہ صاحب سے کرایا۔ خواجہ ناظم الدین کے علاوہ اسپیکر لیجسلیٹو اسمبلی مولوی تمیز الدین، سردار عبد الرب نشتر اور ان کے علاوہ دو اور مرکزی وزراء، اور سیکریٹری مذاکرات میں شریک ہوئے۔ گفتگو کا سلسلہ رات کے دو بجے تک جاری رہا۔ سردار نشتر نے وزراء کی ترجمانی کی، اور علماء کی طرف سے زیادہ گفتگو مولانا احتشام الحق کرتے رہے۔ سردار نشتر اور مولوی تمیز الدین نے کتاب و سنّت کے مطابق دستور مرتب کرنے کے سلسلے میں عملی اشکالات پیش کیں، علماء نے ان کے تسلی بخش جواب دیئے۔ اور دستورِ اسلامی کے سیاسی، معاشی، اور اقتصادی فوائد سے آگاہ کیا، تمام گفتگو میں افہام و تفہیم کی فضا قائم رہی۔ آخر میں خواجہ صاحب نے علماء کو یقین دلایا کہ: آپ حضرات بے فکر رہیں "انشاء اللہ علماء، اور عوام کی خواہش کے مطابق آئین بنایا جائے گا" خواجہ صاحب کے اس فقرے پر والد صاحب نے فرمایا: ہماری بھی دعاء ہے کہ خدا آپ کو "ناظم دین" بنائے۔

اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس دستوری رپورٹ کو ۲۲ نومبر ۱۹۵۲ء کو پیش ہونا تھا، اُسے ۲۲ دسمبر تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا، اور پھر ۲۲ دسمبر کو جو دستوری خاکہ اسمبلی میں پیش کیا گیا وہ کافی حد تک اسلامی تھا۔

۱۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو پھر ان علمائے کرام کا کراچی میں اجتماع ہوا جنھوں نے ۲۲ نکاتی فارمولا مرتب کیا تھا۔ اب ۳۱ کے بجائے ۳۳ علماء جمع ہوئے، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا محمد

ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا دین محمد رڈھاکہ کو بھی شریک کیا گیا۔ مولانا بدر عالم مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کے باعث شریک نہ ہو سکے۔

۱۱ جنوری سے ۱۸ جنوری تک نو اجلاس ہوئے، مختلف اجلاس کی صدارت ان حضرات نے کی:

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔

۲۔ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب۔

۳۔ مفتی محمد حسن صاحب۔

۴۔ مولانا ابو الحسنات، سید محمد احمد قادری صاحب۔

۵۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی صاحب،

اس اجتماع میں علمائے کرام نے چند اہم ترمیمات کے ساتھ نئے دستور کی تائید کی۔

(اس کے بعد دستور سازی کن مراحل سے گزری، دستور ساز یہ توڑی گئی، ۱۹۵۶ء کا آئین پاس ہوا، اسے ناکام بنانے کی سازش ہوئی، ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء آیا۔ اور پھر تیرہ برس سے بھی زائد ملک پر غیر جمہوری بلکہ غیر نمائندہ حکومت مسلط رہی۔ یہ ایک طویل داستان ہے، یہاں اس کے بیان کا نہ موقع، اور نہ گنجائش)

بہرکیف جنوری ۱۹۵۱ء سے لے کر زندگی کے آخری مرحلے تک پاکستان میں اسلامی دستور کی تدوین و نفاذ کی کوئی کوشش اور تحریک ایسی نہ تھی جس میں والد صاحب نے حصہ نہ لیا ہو علماء کے تمام مشترکہ اجتماعات میں شرکت کی، اور تحریر و تقریر کے ذریعے ہمیشہ کوشاں رہے کہ اس ملک میں اللہ کا قانون نافذ ہو، اسی کا بول بالا ہو، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان لوگوں کی تسلی کے لئے جن کے دلوں میں دانستہ یا نادانستہ یہ خیال تھا کہ موجودہ حالات میں اسلامی دستور کا نفاذ ممکن نہیں، یا آج کے تغیر پذیر اور ترقی یافتہ معاشرہ میں شرعی قوانین کا اجراء، ماحول پر جمود کی کیفیت طاری کر دے گا، مستقل کتابیں اور رسائل تالیف کئے۔ اس موضوع پر سب سے جامع اور

مدلل کتاب "دستورِ اسلام" لکھی، اس میں مثالوں اور عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ شرعی احکام کے نفاذ سے ترقی رکتی نہیں، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، اور حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں جب من و عن قرآنی دستور نافذ تھا مسلمان ترقی پذیر رہے۔ اسلامی مملکت کے حدود برابر بڑھتے رہے[1]۔ اور پوری دنیا میں مسلمان مذہبی، تمدّنی، سیاسی اور علمی اعتبار سے ایک مقتدر اور باعزّت قوم شمار کئے گئے، اور جب انھوں نے احکامِ الٰہی سے انحراف کیا، ذاتی عیش و عشرت میں پڑ گئے تو سلطنت کے حدود سکڑنے شروع ہو گئے، عزّت و وقار جاتا رہا، اور دوسری قوموں کے سامنے مغلوب بن کر رہ گئے۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں طویل عرصے کے بعد جب فوجی حکومت کا خاتمہ ہوا اور ملک میں جمہوری حکومت برسرِ اقتدار آئی تو ایک مدت تک آئین کے بارے میں کوئی واضح صورتِ حال سامنے نہ آسکی جس کی بنیادی وجہ وہ ابتر اور مایوس کن حالات تھے جو عوامی حکومت کو فوجی حکومت سے ورثے میں ملے تھے۔ یحییٰ حکومت کی ناکامیوں اور خاص طور پر مشرقی پاکستان کے سانحہ نے پوری قوم کو مفلوج کر دیا تھا۔

ان مایوس کن حالات میں بھی علمائے حق نے اپنا مشن جاری رکھا اور وہ برابر عوامی حکومت سے یہ مطالبہ کرتے رہے کہ مسلمانوں کے اس ملک میں جسے دو قومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا تھا، قرآن و سنت کا دستور نافذ ہونا چاہیے۔

آخر کار وہ وقت آپہنچا کہ علماء کی دیرینہ کوششیں بارآور ہوئیں، عوامی حکومت نے علماء اور عوام کی خواہش کی تکمیل کی، اور ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو ایک ایسے آئین کا اعلان کر دیا گیا جو نہ

---

(۱) جب آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اسلامی حکومت کا رقبہ دس لاکھ مربع میل تھا گویا نو برس کی قلیل مدت میں اتنا رقبہ اسلامی حکومت کا حصہ بنا۔ ۲۳ ہجری میں جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو اسلامی مملکت کا رقبہ ۲۵ لاکھ مربع میل تھا۔ اور پھر جب ۳۵ ہجری میں حضرت عثمان غنی کا دورِ خلافت ختم ہوا تو اسی اسلامی حکومت کا رقبہ ۳۵ لاکھ مربع میل تک پہنچ چکا تھا۔

صرف عوامی اُمنگوں کا آئینہ دار تھا، بلکہ اس میں اس بات کی بھی ضمانت دی گئی کہ ملک میں جو قانون سازی ہوگی، وہ قرآن وسنت کے مطابق ہوگی۔ حالانکہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا تھا کہ: "قرآن وسنت کے خلاف کوئی آئین نہیں بنایا جائے گا" یہ ایک منفی انداز، اور منفی تعریف تھی، موجودہ دستور میں اس سے گریز کر کے مثبت انداز اختیار کیا گیا، نیز یہ بات بھی بڑی اہم تھی کہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خاں مرحوم نے دستور ساز اسمبلی میں جو قرار دادِ مقاصد پیش کی تھی اُسے موجودہ آئین میں شامل کیا گیا۔

بھارت کی سازش کے باعث مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا والد صاحب کو جو شدید صدمہ تھا، اس کا اندازہ شاید دوسرے لوگ نہ لگا سکیں۔ والد صاحب کا یہ معمول تھا کہ وہ اخبار کی صرف چند اہم سرخیاں دیکھ لیتے تھے، کوئی بہت ہی غیر معمولی خبر ہوئی تو اس کی تفصیل پڑھ لی، شام کو میں حاضر ہوتا تو پھر مجھ سے پوری تفصیلات معلوم کرتے، اپنی رائے اور تاثر ظاہر کرتے، مجھے اندازہ ہے کہ انھیں ۱۹۷۱ء کے واقعات کا کتنا صدمہ تھا۔

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جب مغربی محاذ پر جنگ کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے میں نے والد صاحب کو خبر سنائی، میں گھر سے باہر تھا، چھ بج کر چند منٹ پر واپس آیا، آتے ہی ریڈیو کھولا، انگریزی خبریں ہو رہی تھیں، اس میں مغربی محاذ پر جنگ شروع ہونے کی خبر تھی۔ میں نے اسی وقت جا کر والد صاحب کو اطلاع دی کہ لاہور کے محاذ پر بھی جنگ شروع ہوگئی ہے، کافروں سے جہاد کا خاص جذبہ تھا، لیٹے ہوئے تھے، فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے، سب سے پہلے "الحمدللہ" کہا، مگر چند لمحے بعد ہی کہنے لگے کہ: "اس وقت جو طبقہ برسرِ اقتدار ہے، اور جن کے ہاتھوں میں زمامِ اختیار ہے، ان سے ڈر لگتا ہے، کہیں خدانخواستہ قوم کو دھوکہ نہ دیں۔" یہ بات بہت ہی دکھ بھرے لہجے میں کہی، لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ اس وقت جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ مستقبل کی ایک تلخ حقیقت ہے، جس کا عکس ان کے دل و دماغ پر پڑ رہا ہے، سانحۂ بنگال کے بعد مہینوں یہ حالت رہی کہ اُٹھتے بیٹھتے اس طرح بے ساختہ "اناللہ" پڑھتے، جیسے کسی بہت ہی عزیز اور

محبوب انسان کی موت پر پڑھی جاتی ہے۔
اعلان تاشقند کا بھی والد صاحب کو بہت صدمہ ہوا تھا، اسی طرح ہفتوں اور مہینوں، "اناللہ" پڑھتے رہے۔ مگر بنگال کے سانحہ نے انھیں بہت ہی نڈھال کر دیا تھا کئی بار یہ الفاظ منہ سے نکلے: "اس حادثے نے تو بالکل کمر ہی توڑ دی" وہ ایک طرف جہاں چند خود غرض اور مفاد پرست افراد کو اس تمام قصے کا ذمہ دار ٹھہراتے وہاں برملا یہ بھی کہتے کہ: جتنے ذمہ دار چند افراد ہیں، اس سے کہیں زیادہ ذمہ دار خود بنگالی ہیں۔ جامعہ اشرفیہ میں بیس سے زائد بنگالی طلبہ زیر تعلیم تھے، انھیں کئی بار ڈانٹا، ایک بار کہنے لگے: تمھارے لیڈر خود تمھارے دشمن ہیں جو تمھیں گمراہ کر رہے ہیں کہ تم پر پنجابی حکمران ہیں، فرمایا: اوّل تو یہ بات بالکل حقیقت کے خلاف ہے، اور اگر مان لو کہ ٹھیک ہے تو پھر فیصلہ کرو کہ پنجابی مسلمانوں کی غلامی زیادہ بہتر ہے یا اندرا گاندھی کی ---؟ فرماتے: کہ اگر کوئی شخص مجھ سے کہے کہ افریقہ کے کسی سیاہ فام اور انتہائی غیر مہذّب مسلمان کی غلامی قبول کرتے ہو یا بھارت کے کسی مہذب ہندو کی، یا انگلستان کے سفید فام عیسائی کی، تو میرا فیصلہ یہ ہوگا کہ افریقہ کے سیاہ فام حبشی مسلمان کی غلامی قبول ہے اور کسی ہندو یا عیسائی کے ساتھ رہنا بھی گوارا نہیں۔ اکثر لاہور کی خوبیاں بیان کرتے، اور سب سے بڑی خوبی یہ بیان کرتے کہ یہاں کسی کافر کی شکل نظر نہیں آتی۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت

حالات کے قدم آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ملکی آئین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے، اور خلاف اسلام دفعات کو کتاب و سنّت کے مطابق بنانے کے لئے حکومت نے عملی قدم اُٹھایا، اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔
۲۲ دسمبر ۱۹۷۳ء کی ایک سرد سات تھی، گیارہ بجے شب اسلام آباد سے ناچیز کو

مولانا کوثر نیازی کا پیغام ملا کہ "میں کل صبح خیبر میل سے لاہور پہنچ رہا ہوں، ریلوے اسٹیشن پر مجھ سے ضرور ملیں" مولانا حج وفد کے کر حجازِ مقدس جا رہے تھے، صبح ریلوے اسٹیشن پر گیا، مولانا سے ملاقات ہوئی، کہنے لگے۔

"میں نے آپ کو اس وقت خاص طور سے اس لئے بلایا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں مولانا کاندھلوی کی شرکت بہت ضروری ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھیں حق گوئی سے نہ کوئی بھاری بھرکم شخصیت روک سکتی ہے اور نہ وہ کسی دباؤ کے آگے جھک سکتے ہیں، وہ جو بات کہیں گے وہ صحیح معنی میں قرآن و سنّت کی ترجمان ہوگی، نیز ان کی شخصیت اس بات سے بھی ہمیشہ بلند رہی ہے کہ انھوں نے کوئی بات کہتے، یا لکھتے وقت کسی فرد، جماعت، یا طبقے کا ادنیٰ مفاد بھی ملحوظ رکھا ہو۔"

میں نے عرض کیا کہ والد صاحب ایک عرصہ سے بیمار ہیں، طبعی ضعف بھی ہے، اس کے علاوہ وہ سرکاری مجالس میں شرکت سے ہمیشہ گریزاں رہے، صرف مسجد و منبر سے ہمیشہ حق بات کہتے رہے ہیں، وہ یقیناً اس کی رکنیت قبول کرنے میں متأمل ہوں گے۔

مولانا نے میرے جواب میں فرمایا:

"کہ مجھے بھی مولانا کے مزاج کا علم ہے، میں بخوبی جانتا ہوں کہ وہ کبھی سرکاری کمیٹیوں کی رکنیت قبول نہیں کرتے، ان کی کمزوری اور علالت کا بھی علم ہے، مگر اس سب کے باوجود وقت کی اہم ضرورت ہے کہ وہ اس مرحلے پر معذرت نہ کریں، اس ذمہ داری سے یقیناً انھیں تکلیف ہوگی، مگر مجھے یقین ہے کہ اسلامی آئین سازی کے موجودہ مرحلے پر ان کی رائے، اور علمی مشورے بہت قیمتی اور اہمیت کے حامل ہوں گے، مولانا کا یہ تعاون، یقیناً تعاون علی البر والتقویٰ کا مصداق ہوگا۔"

مولانا نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا،

"میں حج وفد لے کر جا رہا ہوں، بیس روز تک میری واپسی ہوگی، اب یہ تمھاری ذمہ داری

ہے کہ تمام حالات بتا کر مولانا کو آمادہ کرو" پھر بے تکلفی کے انداز میں بولے "تم کچھ بھی کرو، مجھے اس سے بحث نہیں، مگر بات یہ ہے کہ مولانا انکار نہیں کریں گے"

میں نیازی صاحب سے رخصت ہو کر واپس آگیا مسلسل تین روز تک سوچتا رہا کہ والد صاحب سے بات کی ابتداء کیسے کروں، میں ان کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ ان سے کوئی بات منوانا بسا اوقات جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں مایوس نہ تھا، مجھے پورا اعتماد تھا کہ میں یہ مشکل بات ضرور منوالوں گا، شاید اس لئے کہ میرے پاس ٹھوس دلائل تھے اور مجھے یہ احساس نہ تھا کہ میں جو بات کروں گا وہ بے وزن ہوگی، حالانکہ یہ حقیقت میرے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں تھی، کہ والد صاحب کے گرد و پیش کئی حضرات سخت مخالفت کریں گے، ان کی انتہائی کوشش ہوگی کہ والد صاحب نظریاتی کونسل کی رکنیت قبول نہ کریں۔ تین روز کی مسلسل سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس بات کو ایک ہی مرحلہ میں نہ کہا جائے۔ اس طرح انکار کر دیں گے، مجھے والد صاحب سے جو بات منوانی ہوتی تھی وہ میں کبھی یکمشت نہیں کرتا تھا، اس بات کو بالاقساط کہتا اور خاص انداز سے پورے مدعا کو ترتیب دیتا، ایک قسط میں ایک بات بیان کرتا، اس کا ردِ عمل دیکھتا، اور پھر ردِ عمل کے مطابق بات کو ترتیب دے کر دوسری قسط بیان کرتا، کوئی بات منوانے کے لئے اسے اقساط میں تقسیم کرنا پڑتا۔

میں نے پوری بات کو تین حصوں میں تقسیم کیا، تمہید، اصل مدعا، اور دلائل، ان تین بنیادی مرحلوں کے بعد چوتھا مرحلہ میرے سامنے یہ بھی تھا کہ جو حضرات رکنیت قبول نہ کرنے کے حق میں دلائل دیں گے، ان کا بھی معقول اور ٹھوس جواب پہلے سے موجود رہنا چاہئے۔ میں ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہوگیا، اس کے بعد اللہ کا نام لے کر مرحلہ وار بات کا آغاز کر دیا۔ بہت سے حضرات نے سخت مخالفت شروع کر دی، رات کو جب میں والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ سب کی گفتگو، اور دلائل مجھ سے نقل کرتے، میں ان کا جواب دیتا، ایک روز مغرب کے بعد حاضر ہوا، ایک عالمِ دین موجود تھے، وہ اسی موضوع پر محوِ گفتگو تھے، دلائل کا رخ مخالفت کی طرف

تھا، منجملہ دیگر دلائل کے یہ بھی فرمایا کہ آپ کی کوئی بات مانی نہیں جائے گی، اس لئے آپ کی شمولیت بے سود ہے، میں اب تک خاموش بیٹھا تھا، ان کی اس دلیل پر بول اٹھا، میں نے بصد ادب عرض کیا، حضرت آپ تو عالم دین ہیں، میں تو ایک ادنیٰ طالب علم ہوں، اب تک آپ ہی حضرات کی صحبت اٹھائی ہے، قرآن تو نبی کو بھی یہ کہتا ہے کہ "سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون" اور "انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء"

خدا جب اپنے برگزیدہ نبی کو یہ کہہ رہا ہے کہ کسی کو ہدایت پر لانا تمھاری اختیار میں نہیں ہے، تمھارا فرض، اور تمھارا مشن تو یہ ہے کہ لوگوں سے حق بات کہتے رہو، اور انھیں سیدھی راہ دکھاتے رہو۔ تو جب انبیاء حق بات لوگوں سے نہیں منوا سکتے تو علماء نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ حق بات منوا سکتے ہیں، اور یہ سمجھ کر اور بزعم خویش یہ گمان کر کے کہ کوئی ہماری بات نہیں مانے گا، گھروں میں بیٹھ رہنا، اور حق گوئی سے رُک جانا، انبیاء کی روایت، اور ان کے طریقے سے انحراف ہے۔

علماء، انبیاء کے وارث ہیں، ان کا فرض بھی یہی ہے کہ ہر حال میں اور ہر ماحول میں حق بات کہتے رہیں، کوئی مانے نہ مانے، یہ ان کے ذمے نہیں"

میری اس بات پر وہ خاموش ہو گئے، میری کوشش جاری رہی، اور بالآخر ۲ روز کی جدوجہد کے بعد ۴ جنوری ۸۴ء کو والد صاحب نے سیکریٹری اسلامی نظریاتی کونسل کو اپنی آمادگی سے مطلع کر دیا۔

والد صاحب قبلہ کو بعض حضرات نے سب سے زیادہ اس بات سے ڈرایا کہ آپ جو بات کہیں گے وہ تو مانی نہیں جائے گی، اور وہ لوگ جو بات کرنا چاہیں گے اس کے لئے آپ کو استعمال کریں گے۔

اس بارے میں نیازی صاحب پہلے ہی یہ بات کہہ چکے تھے کہ "مولانا کو کسی غلط بات پر

آمادہ کرنے کی کوشش یا دستخط کرانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ مرحلہ بھی نہیں آئے گا کہ انھیں کسی سمت سے یا کسی انداز میں گائڈ کیا جائے۔" میں نے والد صاحب قبلہ سے یہی بات کہی، اور عرض کیا کہ بالفرض اگر کوئی ایسا مرحلہ آیا بھی کہ کسی شخص، یا کسی حلقے نے آپ کو گائڈ کرنے کی کوشش کی تو علیحدگی اختیار کر لینا، اور قوم کو بتا دینا کہ میں حق بات کہنے کا عزم لے کر گیا تھا، مگر مجھے ایسا کرنے سے روک دیا گیا ہے، علیحدگی میرے اختیار میں تھی، اس لئے میں کونسل سے باہر آگیا ہوں۔

والد صاحب کو اس بات سے بڑا اطمینان تھا کہ آئین میں اسلام کو حکومت کا سرکاری مذہب مان لیا گیا ہے۔ ۲۶ برس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ سرکاری مذہب کا تعین ہوا، ان کی نظر میں یہ بات بہت اہم اور دور رس نتائج کی حامل تھی۔

بہرکیف والد صاحب نے ۲۱ روز کی بحث و تمحیص اور اپنے قلبی اطمینان کے بعد کمزوری اور علالت کے باوجود ۱۴ جنوری ۷۴ء ۱۹ کو آمادگی ظاہر کر دی، اس آمادگی میں جہاں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ با اختیار اور ملک کے قابل و ذمہ دار افراد کی موجودگی میں حق منوانے کی کوشش کروں گا، وہاں اس بات کو بھی بڑا دخل تھا کہ پندرہ برس سے والد صاحب کو نیازی صاحب سے جو تعلق تھا، اسے نظر انداز کرنا دشوار تھا؛ نیازی صاحب کا تعلق والد صاحب سے کسی غرض پر مبنی نہیں تھا، نہ اس کا کوئی سیاسی پس منظر تھا، یہی حال والد صاحب کا بھی تھا، ان کو جس سے تعلق ہو جاتا وہ اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے، انھوں نے کبھی کسی کا مسلک اور نظریہ پوچھ کر محبت نہیں کی جو بھی خلوص اور محبت سے آیا، اسے سر آنکھوں پر بٹھایا، ہاں جس سے تعلق ہو گیا۔ اس کو ہمیشہ اچھی بات کی نصیحت کرتے رہے، کوئی بات بری دیکھتے تو براہِ راست، اور نام لے کر منع نہیں کرتے تھے، بلکہ عمومی انداز میں بات سمجھا دیتے۔ ہم نے زندگی بھر انھیں کسی پر طنز کرتے نہیں سنا؛ نیازی صاحب جب جماعت اسلامی میں تھے اس وقت بھی والد صاحب کے

پاس آتے، اور جماعت سے علیحدگی اختیار کی، جب بھی آتے رہے، پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے جب بھی آنا جانا رہا، اور پھر جب وزیر بنے تب بھی آئے، وہ کیوں کہ والد صاحب کو استاد کی طرح سمجھتے، اور ان کا اتنا ہی احترام کرتے جتنا ایک بیٹا باپ کا کرتا ہے، اس لئے والد صاحب نے بھی ہمیشہ ان سے ایسی ہی شفقت کی جیسی اولاد کے ساتھ کی جاتی ہے۔

اس دوران اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان کی فہرست شائع ہو گئی، میں نے تفصیل بتائی، جسٹس حمود الرحمان، محمد افضل چیمہ، ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا، مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا محمد بخش مسلم کے نام پڑھ کر خوش ہوئے، اور فرمانے لگے "یہ سب اچھے، اور نیک لوگ ہیں، مجھے امید ہے، میں جو کچھ کہوں گا اسے سنیں گے ضرور"

پہلا اجلاس ۳۰ مارچ ۷۴ء ۱۹ کو لاہور میں ہوا، اس میں شریک ہوئے، پانچ گھنٹے کا طویل اجلاس تھا، واپس آئے تو ناچیز راقم سے اجلاس کا حال بیان کیا۔ اور اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ دوسرا اجلاس ۳۰ جون ۷۴ء ۱۹ء میں لاہور میں ہوا، اس میں بھی شرکت فرمائی، اس اجلاس میں کونسل کے چیئرمین چیف جسٹس جناب حمود الرحمٰن صاحب والد صاحب کی گفتگو سے اتنا متاثر ہوئے کہ اگلے روز بعض مسائل پر گفتگو اور تبادلہ خیال کی غرض سے والد صاحب کے پاس تشریف لے آئے اور ایک گھنٹہ بیٹھے رہے۔

والد صاحب بار بار یہی فرماتے کہ "میں نرمی سے ان لوگوں کو نصیحت کرتا رہوں گا، اور قرآن و حدیث میں جو حکم ہے وہ لکھ کر پیش کر دوں گا، کسی کی ذات کو ہدف بنانا، کسی پر تنقید کرنا یا خواہ مخواہ بحث و تمحیص میں پڑنا، شرعاً اور اخلاقاً مناسب نہیں ہے۔"

لیکن افسوس کہ قدرت نے اتنا موقع نہ دیا کہ وہ اس ملک میں جس کے ایک ایک ذرّے سے انھیں بے پناہ محبت تھی، اسلامی دستور مکمل ہوتے، اور نافذ ہوتے دیکھیں۔ یہ بجا اور درست کہ کسی فرد کے نہ ہونے سے دنیا کا کوئی کام نہیں رکتا، قدرت کو

جس کام کی تکمیل مقصود ہوتی ہے ، وہ ضرور مکمل ہوتا ہے ، مگر اس حقیقت کا انکار بھی ممکن نہیں کہ جب کوئی تحریک اور مشن پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے تو اس کی نسبت افراد ہی کی طرف ہوتی ہے۔

میں یہ ضرور کہوں گا کہ والد صاحب بھی پاکستان میں اسلامی دستور سازی کی جدوجہد میں اپنا ایک مقام معین کر گئے ہیں۔

سوشل ازم اور اسلام

قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں اسلام کے سوا کسی ازم کا نام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ سوشل ازم کا نام لیا جانے لگا۔ ۱۹۷۰ء میں سوشل ازم کا نعرہ سیاسی حلقوں سے بلند ہوا۔ بعض لوگوں نے اسلامی سوشل ازم کی اصطلاح وضع کی، لیکن حضرت کاندھلویؒ پاکستان میں خالص اسلامی دستور، نظامِ مصطفیٰ (خلافت راشدہ) کا نظام قائم اور جاری کرنے کے خواہاں تھے۔ حضرت مزدور کو اس کا حق ادا کرنے بلکہ اس کے ساتھ احسان کرنے کی ہدایت فرماتے تھے اور خود بھی اس پر عمل کرتے تھے۔ کاتب کو کتابت کی اُجرت ادا کرنے کے علاوہ آمد و رفت کا کرایہ بھی ادا کرتے تھے۔ کسی طالب علم سے کوئی خدمت لیتے تو اس سے زیادہ اس کی خدمت خود فرماتے تھے۔ حضرت فرماتے تھے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں کوئی پیوند نہیں لگایا جاسکتا، اسلام میں معاشی اور اقتصادی مکمل نظام موجود ہے اس نظام میں سرمایہ داری یا کیپٹل ازم کے سودی نظام کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، اسی طرح اس میں سوشل ازم یا کمیونزم کے نظام کو داخل کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ۱۹۷۰ء میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے مقتدر علماء کا فتویٰ ۱۱۵ علماء کرام کے دستخطوں سے ایک فتویٰ شائع ہوا تھا جس میں سوشل ازم اور کمیونزم کے کفر ہونے کا حکم لگایا گیا تھا، اس میں حضرت کاندھلویؒ کے دستخط بھی ثبت ہیں۔

حضرت نے ایک مختصر رسالہ اشتراکیت اور اسلام کے عنوان سے تالیف فرمایا ہے اس میں اشتراکیت کے کفر ہونے کی صراحت اور وضاحت موجود ہے،

بعض علماء جو آجکل پاکستان میں اسلامی دستور نافذ کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہیں ۱۹۷۰ء میں انھوں نے اسلامی سوشل ازم کی اصطلاح کے لئے کہا تھا کہ اگر سوشل ازم خدا کا وجود ثبت ہو تو وہ اسلام کے خلاف نہیں ہے، حضرت اس وقت بھی خالص اسلامی نظام اور قرآنی دستور جو کتاب و سنّت پر مبنی ہو اس کو نافذ کرنے کے داعی تھے۔

جمعیۃ العلماء اسلام کے مرکزی ارکان حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی مرحوم۔ حضرت مولینا

ظفر احمد عثمانی مرحوم، حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم حضرت مولینا کاندھلوی مرحوم اور اس سلسلہ کے تمام علماء و فضلا کا یہی مسلک رہا ہے اور اب بھی ان کے اخلاف تلامذہ اور متعلقین و معتقدین کا یہی مسلک حقہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس مسلک کے خلاف عمل کرتا ہے تو وہ حضرت حکیم الامت مولینا تھانوی اور حضرت شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی مرحوم کا روحانی وارث اور منتسب نہیں ہو سکتا۔

یہ حضرات علاقائی عصبیت کو سخت ناپسند کرتے تھے، صوبائی اور علاقائی تعصب سے ملک و ملت کو سخت نقصان پہنچ سکتا ہے، اسی صوبائی عصبیت، بنگالی اور پنجابی جھگڑے نے ہماری خدا داد مملکت پاکستان کو دو لخت کیا ہے، مولینا عثمانی نے مہاجرین کی علیحدہ تنظیم کو ختم کر دیا تھا۔

حضرت نے پاکستان میں اسلامی دستور نافذ کرنے کے لئے ایک جامع کتاب نظام اسلام مع دستور اسلام تالیف فرمائی ہے۔ یہ کتاب اسلامی آئین کے لئے بہترین دستاویز ہے اس کتاب کے متعلق کسی دوسری جگہ تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

ذوقِ شعر و آدب

ذوقِ شعروادب

والدِ محترم نے جہاں ایک طرف تفسیر، حدیث، علم کلام، اور سوانح پر متعدد ضخیم اور بلند پایہ کتابیں تالیف کیں، اور زندگی کا بشیتر حصّہ تفسیر وحدیث کے درس وتدریس میں گزرا وہاں آپ نے عربی اور فارسی میں بہت سے قصائد اور مراثی بھی کہے۔

شعروادب سے دلچسپی کا آغاز، عربی ادب کی مشہور کتاب "مقاماتِ حریری" کی تدریس سے ہوا۔ اکیس برس کی عمر میں جب دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے تو پہلے سال کے اسباق میں مقامات حریری بھی پڑھانے کا اتّفاق ہوا، اُسی سال عربی میں اس کی شرح لکھی، کئی

بار خود فرمایا:

"میں نے دار العلوم دیوبند میں عربی ادب کے طلبہ کی جب مقاماتِ حریری سے شغف اور دلچسپی دیکھی تو ان کے لئے اس کی شرح لکھ دی۔"

شرحِ مقامات کی ابتدار میں حضور اقدس فداہ ربی وامی صلوات اللہ علیہم کی مدح میں ایک طویل عربی قصیدہ لکھا، جس میں حضور کے ان تمام اسمائے گرامی کو جمع کیا ہے جو قرآنِ حکیم اور دیگر کتب سماویہ میں مذکور ہیں۔

معراج کے بارے میں ایک عربی قصیدہ "لامیۃ المعراج" کے نام سے لکھا، یہ قصیدہ بڑا عجیب وغریب ہے، امراء القیس کے معروف قصیدے (جو سبعہ معلقات میں سے ایک ہے) کے مطلع

"قِفَا نَبْکِ مِنْ ذِکْرٰی حَبِیْبٍ وَمَنْزِلٖ" پر تضمین ہے۔ ایک عربی قصیدہ اللہ جل شانہٗ کی حمد وثنا میں ہے۔ سب سے طویل عربی قصیدہ "تائیۃ القضاء والقدر" ہے، یہ قصیدہ علم کلام کے مشہور مسئلہ جبر وقدر اور قضاء وقدر کے موضوع پر ایک ملحد کے جواب میں ہے (اس قصیدے کا مکمل تعارف کتاب کے دوسرے صفحات پر آچکا ہے)

مسئلہ رفع یدین پر ایک عربی قصیدہ ہے، جو "لامیۃ رفع الیدین" کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ انور شاہ کاشمیری اور حضرت تھانوی کے مراثی بھی عربی میں ہیں، حضرت تھانوی کا ایک مرثیہ فارسی میں بھی لکھا، جو مولانائے روم کے اس شعر پر تضمین ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائیہا شکایت می کند

چند عربی، اور فارسی قصائد اور مراثی کے منتخب اشعار پیش ہیں:

عربی قصائد کی تعداد زیادہ ہے، حمد باری عزوجل اور نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جتنا کلام ہے، وہ عربی میں ہے۔ بعض مشکل علمی مضامین کو بھی (عربی) شعر کا جامہ

پہنایا ہے۔

"رائیۃ الحمد والثناء والمناجات والدعاء" کے عنوان سے حمد باری تعالیٰ لکھی اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

لک الحمدُ والتقدّس والمجدُ کلّہٗ
تبارکتَ یا ربَّ السمٰوٰتِ والثریٰ

تمام تر تعریف، تنزیہ، اور بزرگی تیرے ہی لئے ہے، اے زمین و آسمان کے پروردگار تیری ذات بڑی ہی برکت والی ہے۔

لک الکبریاءُ والخلقُ والامرُ کلہٗ
تعالیت ما اولاک بالحمد اَجدرا

تمام بزرگیاں تیرے ہی لئے ہیں، تیرے ہی لئے ہے پیدا کرنا، اور حکم کرنا، تو بلند ہے، تو ہی حمد و ثنا کے لائق ہے۔

لک الفضلُ والنعماءُ والشکرُ کلہٗ
نُعماک جلّتْ اَنْ تُعدَّ وتُحصرا

تمام فضل اور احسان تیری ہی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں، تیرے ہی لئے شکر ہے، اس لئے کہ تیری نعمتیں شمار اور احاطے سے باہر ہیں۔

وَمَنْ ذا الذی یحصی ثناءً ومِدحۃً
وَاِن بالغ المُثنیٰ واکثرا کثرا

کون ہے جو تیری ایک ہی حمد اور ثنا کا حق ادا کر سکے، اگرچہ ثنا خواں کتنا ہی مبالغہ کرے، مگر تیری ذات مبالغے سے کہیں بالا و برتر ہے، تیری تعریف و توصیف میں مبالغہ ممکن ہی نہیں۔

وَلَوْاَنَّ ما فی الکونِ من کل کائنٍ
لسان یدیم الحمد کان مُقصِّرا

اگر کائنات کا ہر ذرہ زبان بن جائے اور ہمیشہ تیری ہی حمد و ثنا میں مشغول رہے تب بھی تیری حمد و ثناء کا حق ادا کرنے سے قاصر رہے گا۔

رضیتُ بک الالٰہِ ربًّا ومالکاً

وبالمصطفیٰ الھادی رسولاً مبشرا

اے اللہ! میں تیرے پروردگار، اور مالک ہونے پر راضی ہوں، اور راضی ہوں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ مبشّر ہونے پر۔

وبالملۃ البیضاءِ دیناً وشرعۃ

عسیٰ أرِدَنْ یوم القیامۃ کوثرا

ملّتِ بیضا کے دین اور شریعت ہونے پر راضی ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ قیامت کے روز حوضِ کوثر پر حاضر ہوں۔

وبالمسلمین اِخوۃً ومرافقاً

وبالکافرین بِغْضَۃً وتنفّرا

مسلمانوں کے بھائی اور ساتھی ہونے پر راضی ہوں، اور کافروں سے بغض و نفرت پر خوش ہوں۔

وبالذکر والطاعاتِ عمّر جوارحی

وبالعلم والایقان قلبی تنوّرا

اپنے ذکر اور فرماں برداری سے میرے اعضاء کو آباد فرما، اور علم و یقین سے میرے دل کو روشن اور تاباں کر دے۔

ولستُ اُبالی حین اُھدیٰ واھتدی

وان عند الناسِ اشعث اغبرا

اے پروردگار! اگر تیری طرف سے مجھ کو ہدایت نصیب ہو جائے تو مجھ پروا

نہیں کہ لوگوں کے نزدیک میلا کچیلا، غیر مہذب اور غیر متمدن کہلاؤں۔!

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے والدِ مرحوم کو دیکھا ہے، اور ان سے ملے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اُن کی زندگی واقعی اس شعر کی مجسّم تفسیر بن گئی تھی، ان کے پاس ہر نظریے، طبقے، ہر سطح، اور ہر حیثیت کے لوگ آتے، غریب طلباء، درویش اور گدائے بے نوا بھی ہوتے، مال و دولت والے، عہدے والے، اور حکومت والے بھی آتے، مگر سب کے لئے ایک ہی نشست، ایک ہی کمرہ، ایک ہی ماحول، ایک ہی برتاؤ۔ جو بھی آتا، اُسے بکھری ہوئی کتابوں میں گرد آلود فرش پر بیٹھنا ہوتا، خود اپنے لباس کا یہی حال تھا، گھر والے کبھی ٹوکتے تو کہہ دیتے!

"میرا تو یہی لباس رہے گا، اور یہی حال کمرے کا ہوگا، اگر کسی کو اپنے عمدہ سوٹ اور کپڑوں کے میلا ہونے کا خیال ہے تو وہ نہ آئے، میں کسی کو دعوت نہیں پھرتا۔"

واَسْئَلُكَ اَللّٰهُمَّ تَعْجِيلَ رَحْمَةٍ

مِنْ جَوْهَرِ التَّعْجِيلِ عَبْدُكَ خُمِّرَا

اے خدا! تیری رحمتِ عاجلہ کا سوال کرتا ہوں، کیونکہ تیرے بندے کا خمیر ہی عجلت سے تیار کیا گیا ہے۔

والدِ محترم کی عادت تھی کہ عام گفتگو میں بھی علمی نکات بیان کرتے رہتے تھے، یہاں بھی بڑا لطیف اشارہ کیا اور بہت عمدہ استدلال کیا، قرآنِ حکیم میں اللہ جلّ شانہٗ کا ارشاد ہے۔

خلق الانسان من عجل، انسان عجلت سے پیدا کیا گیا، اللہ کے اس ارشاد کو دلیل بنا کر، اسی سے سوال کرتے ہیں کہ: تو نے تو خود ہی انسان کی گھٹی میں عجلت اور جلد بازی ڈال دی ہے، اب میں تجھ سے بھی یہی سوال اور درخواست کرتا ہوں کہ اپنے عاجز و درماندہ، اور عجلت کے خوگر بندے کو اپنی رحمتِ عاجلہ سے سرفراز فرما، اس پر ایسے ابرِ کرم کی بارش کر جس کے لئے اُسے انتظار نہ کرنا پڑے۔

سیّد الکونین خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا میں متعدد قصیدے

لکھے۔ سب سے طویل قصیدہ " میمیۃ المدیح والثناء " کے نام سے ہے۔ یہ قصیدہ خود والد محترم کو بہت محبوب اور پسند تھا، اکثر اس کے اشعار پڑھتے۔ اس قصیدے کے آخر میں والد محترم کا ایک مختصر نوٹ ہے جس میں علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم کی اس قصیدے پر خوشنودی کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

" رجب الحرام ۱۳۵۹ھ میں، دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ ادب کی طرف سے دارالحدیث میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند نے فرمائی، اس مجلس میں ناچیز نے یہ قصیدہ پڑھا، جس کو علامہ شبیر احمد عثمانی نے بہت پسند فرمایا، بعدازاں جلسہ میں تقریر فرمائی، اور قصیدہ، اور صاحبِ قصیدہ کے متعلق کلماتِ خیر ارشاد فرمائے۔

فللہ الحمد والشکر۔!

نعتیہ قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں:

اذا کان مدحٌ اوثناءٌ منمنم
فاکرم خلق اللہ اولیٰ واقدم

جب کسی مرصّع مدح، یا ثنا کا ذکر ہو تو اس کے لئے سب سے زیادہ مقدم اور مستحق وہ ذات بابرکات ہے جو ساری مخلوق میں سب سے زیادہ مکرم ہے۔

ولا بد من بحر طویل لمدحہٖ
لما انہ بحر المکارم قلزم

آپؐ کی مدح کے لئے بحرِ طویل کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ آپ کی ذاتِ اقدس مکارمِ اخلاق کا ایک بحرِ بے کراں ہے۔

لکل أمریءٍ فی الحب دین ومذھب
یدین بما یھویٰ وما ھو یزعم

عشق و محبت میں ہر شخص کا ایک طریقہ اور مذہب ہے کہ وہ اسی کے مطابق چلتا ہے۔

ودِیْنِیْ حُبُّ المصطفیٰ منبع الھدیٰ

اجل الوریٰ من فی الجمالِ مسلم

میرا دین و مذہب، نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے، جو ہدایت کا سرچشمہ ہیں، سارے عالم میں سب سے زیادہ جلیل القدر ہیں، اور حسن و جمال آپ کی ذاتِ گرامی مُسَلَّم ہے۔

لامیۃ المعراج کے چند اشعار معہ ترجمہ

الا لیت شِعری ھل یقولنّ مقولی

قصیدا باسرآءِ النبیّ المبجّلِ

کاش مجھ کو اس کا علم ہو کہ میری زبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا کوئی قصید کہے گی۔

فسبحانَ من اسریٰ بلیل بعبدہ

الی المسجد الاقصیٰ الی عرشہِ العلی

پاک ذات ہے جو رات کو اپنے بندے کو لے گئی مسجد اقصیٰ تک پھر عرشِ عظیم تک۔

تمطّی براقا خطوہ مد طرفہ

کبرق ولیس البرق منہ با عجل

براق پر سوار تھے کہ اس قدم منتہائے بصر پہ تھا براق برق (بجلی) کی مانند بلکہ اس سے بھی تیز تھا۔

وصادف فیھا الانبیاء اینظرونہ

وقد جمعوا للشاھد المتوکل

اور انبیاء کرام آپ کی تشریف آوری کے منتظر تھے اور سب آپ کیلئے جمع کئے گئے تھے

فلاح کبدر فی الکواکب کامل

فیا لاحتفا الکواکب مخجل

عجب محفل تھی، ستاروں کو شرمندہ کر رہی تھی، آپ اس میں ایسے تھے، جیسے تاروں میں بدر کامل۔

وقال له الروح الامین تقدمن

وأمم جمیع الرسل یا خیر مرسل

روح الامین حضرت جبرائیل نے کہا اے برگزیدہ رسالت آگے بڑھیے تمام نبیوں کی امامت فرمایئے۔

فانت امام الانبیاء وخطیبهم

ومصباحهم فی کل نادو محفل

آپ انبیاء کے امام و خطیب ہیں اور ہر محفل و مجلس کی شمع اور چراغ ہیں۔

وصل باملاك السماء لیتقدوا

ولیستمعوا قرآن خیر مرتل

اور آسمان کے فرشتوں کو نماز پڑھایئے تاکہ آپ کی اقتدا میں قرآن حکیم کی تلاوت کی آپ سے سنیں۔

ومنها الی السبع السموات قد سما

فنادته خزان الجناب المجلل

اور وہاں سے آسمانوں پر گئے جو سات ہیں، وہاں بارگاہ عالی کے خازنین نے آواز دی۔

علی الطائر المیمون یا خیر قادم

واهلا وسهلا بالمعالی تفضل

بجنت مبارک بر آئے بہترین آنے والے اہلاً وسہلاً مرحبا معالی اور مکارم کے ساتھ آئے۔

رأی الآیة الکبریٰ وما شاء ربہ

رأی جنت الماویٰ وما لم یخیّل

خدا کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں اور خدا نے جو چاہا دکھایا اور جنت الماویٰ جو خیال میں نہ آسکے دیکھی۔

دنیٰ فتدلیٰ قاب قوسین وادنیٰ

واکرم بالایحاء سبحان مفضل

اور اس قدر قریب ہوئے کہ دو کمان کا فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم اور بلا واسطہ وحی ہوئی۔

رآہ رآہ دون شک وریبۃ

وما زاغت العینان عن نورہ الجلی

آپ نے دیکھا ہے دیکھا ہے بغیر کسی شک و شبہ کے اور آپ کی آنکھیں کسی اور طرف ملتفت نہیں ہوئیں۔

رآہ بعینی راسہ وفوادہ

رواہ ابن عبّاس صحیح مسلسل

حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے کہ آپؐ نے سر مبارک کی دونوں آنکھوں اور دل کی آنکھوں سے حق تعالیٰ کا دیدار فرمایا۔

وھذا حدیث جیّد وموثق

واخرجہ البزار ثم ابن حنبل

اور یہ حدیث رویت باری عمدہ ہے اور معتبر ہے مسند بزار اور مسند احمد بن حنبل میں موجود ہے۔

وكلمه المولىٰ ولـم يك حاجبٌ
فلله من قدرٍ علی و اجمل

اور حق تعالیٰ نے آپ سے بلا واسطہ و حاجب کلام فرمایا سبحان اللہ کیا مرتبہ کی بلندی اور رفعت تھی۔

وصار شهود العين في قلبه الذكى
وصار بنور الله لله يجتلى

اور آپ کی مشاہدہ عینی قلب منوّر میں اس طرح داخل ہوگئی کہ دونوں ایک ہوگئے اور اللہ کے نور سے نور السمٰوات والارض دیکھنے لگے۔

وما جاء عن نفى لادراك اعين
اريد به نفى الاحاطه فاعقل

اور جو نفی ادراک عینی کی نفی آئی ہے وہ دراصل احاطہ بصری کی نفی ہے۔ سمجھ لے

وقد جاء ادراك بمعنىٰ احاطة
بقصه فرعون بذكر مرتل

اور ادراک کے معنیٰ احاطہ کرنے کے بھی آتے ہیں جیساکہ فرعون و موسیٰؑ کے واقعہ میں مذکور ہے۔

لطيف ومحجوب بنور جلاله
كما قدر ويناه مسندا غير مرسل

حق تعالیٰ لطیف ہیں نور عظمت و جلال سے مستور ہیں جیساکہ صحیح مسلم میں ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے۔

فانّى لابصار الورىٰ والبصائر
احاطه نور الله اذ هو ينجلى

پس مخلوق کی بصیرت اور بصارت ظاہر و باطن کی آنکھیں نورِ الٰہی کا احاطہ کہاں کر سکتی ہیں۔

ولیس لہ حد ولا نتیصور!

متی ماترقی العقل فیہ یُسفّل

نہ اس کی کوئی حد و نہایت ہے نہ اس کی تعریف ہو سکتی ہے اور نہ حقیقت کا تصور ہو سکتا ہے، عقل کی پرواز گرا دی جائے گی۔

علاء وعلا ان یدرک العقل شانہ

سما وسما عن فکرۃ المتامّل

اس کی شان بلند سے بلند ہے کہ عقل اس کا ادراک کر سکے وفکر و خیال سے بالا و برتر ہے۔

ولیس محالا ان یری العبد ربّہ

بغیر محاذاۃ واین وھیکل

اور بندہ اپنے رب کو بغیر محاذات اور بغیر مقابلہ کے دیکھے یہ محال نہیں ہے۔

وان شئت برھانا لامکان رویۃ

الالہ الجلیل من طریق التعقل

اور اگر تجھے امکان روایت کی دلیل چاہیے، جو عقلی طور پر رویت باری ثابت کرے

فذاک الاشتیاق المومنین الی لقا

ء ربھم الاعلی حنین مؤمل

تو یہ مومنین کے دلوں میں رب تعالیٰ کی رویت کا شوق اس کی دلیل ہے کہ اس کا وقوع ممکن ہے۔

ومعراجہ قد کان بالجسم لیقظۃ

کما ھو امنطوق بالکتاب المفصل

اور آپ کی معراج شریف جسمانی اور جاگنے کی حالت میں تھی جیسا کہ کتاب اللہ میں

علی ذاک اجماع الصحابة کلھم
واتباعھم ناقبل ولا تتعلل

اس پر صحابہؓ اور تابعین کا اجماع ہے۔ اس کو قبول کر اور بہانہ تلاش نہ کر۔

ولم یدن رب العرش غیر نبینا
الی العرش تفضیلا لافضل افضل

رب تعالیٰ کے عرش عظیم تک سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نبی نہیں پہنچا
تاکہ آپ کی فضیلت سب پر نمایاں ہو۔

وفارقہ الروح الامین بسدرۃ
وقال لہ ھذا نھایۃ منزلی

اور جبرائیلؑ آپ سے سدرۃ المنتہیٰ پر جدا ہو گئے کہ میرا آخری مقام یہ ہے۔

وودعہ جبریل اذجاء رفرف
تدلی لہ مثل المنصۃ من عل

اور جبرائیلؑ آپ سے جدا ہوئے جب آپ کے لئے رفرف (جھولے کی مانند) آئی

ومن بعدہٗ قد زج فی النور زجۃ
واضحیٰ الی مولاہ لیسمو ویعتلی

اور اس کے بعد آپ نور میں مستور ہو گئے، اس حال میں کہ آپ مولیٰ کے قریب جا رہے تھے۔

وماذاک الا غایۃٌ لکرامۃ
وھل بعد ھذا من مقام مفضل

یہ انتہائی اعزاز و اکرام ہے۔ کیا کوئی مقام اس سے اعلیٰ و ارفع ہو سکتا ہے؟

وفی ذاک ایماء لختم النبوۃ !
وھذا لان العرش آخر منزل

اور عرش چونکہ آخری مقام ہے اس کی سیر میں ختم نبوت کا اشارہ تھا کہ یہ مقام علی خاتم النبیین کے لئے مقدر ہوا۔

کقبل ارتداد الطرف احضار عرشہا

لقد جاء منصوصا بذکر منزل

آپ کا معراج میں جانا پھر بیت المقدس کا بعینہ آپ کے سامنے آنا بلقیس کے تخت کی مانند ہے جو ایک پلک جھپکنے سے پہلے آگیا تھا قصیدہ کے ۱۲۶ اشعار میں سے ۴۵ شعر نقل کئے ہیں اس کی شرح تنویر السراج مسئلہ معراج پر نہایت مختصر اور جامع تعلیق ہے اہلِ علم حضرات اصل کتاب کے مطالعہ سے پورا استفادہ استفاضہ کر سکتے ہیں۔

مرثیہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ

بشنو از نے چوں حکایت می کند ۔۔۔ از جدائیہا شکایت می کند

روحِ عرفاں و معارف قبض شد ۔۔۔ روحِ اسرارِ تصرف قبض شد

علم رفت و نورِ ایمانی نماند ۔۔۔ زہد و رفت و وعظِ ربانی نماند

آفتابِ علم و حکمت شد غروب ۔۔۔ نکتہا و رمزہا شد در غیوب

آں جنیدِ وقت شبلیِ زماں ۔۔۔ کرد رحلت سوئے فردوسِ جناں

رفت ثانی مولوی معنوی ۔۔۔ مولوی اشرف علی تھانوی

آنکہ تصنیفش گزشت از یک ہزار ۔۔۔ رفت در آفاق و امصار و دیار

رہنمایم چوں شدی از من جدا ۔۔۔ بے نوایم گرچہ دارم صد نوا

در سہا گیریم نامہ و وعظِ تو را ۔۔۔ گرچہ مردی، می نمیرد فیضِ تو

علمِ تو شمع است در راہِ سلوک ۔۔۔ شافی ادوائی و حلّالِ شکوک

اے حکیم امتِ خیر البشر　　　بے رفیقاں می نشاید ایں سفر

مرثیہ کے آخر میں بڑی عجیب وغریب دعا ہے، اور اسی دعا پر مرثیہ کا اختتام ہے

وقتِ رفتن من بخوانم ایں سبق

لا الٰہ لا الٰہ غیرِ حق

دار العلوم دیوبند

والدِ محترم نے دار العلوم دیوبند میں علّامہ انور شاہ کاشمیری، علّامہ شبّیر احمد عثمانی اور حضرت میاں اصغر حسین جیسے جہابذۂ فن کے آگے زانوئے اَدب تہ کیا؛ اور ان یگانۂ روزگار حضرات کے علوم سے خوشہ چینی کی، پھر کم وبیش مجموعی طور پر سترہ، اٹھارہ برس اسی درسگاہ میں مسندِ درس کو رونق بخشی، ظاہر ہے اس مادرِ علم وحکمت سے جتنی بھی محبّت ہوتی کم تھی۔ اسی محبّت اور لگاؤ کا اظہار ان چند فارسی اشعار میں کیا ہے؛

مرحبا اے قاصدِ طیّارِ ما　　　مرحبا اے طائرِ گلزارِ ما

بشنو از من داستانِ باغِ من　　　تا بدانی باغبان و باغِ من

مرکزِ تعلیم بہرِ ارجمند　　　ہست ایں دار العلوم دیوبند

تشنگانِ علم را آبِ حیات　　　بحرِ علمِ مصطفیٰ عَذبٌ فرات

کالج و اسکول داں ملحٌ اُجاج　　　باعثِ تخریبِ ایمان و مزاج

گر تو خواہی علمِ ربّ ذوالجلال　　　پس ببیں ایں درس گاہے بے مثال

علمِ کالج، ہم چنیں علمِ سکول!　　　جہلِ مطلق نزدِ اللہ و رسول ؐ

مبلغِ علمش حیاۃِ دنیوی است　　　غافل از علمِ حیاتِ اُخروی است

کوثرِ علمِ نبی دار العلوم　　　تشنگا دارند بر آبش ہجوم

از در و دیوارِ تو نے آوازِ علم | روز و شب روشن در و بازارِ علم
چشمہ فیضِ محمد قاسم است | دستِ طیّب دم بدم زاں قاسم است
میکدہ معمور و مستاں در خروش | دستِ طیّب ساقیِ ہر بادہ نوش
مہبطِ او ایں زمینِ ہند ہست | مدرسہ اش ایں زمینِ ہند ہست
درس گاہش ایں زمینِ ہند ہست | خانقاہش ایں زمینِ ہند ہست
تا بکے ایں منطق و ایں فلسفہ | تا بکے اقلیدس و ایں ہندسہ
تا بکے در منطقِ یونانیاں | یک دو حرف از علمِ عرفاں ہم بخواں
صرف کردی عمرِ خود در نحو و صرف | از علومِ عاشقی خواں ہم دو حرف
دل گرفت از جملہ انشاء و ادب | فکرِ ما جو شد سوئے آدابِ رب

ما فقیراں ماندا ایم ہیچ شئے
از تو می خواہیم کاسہ بھرے

(ایک مرتبہ حضرت تھانوی نے یہ فرمایا کہ خدا تعالیٰ ہی سے بھیک مانگا کرو، حاضرین میں سے کسی نے کہا: حضرت! اگر کسی کے پاس کاسہ گدائی بھی نہ ہو تو وہ کیا کرے"۔ فرمایا: خالی ہاتھ اس کی بارگاہ میں پہنچ جائے، کاسہ بھی وہیں سے مل جائے گا، اس شعر میں حضرت کے اسی ارشاد کی طرف اشارہ ہے۔)

دارالعلوم کے بارے میں یہ قصیدہ خاصا طویل ہے، آخر میں دعائیہ اشعار ہیں، فرماتے ہیں:

اے خدا ایں مدرسہ قائم بدار | فیض او جاری بود لیل و نہار
تا قیامت فیض او جاری بود | شمعِ علمش ہر کجا ہادی بُود
اے خدا ایں درس گاہِ علمِ تو | دارِ تفسیر و حدیث دینِ تو
از ہمہ آفات او را دور دار | از علومِ معرفت معمُور دار

از غبارِ فکرِ دنیا دُور دار | از خمارِ خمرِ خود مخمُور دار

قصیدے کا آخری شعر ہے:

ہکذا اَعجِل اِلیٰ دارِ السّلام
سوئے مولانا خداوندِ انام

دارالعلوم میں سنِ عیسوی کے اجراء پر شکوہ!

زمانۂ قیام دارالعلوم میں ایک مرتبہ مولانا بشیر احمد صاحب ناظمِ تعلیمات دارالعلوم نے اوقاتِ تعلیم کا سنِ شمسی کے حساب سے ایک دائمی نقشہ تیار کیا جو مدرسین کے پاس بھیجا گیا۔ اس ناچیز کو یہ نقشہ ناگوار گزرا کہ ہجری اور اسلامی سن چھوڑ کر عیسوی سن کیوں اختیار کیا گیا۔ حالانکہ شریعت میں قمری سن کا اعتبار ہے۔ احکام شریعت جیسے روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ سب قمری حساب پر مبنی ہیں۔ دارالعلوم کے ناظم تعلیمات نے انگریزی طریقہ کیوں اختیار کیا۔ اس پر یہ منظوم شکوہ کیا۔

السلام اے واقفِ سیرِ نجوم | ناظمِ تعلیم در دارالعلوم
من ندانم جنوری فروری | ہیں بگو با ما سنِ پیغمبری
ایں حسابے ہست از نصرانیاں | اہلِ دیں دانند ایں را مستہاں
از ہلال و از قمر میقاتِ ما | نے ز شمس و دورِ اُو تاریخِ ما
روزہ و حج و زکوٰۃ آں معتبر | کہ بباید بر حسابِ ایں قمر
اُمّۃٌ اُمِّیَّۃٌ مارا لقب | در سن و تاریخ آمد ایں ادب
سنِ ہجری سنِ اربابِ صفا | سنِ شمسی، سنِ اصحابِ جفا
ما ہمہ خدامِ دینِ مصطفیٰ | وارثانِ انبیاءِ با صفا

روحِ ما از قمرِ رمضان گشت مست | بے خبر از جون و جولائی اگست
از محرم نقشہ بایداز ربیع | ایں ستمبر بُرد از سرِ ماے رفیع
غرّہ شوال، سالِ جنّت است | زیں سبب ایں مبدا تعلیم گشت
در حدیثِ مصطفیٰ آمد چنیں | بیہقی تخریج کردہ نجمِ دیں
ہیچ دعوت من ندانم شعر را | خود بخود آمد نہ کردم رد ورا
بر لب من خود بخود آمد سخن | آنچہ خواہی اے بشیر احمد بکن
گفتگوئے طالباں در کارِ رب | جوششِ علم است نے ترکِ ادب

والسلام اے ناظمِ تعلیم ما

بَارَكَ اللهُ لَنَا اَعْمَالَنَا

(۱۶ اربیع الاوّل ۶۶ھ ۱۳ / ۴۶ء ۱۹)

آبائی وطن قصبہ کاندھلہ میں جب مکان بنایا تو اس کی تعمیر میں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھی کہ مسجد کے بالکل سامنے ہو، مسجد کے صدر دروازے (مشرقی دروازے) اور گھر کے دروازے میں صرف دس فٹ کا فاصلہ تھا، پھر گھر کے تمام کمرے اس طرح بنائے کہ کسی کمرے میں ٹھہرے ہو کر نماز نہ پڑھنی پڑے، ہر کمرے میں قبلہ بالکل سیدھا تھا۔

حج کے لئے گئے تو کوہِ اُحد اور مدینہ منوّرہ سے چھوٹے چھوٹے پتھر اور مٹی رکھی گھر کا نام "مبارک منزل" رکھا، ان تمام واقعات و کیفیات کو والد مرحوم نے شعر کے قالب میں ڈھالا، اُنہی کی زبانی سنیئے:

"۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۵ء میں اس ناچیز نے قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں ایک مکان بنایا، جو بالکل مسجد کے سامنے تھا، اس لئے مزید مسرت کا باعث ہوا کہ خانۂ خدا سے قرب و اتصال حاصل ہوا۔ جوشِ مسرت میں یہ اشعار لکھے جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش کئے، حضرت نے ان اشعار کو پسند فرمایا۔ اشعار یہ ہیں:

اے جلیل الشان دارائے جہاں — اے منزّہ از زمان و از مکاں
اے خدائے خالقِ افلاک و ارض — اے منزہ از جہالت و طول و عرض
اے منزہ از یمین و از شمال! — اے منزہ از فنا و از زوال
اے منزہ از اشارات و عیاں — اے منزہ از عبارات و بیاں
اے بروں از وہم و ادراک و خیال — اے مُنَزَّہ از شبیہ و از مثال
رہ نیابد در تو نقصان و فنا — مر تو ئی موصوف با وصفِ بقا
ساخت مسکن بندۂ ادریس تو — بر و بر روئے خانۂ تقدیس تو
باب دارش پیش بابِ بیتِ الُّست — اَقربِ بابِ از کل ایں جار نشست
ہست ایں کافی برائے فخرِ من — در لعالِ ساجد رفت بیتِ من
سنگہائے چند از کوہِ اُحد — ریزہائے چند از بیتِ اَحد
در اساسش می نہادم اے خدا — تا بود دار التقیٰ دار الہدیٰ
تا بود جاری و ساری برکتش — در در و دیوار، در ہر گوشہ اش
دم بدم سازد معطّر روح را — بوئے ذکرِ ذکرانِ با وفا!
ذکرِ تو اطیب تر از مشکِ ختن — نامِ تو شیریں تر از شہد و لبن
صد ہزاراں برکت و خیرِ کثیر — صد ہزاراں رافت و لطفِ عزیز
صد ہزاراں رحمتت اے ذوالمنن — در دلِ من از جوارت موجزن
اے خدائے پاک اے ربّ جلیل — عزّ جارک، کَے بود جارت ذلیل
جارِ سلطاں کے بود خار و مہاں — جارِ رحمٰن کَے بود کمتر ازاں
تو غنیِ مطلقی اے ذوالجلال — من فقیرِ مطلقم بے قیل و قال
تو کریمی من گدائے مُطلقم — تو عزیزی من ذلیلِ مُطلقم
ذاتِ پاکت منبعِ جود و نوال — ما ز سر تا پا شدہ نقشِ سوال

رحم فرما اے خدائے ذوالمنن ربِّ انزلنی "مبارک منزلا"
اے خدائے پاک ربّ لم یزل
اِغْفِرَنْ لِیُ ثم من بیتی دَخَلْ

آپ کے اسی اخلاص، اور ایمانی جذبے کا اثر تھا، اور مدینہ منورہ اور کوہِ احد کے پتھروں اور سنگریزوں کی برکت تھی کہ جب کفر زارِ ہند سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے تو مکان اسی طرح چھوڑ آئے لیکن ستائیس برس گزرنے کے بعد آج تک اس میں کسی غیر مسلم کے قدم نہیں آئے۔ خدا نے اس عمارت کو کافروں اور مشرکوں کے وجود سے محفوظ و مامون رکھا جس کی بنیادوں میں اس کے گھر اور اس کے محبوب رسول کے شہر کے سنگریزے پڑے ہوئے ہیں۔ اس میں ایک غریب، پابند صوم و صلوٰۃ، اور سچا مسلمان گھرانا آباد ہے۔

اساتذہ اور بزرگوں کی نظر میں

علامہ سیّد محمد انور شاہؒ کاشمیری کی نظر میں:

علامہ سیّد محمد انور شاہ کاشمیری، والد محترم کے خصوصی اساتذہ میں ہیں۔ حضرت شاہ صاحب سے آپ کو والہانہ لگاؤ تھا، درس میں، تقریر میں، تحریر میں، حتیٰ کہ نجی مجالس میں ہمیشہ شاہ صاحب کا ذکر کرتے، اور ان کے حوالے سے علوم و معارف بیان کرتے۔ اُن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کو اپنے لیئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب کو والد صاحب قبلہ کے ساتھ جو تعلّق تھا، جو خصوصی توجہات و عنایات تھیں، اور آپ کے علم و فضل پر جس قدر اعتماد تھا، وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب نے خوش ہو کر فرمایا، ”آپ کتاب کو پڑھ کر اس کا جوہر اور خلاصہ نکال لیتے ہیں اور یہ بات آپ کی تالیفات و تصنیفات کے مطالعہ سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔“

آپ نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز (۱۹۲۰ء میں) اگرچہ مفتی محمد کفایت اللہ[1] صاحب مرحوم کے مدرسے، مدرسہ امینیہ دہلی سے کیا تھا، مگر وہاں صرف ایک (تعلیمی) سال گزارا، اس کے بعد اپنے اساتذہ اور خاص طور پر مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی[2] نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے اصرار پر دیوبند چلے آئے، ابتدا سے حدیث، تفسیر اور فقہ کی بڑی کتابوں کی تدریس آپ کے ذمے ہوئی۔ جس وقت آپ نے دارالعلوم میں مسندِ درس کو رونق بخشی بمشکل آپ کی عمر ۲۲ برس ہو گی۔

---

(۱)۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی۔ برادر بزرگ علامہ شبیر احمد عثمانی۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۹ء تک دارالعلوم کے نائب مہتمم رہے، ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۰ء تک ڈیڑھ سال مہتمم رہے۔ م: ۱۹۳۰ء

(۲)۔ مفتی محمد کفایت اللہ، مفتی، محدث، جمعیۃ علمائے ہند کے سب سے پہلے صدر۔ مدرسہ امینیہ دہلی کے مہتمم۔ م:

کا اساتذہ نے علم وفضل کا اندازہ لگا لیا تھا، حضرت علامہ انور شاہ صاحب نے حدیث کی مشہور و بلند پایہ کتاب "مشکاۃ المصابیح" کی شرح لکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ رشید اور سعادت مند شاگرد کے لیے ایک مشفق، مگر عظیم استاد اور مرشد کی خواہش پوری نہ کرنا، ناممکن تھا۔ آپ نے مشکاۃ کی عربی میں شرح لکھنے کا آغاز کیا، اور کم وبیش پانچ برس میں اس کی تکمیل کی۔ جب مسودہ شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو ارشاد فرمایا:

"دل چاہتا ہے یہ کتاب میں شائع کروں، اور تمھاری ضروریات کے لیے تمھاری خدمت کروں۔ مگر میرے پاس اتنی گنجائش نہیں ہے۔ جو میں یہ عظیم کام کرسکوں۔"

بظاہر شاہ صاحب نے یہ الفاظ اس لیے فرمائے کہ آدمی جب بوڑھا ہوجاتا ہے، اور اپنے جوان بیٹے کو دیکھتا ہے، تو وہ اس احساس سے خوش ہوتا ہے کہ اس میں میرا ہی عکس ہے۔ ایسے ہی یہ تالیف اگرچہ مولانا محمد ادریس کی تھی، مگر اس میں درحقیقت علوم ومعارف اور حقائق شاہ صاحب ہی کے تھے، گویا انھوں نے اسے بالواسطہ اپنی ہی تصنیف سمجھا، جو ان کے روحانی فرزند اور جانشین کے ہاتھوں وجود میں آئی تھی۔ شاہ صاحب کی زندگی میں والد محترم نے جتنی کتابیں تالیف وتصنیف کیں، سب پر ان کی تقریظ ہے۔ لیکن تعلیق الصبیح شرح مشکاۃ المصابیح پر آپ کی تقریظ سب سے طویل، اور سب سے جامع ہے۔

حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں آپ نے جو قصیدۂ نعتیہ "لامیۃ المعراج" کے نام سے لکھا، اس پر شاہ صاحب نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"احقر محمد انور شاہ کشمیری نے یہ قصیدۂ مبارکہ، جناب علامہ فہامہ عالم ربانی مولانا مولوی محمد ادریس صاحب کاندھلوی کا مطالعہ کیا، جو کچھ مولانا علام نے احادیث اور نقول اعلام امت پیش کی ہیں، اور معراج جسمانی بحالتِ یقظہ اور رویتِ باری تعالیٰ ثابت کیا ہے، وہ محدث اور مفسر کی داد دینے کی چیز ہے۔"

ایسی ہی حلاوت، اور طاقت نظم کی، اور الجام اقتباس فصحا، اور بلغا، کی قدر دانی کا حصّہ ہے۔"

حق تعالیٰ قصیدۂ مذکورہ کو موجب حصولِ شفاعت جیسے کہ مؤلّفِ ممدوح نے تمنّا کی ہے، کردے، آمین یارب العالمین۔ (۲۲ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ)

جناب مولوی محمد ادریس صاحب شرح بر مشکوٰۃ شریف تالیف کردہ اند، دریں اثناء جناب موصوف در بلدہ حیدر آباد صانہا اللہ تعالیٰ رسیدہ در کتب خانہ شاہی شرح حافظ فضل اللہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہ از حفاظ حدیث و حنفی المذہب ہستند دریافتند و عزر شرح مذکور نیز بر طرز مشکوٰۃ شریف آوردند اکنوں شرح الیشان با تمام رسیدہ قابل رکنست کہ موجب نفع خلق اللہ باشد، بحق راستی شہادت دادہ آید کہ تا حال کدام نسخہ از مطبوعات مشکوٰۃ شریف، ہمچو خدمت مولوی صاحب مصرف بر بسیط گیتی موجود نیست۔

احقر محمد انور عفا اللہ عنہ
مدرسہ تعلیم الدین
ضلع سورت

جناب مولوی محمد ادریس صاحب نے مشکوٰۃ شریف کی شرح تالیف کی ہے۔ اس زمانہ میں مولانا موصوف حیدر آباد دکن میں تھے اور آپ نے وہاں کتب خانہ شاہی سے حافظ فضل اللہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح دریافت کی۔ علاّمہ موصوف حدیث کے حافظ اور حنفی مسلک کے بڑے عالم تھے۔ اور (آپ کی یہ تالیف نوادر روزگار سے ہے) مشکوٰۃ شریف کی شرح میں تورپشتی کا خلاصہ اور جوہر پیش کیا ہے۔ اب یہ تالیف مکمل ہو گئی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اللہ کی مخلوق اس سے استفادہ کرے۔ میں حق و صداقت کیلئے شہادت دیتا ہوں کہ کوئی نسخہ مطبوعہ مشکوٰۃ کی شرح میں مولوی صاحب کی شرح کی مانند روئے زمین پر موجود نہیں ہے۔

محمد انور

حضرت مولانا اشرف علیؒ تھانوی کی نظر میں

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی نظر میں آپ کی کتنی قدر و منزلت تھی، اس کا اندازہ تو اس محبت، توجہ، اور خصوصی برتاؤ سے ہی لگایا جاسکتا تھا جو حضرت کو زندگی میں اُن کے ساتھ تھا۔ حضرت تھانوی آپ کے اوّلین استاد تھے، اُنہی کے آگے سب سے پہلے زانوئے ادب تہہ کیا، اور حضرت کی مجلس، خانقاہ اور مدرسے ہی سے آپ کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا، حضرت تھانوی کے محبت کے واقعات اکثر والد محترم سناتے،

والدِ محترم سے حضرت تھانوی کے تعلق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے دادا، مولوی حافظ محمد اسماعیلؒ حضرت تھانوی کے پیر بھائی تھے، اور اس رشتے کے علاوہ دونوں میں انتہائی گہرے دو مخلصانہ تعلقات بھی تھے،

کاندھلہ سے تھانہ بھون کا فاصلہ اٹھارہ میل ہے؛ ہمارے دادا، اور حضرت کے باہمی تعلقات اور رسم و راہ کے قصّے والد صاحب اکثر سنایا کرتے۔ کئی بار فرمایا:

"تمھارے دادا ابا کو جب کاندھلہ میں حضرت تھانوی کا وعظ کرانا ہوتا، تو تھانہ بھون چلے جاتے۔ حضرت کے پاس ہی قیام ہوتا، اگلے روز واپس ہوتے تو فرماتے: مولوی اشرف علی! لوگوں میں تمھاری تقریر اور وعظ سننے کا اشتیاق ہے، یہ دو روپے کرائے کے رکھ لو۔ فلاں

تاریخ کو آ جانا" ۔ ؎۱

اور حضرت اپنے پیر بھائی کے ڈّڑ روپے پوری محبّت، اور خلوص کے ساتھ لے لیتے، اور پھر جو تاریخ مقرّر فرماتے، اسی پر کاندھلہ تنہا چلے جاتے، ہمارے دادے ابّا کسی کو تانگہ دیکر ریلوے اسٹیشن بھیج دیتے، اور وہ حضرت کو اسٹیشن سے اپنے ہمراہ لے آتا۔ والد صاحب پر حضرت کی شفقت و محبّت میں غالباً دادا جان کے ساتھ ان کے گہرے، اور مخلصانہ روابط کا بھی بڑا دخل تھا۔ یہی حال والد صاحب قبلہ کا بھی تھا، حضرت کے ساتھ بے پناہ محبّت اور عقیدت تھی۔ والد صاحب کو اپنے اساتذہ میں سے تین کے ساتھ جو خصوصی تعلق تھا، وہ ہم نے اور کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ کوئی درس، کوئی تقریر، کوئی وعظ، اور کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی جس میں والد صاحب تینوں حضرات کا ذکر نہ فرماتے حضرت تھانوی، علّامہ انور شاہ، اور علّامہ شبّیر احمد عثمانی۔

حضرت تھانوی، والد صاحب کے اوّلین استاد، اور اوّلین مربّی تھے، مگر ان کے دل میں کس قدر تعلق، کتنا احترام، اور کیسی قدردانی تھی، وہ والدِ محترم کی تصانیف پر حضرت کی تقاریظ سے نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ والد صاحب کے ساتھ خط و کتابت بھی رہی۔ بعض مسائل پر حضرت نے تبادلۂ خیال کیا، حضرت کی عادت تھی کہ وہ اپنے خصوصی، اور معتمد خلفاء اور تلامذہ کو بعض عنوانات پر لکھنے کے لیے فرماتے۔ خود اس پر نظرِ ثانی کرتے، اور بعد میں اس تحریر کو حضرت کے حکم سے شائع کیا جاتا۔ حضرت نے تصنیف و تالیف کے کاموں میں جن حضرات سے سب سے زیادہ مدد لی، ان میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، اور حکیم مصطفےٰ صاحب سرِفہرست ہیں، ان حضرات کے علاوہ والد صاحب کے ذمّہ بھی بعض تالیفی کام کئے۔ ؎۲

؎۱ حضرت تھانوی ہمیشہ تھرڈ کلاس سفر کرتے، سنا ہے کہ آخر عمر میں جب کمزور ہو گئے تھے تو انٹر کلاس میں سفر کرنے لگے تھے، سیکنڈ اور فرسٹ میں کبھی سفر نہیں کیا۔ تھانہ بھون سے کاندھلہ کا تھرڈ کا کرایہ اس زمانے میں چھ آنے تھا۔ (مولانا اشرف علی تھانوی ۔ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء ۔ ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء۔)

؎۲ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ م: ۱۹۷۴ء۔

بعض خطوط میں (جو کہ بحمداللہ محفوظ ہیں) حضرت تھانوی نے والد محترم کے علم و فضل کا اعتراف ایسے انداز میں کیا ہے کہ آج کے دَور میں شاید کوئی اپنے کسی ہم عصر کے لئے بھی آمادہ نہ ہو۔

والد محترم جب پہلی بار (۱۹۳۲ء) حج سے واپس آئے تو اس وقت حیدرآباد دکن میں قیام تھا، وہیں سے حضرت کے لئے مکہ مکرمہ سے لایا ہوا ایک رومال بطور ہدیہ بھیجا، ساتھ خط لکھا، اس میں ہدیے کا ذکر کیا، اور اس کے بعد دعار کی درخواست کی، دعار کی درخواست کے ساتھ ہی معاً حضرت کے مزاج کا خیال آیا کہ: ہدیہ بھیج رہا ہوں، اس کے ساتھ دعار کی درخواست ہے، کہیں ناگوار نہ گزرے کہ ہدیے کے عوض دعار کا طلب گار ہے، والد صاحب نے "دعا کی درخواست ہے" پر حاشیہ دیا۔ "کہ یہ جملہ مستانفہ ہے، اس کا ماقبل سے کوئی تعلق نہیں"۔ حضرت، والد محترم کی احتیاط، اور مزاج شناسی سے اتنا مسرور ہوئے کہ اسی خط پر، اس فقرے کے نیچے لائن کھینچی، اور لکھا: "ھَنِیْئاً لَکُمْ الْعِلْمْ" "علم تم کو مبارک ہو"

والد صاحب قبلہ نے بیان کیا کہ:

"ایک مرتبہ میں حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر تھا، صحیح بخاری کے "باب بدءِ الوحی" میں ایک روایت ہے، جس میں حضور علیہ السلام پر پہلی بار وحی کی کیفیت بیان کی گئی ہے، اس روایت میں الفاظ ہیں لقد خشیت علی نفسی (مجھے اپنے بارے میں خوف محسوس ہوا) روایت کے یہ الفاظ شارحین پر بہت مشکل گزرے ہیں، اور اس میں اشکال ہے کہ حضور کو کس چیز کے بارے میں خوف محسوس ہوا۔؟

حضرت تھانوی بھی اس روایت کے بارے میں کچھ کلام فرما رہے تھے، میری زبان سے یہ بات نکل گئی کہ: حضرت! فقیر نے اس روایت کے متعلق کچھ لکھا ہے، حضرت نے فرمایا: جو کچھ لکھا ہے، وہ مجھے ضرور بھیجیں"۔ میں بہت شرمندہ ہوا کہ میں نے کیوں ذکر کیا،

خاموش ہی رہتا تو بہتر تھا، عرض کیا "حضرت! اسبقتِ لسانی سے بات نکل گئی، وہ اِس درجے کی چیز کہاں ہے کہ آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش کی جائے۔"

حضرت نے فرمایا: "یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ وہ کس درجے کی چیز ہے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ اُسے بھیج دیں۔" میں تھانہ بھون سے کاندھلہ واپس آیا، اس تحریر پر نظرِ ثانی کی، اور صاف کر کے حضرت کی خدمت میں روانہ کر دی۔ حضرت نے اس تحریر کو بہت پسند فرمایا، اور یہ الفاظ کہے: "آپ کی تحریر میری معلومات میں اضافہ کا باعث ہوئی۔"

حضرت تھانوی کا یہ فرمانا کہ "معلومات میں اضافے کا باعث ہوئی"، والد محترم کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا، حضرت کا تو کسی کی تحریر کی توثیق فرما دینا، بہت بڑی بات تھی، چہ جائے کہ یہ فرمائیں کہ "میری معلومات میں اضافہ ہوا"۔

یہ تحریر دو صفحے پر مشتمل ہے، حضرت تھانوی نے اپنی ایک کتاب "الطرائف و الظرائف" حصہ دوم میں شائع کی ہے۔ تحریر سے پہلے یہ عبارت درج ہے:

"الفوائد الحدیثۃ من بعض الحواشی۔ کتبہا المولوی محمد ادریس الکاندھلوی"

تحریر یہ ہے:

"قولہ۔ مالی واخبرھا وقال لقد خشیت علی نفسی۔ لایخفی انہ بعد ان اوحی الیہ و تحقق بلوغ الوحی الیہ صار نبیاً، ولا یمکن ان یکون نبیاً ویکون شاکاً فی نبوتہ، بل لابد ان یکون عالماً بنبوتہ ضرورۃ وان الذی جاءہ ملک من عند اللہ تعالیٰ وان الذی بلغہ وحی من اللہ فحینئذ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم "لقد خشیت نفسی" مشکل۔ وحملہ علی انہ خشی علی تحمل اعباء النبوۃ وغیرہ مما لایوافق الکلام السابق رحمہ اللہ حق بعید الوجہ عندی انہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلہ خشی عند اوّل ما واجہہ الملک قبل ان یتحقق عندہ انہ ملک وقبل ان تشرف بالنبوۃ۔ والحاصل انہ خشی قبل تبلیغ الملک الوحی الیہ فان وقوع الخشیۃ حینئذٍ لایضر مثلہ۔ تحقق بعد ذلک عندہ نبوتہ مقارناً لتمام ما اوحی

الیہ ثم اراد ان یعرف حال خدیجۃ فذکر معہا حالہ السابق علی وجہ الابہام لا
ما ذکر معہا ما تحقق عندہ من امر النبوۃ لیظہر لہ حال خدیجۃ وانہا تصلح لذکر النبوۃ
معہا اولا اذ ربما لا یبدأ ہا بذکر النبوۃ لربما یخاف علیہا انہا تبدأ بالانکار وتواجہ
بالتکذیب فیشکل ارجاعہا بعد ذلک الی الحق لان العادۃ ان المنکر یصعب
رجوعہ الی ما انکرہ فصار ہذا الکلام کانہ من معاریض الکلام وکان صلی اللہ علیہ
وسلم یتکلم بمثلہ للاغراض الصحیحۃ وہذا الغرض من جملۃ تلک الاغراض وہذا ما خطر
بالبال ۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال ۔ ولعلک اذا نظرت فی ما ذکرہ الشراح ہٰہنا عرفت ان
ہذا الوجہ اقرب الوجوہ واحقہا بالقبول واللہ تعالیٰ اعلم ۔

یہی مضمون علامہ سندھی نے حاشیہ بخاری میں اختصار کے ساتھ لکھا ہے ۔

وھو ھذا ۔ قولہ لقد خشیت علی نفسی ، مقتضی جواب خدیجۃ والذھاب
الی ورقۃ ان ھذا کان منہ علی وجہ الشک ، وھو مشکل بانہ لما تم الوحی صار نبیاً
فلا یمکن ان یکون شاکاً بعد فی نبوتہ وفی کون الجائی عندہ ملکاً من اللہ تعالیٰ
وکون المنزل علیہ کلام رب العالمین ، نعم یمکن الشک فی بعض ذلک قبل تمام الوحی حین
ما جاءہ الملک اوّلاً مثلاً ۔ ویمکن ان یقال انہ صلی اللہ علیہ وسلم اراد بھذا الحکایۃ
عن احوالہ الاول ذکرہ علی وجہ یوھم بقاء الشک لہ بعد وان کان ھو حالۃ
الحکایۃ علی علم من الامر ولا شک لہ حینئذٍ اصلا لکن اراد اختبار خدیجۃؓ فی امرہ
لیعلم ما عندھا من العلم مرلعلہ لو ناجاھا بصریح القول بالنبوۃ فربما تلقتہ بالانکار
فیصعب بعد ذلک الرجوع الی الاقرار فاراد ان یأتی بالکلام علی وجہ الابہام
قصداً للاختیار ۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۔

قولہ لقد خشیت ۔ قال القاضی ابو الفضل عیاض بن موسی الیحصبی السبتی المالکی
رحمہ اللہ تعالیٰ ۔ لیس معناہ الشک فی ان ما اتاہ من اللہ تعالیٰ ، لکنہ خشی ان لا یقوی

علی مقاومۃ ھذا الامر ولا یطیق حمل اعباء الوحی فتزھق نفسہ لشدۃ ما لقیہ اوّلاً عند لقاء الملک۔

قلت۔ ویکون معنی خشیت علی نفسی انہ یخبرھا بما حصل لہ اولا من الخوف لا انہ فی الحال خائف واللہ اعلم۔ اور فرجع بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یرجف فؤادہٗ۔ اور زملونی زملونی اور حتی ذھب عنہ الروع۔ عہ

ان تمام الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تمام تر جسمانی اضطراب اور پریشانی تھی جو جبریلؑ امین نے دبانے سے آپ کو لاحق ہوئی اور ہونی چاہیئے تھی، اس لئے کہ دفعتاً ملکیت اور وحی ربانی کا بارِ عظیم آپ کی بشریت پر پڑا معاذ اللہ آپ کو اپنی نبوت ورسالت میں کوئی شک نہ تھا، جب آپ خوگر ہو گئے تو یہ اضطراب اور پریشانی بھی نہ رہی، بلکہ پہلے ہی موقع پر اضطراب پیش آیا۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کو جب پہلی مرتبہ عصا عطا ہوا تو ولّیٰ مدبراً ولم یعقب یہ صورت پیش آئی۔

اور حضرات عارفین نے جب کبھی کسی کو اپنی قوتِ قدسیہ سے دفعتاً اس طرح فیض پہنچایا ہے ان کو بھی اس قسم کا اضطراب لاحق ہوا ہے جس طرح ایصالِ فیض اور حصولِ فیض میں وہ حضرات آپ کے وارث ہوئے اسی طرح روع اور فزع میں بھی آپ کے وارث ہوئے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (۱)

مولوی الحاج حکیم انیس احمد صدیقی صاحب بیان کرتے ہیں کہ:

"حضرت تھانوی علیل تھے، مولوی منفعت علی وکیل سہارنپور سے آئے ہوئے تھے، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور کے بہت سے اساتذہ اور طلبہ حضرت کی زیارت اور مزاج پرسی کے لئے آئے ہوئے تھے، احقر (انیس احمد) بھی حاضر ہوا، مولانا محمد ادریس صاحب بھی آ گئے، حضرت نے بڑی محبت سے بٹھایا، اور

لہ۔ الطرائف والظرائف۔ از مولانا اشرف علی تھانوی حصہ دوم، ص: ۲۱-۲۳، طبع تھانہ بھون شوال ۱۳۵۰ھ
عہ یہ مضمون ایک اصطلاحی اور علمی بحث ہے جو اہل علم اور طلبہ سے متعلق ہے اس وجہ سے عبارتِ مذکورہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا صرف حاصل مقصد کے طور پر چند کلمات لکھ دئے گئے۔

خصوصی توجہ کے ساتھ گفتگو فرمائی، ایسی توجہ میں نے کسی اور عالم کے ساتھ نہیں دیکھی تھی، دورانِ گفتگو تفسیر مظہری کا ذکر آیا کہ وہ تفاسیر میں نہایت اعلیٰ درجے کی تفسیر ہے، مولانا محمد ادریس صاحب نے بیان کیا کہ سماع کے جواز میں بعض لوگ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا جو فتویٰ نقل کرتے ہیں، میں نے اس کی تحقیق کی ہے، وہ قاضی ثناء اللہ، صاحب تفسیر مظہری نہیں ہیں، کوئی اور عالم ہیں، حضرت یہ سُن کر بہت خوش ہوئے، اور فرمانے لگے: آپ کی تحقیق سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔"

جب والد صاحب قبلہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ لکھنی شروع کی، جلد اوّل کی تکمیل پر مسودہ حضرت کی خدمت میں لے کر گئے، حضرت نے جستہ جستہ مقامات سے مسودے کو سُنا اور ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا:

"احقر اشرف علی تھانوی نے مقاماتِ ذیل خود فاضل مؤلف یعنی جامع کمالاتِ علمیہ وعملیہ مولوی حافظ محمد ادریس کاندھلوی سلمہ اللہ تعالیٰ کی زبان سے سُنے، جس کے سننے کے وقت بالکل یہ منظر سامنے تھا۔

یزیدک وجہہ حسنا

اذا ما زدتہ نظرا

جتنی میں زیادہ نظر کرتا ہوں، تیرے چہرے پر حُسن کی زیادتی نظر آتی ہے۔

(جن مقامات کو سنا) وہ یہ ہیں۔ اوّل۔ دیباچہ کتاب، ثانی، ثالث۔ دربار نجاشی میں حضرت جعفر کی تقریر، رابع۔ اصحابِ صفہ، خامس حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی نزاہت قبل نبوت، سیر کے جتنے ضروری حقوق ولوازم ہیں، ماشاء اللہ ان کو خاص طور پر پورا کیا گیا ہے، جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

کتاب کا عنوان ومعنون بہت دل کش، اور اس کا مصداق ہے:

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

اگر میرے پاس طاقت وہمت ہوتی تو اس کو اوّل سے آخر تک سنتا، مگر ضعف و ضیقِ وقت سے یہ آرزو پوری نہ کر سکا، بقیہ کتاب بھی انشاء اللہ وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ کا مظہر ہوگی۔"

تقریظ کافی طویل ہے، اور آخر میں تاریخ ۹ شوال ۱۳۵۸ھ درج ہے۔(۱)
شاید اس بات کے کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہو کہ موجودہ دور کے علماء میں حضرت تھانوی کو والد محترم کے علم و فہم پر اور وسعتِ مطالعہ پر جتنا اعتماد تھا، اتنا بجز مولانا ظفر احمد عثمانی رح کے اور کسی پر نہ تھا۔(۲)

اسی طرح یہ بات بھی کسی افراط و تفریط کے شائبے کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ مولانا ظفر احمد عثمانی رح کے علاوہ، حضرت تھانوی کے علوم و معارف، اور حقائق و دقائق پر کسی کی اتنی وسیع اور گہری نظر نہ تھی جتنی والد محترم کی۔ یہی وجہ ہے کہ والد محترم نے اپنی تصانیف میں جتنا حضرت تھانوی کے علوم و معارف کو سمویا؛ اور دوسروں تک پہنچایا، وہ دوسروں سے ممکن نہ ہو سکا
درس میں والد صاحب قبلہ کا عالمانہ، اور محققانہ رنگ، بعض کم فہم طلبہ کو عجیب معلوم ہوتا تھا، عربی مدارس کے طلبہ عام طور پر کتاب کا نفسِ مطلب سننے کے عادی ہوتے ہیں۔ والد صاحب کا انداز یہ تھا کہ حدیث کا درس ہے، راویوں پر بھی بحث ہے، سند کی بھی تحقیق و تدقیق ہو رہی ہے، حدیث کی عبارتوں سے صرف و نحو کے مسائل کا استنباط ہو رہا ہے۔ تصوف کے اسرار و حکم بھی بیان ہو رہے ہیں؛ حضرت تھانوی اُن دنوں (جب والد صاحب پہلی بار ۱۳۲۱ھ میں دار العلوم میں مدرس ہوئے) دار العلوم کے سرپرست تھے، اُن کے سامنے ذکر ہوا کہ: مولانا کاندھلوی نے حدیث کے درس میں اسماء الرجال پر بحث کی، اور یہ کہا کہ، حضرت تھانوی اپنے ساتھ کسی کا پیچھے پیچھے چلنا پسند نہیں کرتے۔ حضرت عبداللہ

۱۔ سیرۃ المصطفیٰ، طبع لاہور، جلد اوّل، ص: ۳۵۹-۳۶۰۔
۲۔ اس سے مراد حضرت کے ہم عصر علماء نہیں، بلکہ حلقۂ خلفاء اور تلامذہ کے علماء ہیں۔

بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اثر میں ہے کہ وہ بھی اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ کوئی ان کے پیچھے چلے، اور فرمایا کرتے: لتابع ذل وللمتبوع فتنۃ یعنی پیچھے چلنے والے کے لئے ذلّت ہے، اور جس کے پیچھے چلا جائے اس کے لئے فتنہ کا سبب ہے کہ اس میں تکبّر اور بڑائی کی خو بو آسکتی ہے۔

حضرت تھانوی نے یہ واقعہ سُنا، اور فرمایا: "آج اسی علم کی ضرورت ہے۔" حضرت کا یہ جواب سُن کر شکایت کنندہ بہت نادم ہوئے۔(۱)

۱؎ ۔ اس واقعہ کا ذکر مولانا خیر محمد جالندھر مرحوم مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان کی مجلس میں ہوا، حکیم انیس احمد صدیقی صاحب اس واقعہ کے راوی ہیں، وہ خود اس مجلس میں موجود تھے۔

علّامہ شبّیر احمد عثمانی کی نظر میں!

علّامہ شبّیر احمد عثمانی ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء سے ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۴ء تک دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم رہے۔ ان دنوں والد صاحب قبلہ حیدر آباد دکن میں مقیم تھے، علّامہ عثمانی نے تحریک کی کہ دارالعلوم میں دورۂ حدیث کے طرز پر، دورۂ تفسیر کا بھی اہتمام کیا جائے، اور جو طلبا تفسیر پڑھنا چاہیں، انھیں اس میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد داخلہ دیا جائے۔ چنانچہ مدرسہ میں دورۂ تفسیر کا اضافہ کیا گیا، اور علّامہ عثمانی نے بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند، والد صاحب کو حیدر آباد دکن خط لکھا کہ: یہاں دارالعلوم میں دورۂ تفسیر کا اضافہ کیا گیا ہے، اور آپ کو "شیخ التفسیر" منتخب کیا گیا۔ آپ اپنی منظوری اور تاریخ آمد سے مطلع فرمائیں"۔

علّامہ عثمانی کے فرمانے پر والد صاحب ۱۹۳۹ء میں حیدر آباد دکن کا قیام ترک کر کے دیوبند چلے آئے، اور دس برس کے وقفے کے بعد پھر اپنے اساتذہ، احباب، اور ساتھیوں کے ساتھ اسی علمی مرکز میں آکر خدمتِ دین میں مصروف ہو گئے، جہاں سے دینی علوم کی تکمیل کی تھی، اور ایک عرصہ تک درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دے چکے تھے[1]

---

[1] علّامہ شبیر احمد عثمانی۔ ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۵ء — ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء۔

والد صاحب کے دوبارہ دیوبند آنے، اور شیخ التفسیر کی حیثیت سے آنے پر بعض افراد کا کیا ردِّ عمل ہوا! یہ خاصی تلخ داستان ہے، اگرچہ یہ داستان، والد مرحوم کی زندگی کا ایک ایسا حصّہ ہے جسے ان کا تذکرہ کرتے وقت جدا نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس وقت میرے پیشِ نظر اجمال واختصار ہے، میں صرف بنیادی واقعات کا احاطہ کرنا چاہتا ہوں، اگرچہ ان چند صفحوں میں وہ بھی ہوتا نظر نہیں آتا۔ ارادہ یہی ہے کہ اس وقت تو والد محترم کی علمی و عملی زندگی کا ایک خاکہ ان لوگوں کی خدمت میں پیش کردوں جنھیں والدِ محترم سے والہانہ محبت تھی، اور جن میں سے ہر شخص میرے لئے سوالیہ نشان ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد انشاء اللہ ان کی علمی، اور عملی زندگی پر تفصیل کے ساتھ لکھنے کا آغاز کروں گا!

میں شاید موضوع سے کچھ ہٹنے لگا، عرض یہ کرنا تھا کہ علامہ عثمانی نے والد صاحب کو بلایا تو کس قدر و منزلت کے ساتھ، ان کے دل میں اپنے ایک شاگرد کی کیا حیثیت تھی۔ اس کا اندازہ نہ اُن کی تحریروں، اور آراء سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے والد محترم کی مؤلفات پر رقم فرمائیں، لیکن میں ایک اور واقعہ بھی ذکر کروں گا جس سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ علامہ نے والد صاحب کو کسی ذاتی تعلّق، یا قرابت کی بنا پر اس عظیم منصب کے لئے نہیں بلایا تھا۔ بلکہ ان کے سامنے علم و فضل کا انتخاب تھا، جو انھوں نے دارالعلوم کے لئے کیا۔

جب والد صاحب حیدرآباد سے دیوبند شیخ التفسیر کی حیثیت سے آگئے تو مدرسہ کے دارالحدیث میں ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں دارالعلوم کے تمام اساتذہ، اور طلبہ نے شرکت کی، علامہ عثمانی نے والد محترم کے بارے میں کلماتِ توصیف کہے، اور اپنی تقریر کے آخر میں سب سے عجیب بات یہ کہی۔ آپ نے فرمایا:

"قیامت کے روز اگر اللہ تعالیٰ نے سوال کیا۔ کہ شبیر احمد! ہم نے تجھے دارالعلوم دیوبند کا صدر مہتمم بنایا تھا، بتا۔ تو نے مدرسہ کی کیا خدمت کی۔؟ تو میں جواب دوں گا کہ پروردگارِ عالم! دارالعلوم میں تیری کتاب

کی تفسیر پڑھانے کے لئے مولوی ادریس کو بلایا تھا۔"

اس کے بعد علامہ مرحوم نے فرمایا:

"مجھے یقین ہے، میرے اس عمل پر اللہ تعالیٰ میری بخشش فرمادیں گے۔" (۱)

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی باوجود اپنے علمی تبحر کے اکثر اہم اور مشکل علمی مسائل میں والا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے گفتگو فرماتے اور رائے لیتے اور بارہا یہ فرمایا کرتے تھے مولوی ادریس کی بات نہایت ہی جچی تلی ہوتی ہے، اور علمی نقول نکال لانے میں ان کی کوئی ہمسری نہیں کرسکتا اور کبھی کبھی بڑی ہی محبت کے انداز میں فرمادیا کرتے کہ یہ صرف عالم ہی نہیں یہ تو چلتا پھرتا کتب خانہ ہے۔

---

(۱) اس واقعہ کا ذکر والد صاحب مرحوم نے خود بھی فرمایا، مگر بہت اجمال کے ساتھ، والد محترم کی وفات کے بعد میں سرگودھے گیا، وہاں مولانا قاری جلیل الرحمان صدیقی (مہتمم مدرسہ عربیہ مدینۃ العلوم) نے یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا، اور فرمایا کہ: میرا دور طالب علمی تھا، اور میں خود اس اجتماع میں موجود تھا۔ کوئٹہ میں والد مرحوم کے ایک شاگرد، جو کہ نسباً ہمارے رشتہ دار بھی ہیں حکیم مولوی حافظ محمد الیاس نانوتوی ہیں۔ انھوں نے بھی اس واقعہ کی توثیق کی اور بیان کیا کہ "میں بھی اس جلسہ میں موجود تھا"۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

یہ بہت خوشی کا مقام اور مبارک فال ہے۔ ہندوستان کے علماء میں قرآن کریم اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا ایک خاص ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔

مختلف عنوانوں سے اہلِ علم اس پاکیزہ غرض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ ابھی حال میں ہمارے مکرم بھائی مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے جو مدت دراز تک دار العلوم دیوبند اور دوسرے مقامات پر قرآن و حدیث اور مختلف علوم و فنون کا درس دیتے رہے ہیں۔ سالہا سال کی شبانہ روز محنت و کاوش سے مشکوٰۃ شریف کی نہایت جامع و کامل شرح تیار کی ہے، جو فی الحقیقۃ مشکوٰۃ کی تمام مطبوعہ شروح سے مستغنی کرنے والی اور طالب حدیث کے لئے مباحث حدیثیہ کا بہت نادر ذخیرہ بہم پہنچانے والی ہے، مولوی صاحب ممدوح کی خوش قسمتی سے کتب خانہ آصفیہ میں خطابی کی معالم السنن نیز طیبی کی شرح مشکوٰۃ اور تورپشتی کی شرح مصابیح کا نسخہ موجود تھا۔ یہ دونوں چیزیں نوادر روزگار میں سے ہیں۔

ان سب کے نہایت نفیس اقتباسات اور خلاصے آپ نے اپنی شرح میں درج کر دیئے ہیں۔ اور ساتھ مسائل فقہیہ تحت الحدیث کے ذیل میں حنفی مذہب کی بڑی بھاری خدمت انجام دی ہے اخلاق، رقاق یا اسرار و حقائق کا مادہ بھی ان فنون کی کتب معتبرہ سے لیا ہے۔

بہر حال بحیثیت مجموعی میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف مشکوٰۃ شریف بلکہ حدیث فقہ تصوف کلام وغیرہ کئی علوم کی یہ عظیم الشان خدمت ہے جو اس آخری دور میں ہمارے لائق بھائی کے ہاتھوں پر حق تعالیٰ نے اپنے فضل و توفیق سے انصرام پہنچائی ہے۔ امید ہے کہ اہلِ علم اس کے مطالعہ کے بعد میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔

العبد شبیر احمد عثمانی دیوبندی

۹ ربیع الآخر ۱۳۴۹ھ

حضرت میاں اصغر حسین صاحب کی نظر میں :

حضرت میاں اصغر حسین صاحب، علامہ انور شاہ کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں استاد الحدیث تھے۔ بڑے عابد و زاہد تھے، قناعت کا حال یہ تھا کہ مدرسہ سے جو تنخواہ وصول کرتے وہ گھر پہنچنے تک ختم ہو جاتی۔ کسی نے ایک بار پوچھا :

"حضرت جب آپ پوری تنخواہ تقسیم ہی کر دیتے ہیں تو لیتے کیوں ہیں۔؟ مدرسہ میں فی سبیل اللہ پڑھا دیا کریں"۔ آپ نے جواب دیا: تنخواہ اس لئے لیتا ہوں کہ کسی کی احتیاج نہ ہو، کبھی کسی کی طرف دیکھنا نہ پڑے۔ اللہ تعالیٰ خرچ چلا دیتے ہیں تو تنخواہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتا ہوں، اگر کبھی ضرورت ہوتی ہے تو تنخواہ میں سے بھی کچھ اپنے اوپر خرچ کر لیتا ہوں"۔

حضرت میاں صاحب، والد صاحب قبلہ کے اساتذہ میں ہیں۔ میاں صاحب رح نے سالانہ امتحان میں والد صاحب کا ابو داؤد شریف کا پرچہ جواب دیکھا، بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "مولوی ادریس! تم نے اساتذہ کو شرمندہ کیا"۔

جب والد صاحب ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد دکن سے دوبارہ دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر بن کر آئے تو بعض لوگوں نے مخالفت کی، میاں صاحب کو معلوم ہوا تو فرمایا :

ملہ۔ حضرت میاں اصغر حسین۔م: ، دارالعلوم دیوبند کے اساتذۂ حدیث میں معروف و ممتاز، بڑے عابد و زاہد، اور متقی پرہیزگار تھے۔

"بھئی! بات یہ ہے کہ ہمارے جو پرانے مدرس ہیں، وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو نیا مدرس آئے وہ ہم سے کم تر آئے، بہتر نہ آئے۔ کم تر آئے گا تو ان سے دب کر رہے گا، اور علم و فضل میں برتر آئے گا تو ان کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا۔"

ایک بار، والد صاحب قبلہ حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ میاں صاحب، انہی کی کتاب "تعلیق الصبیح شرح مشکاۃ المصابیح" کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ والد صاحب کو دیکھ کر فرمایا: مولوی ادریس! یہ کتاب تم نے بہت اچھی لکھی، میں اکثر اس کا مطالعہ کرتا ہوں، اور بعض مرتبہ کئی کئی گھنٹے اسے دیکھتا رہتا ہوں، پھر فرمایا: مولوی صاحب! علم والے ایک سے ایک بڑھ کر ہیں، اللہ تعالیٰ کا جس پر فضل ہو وہ اس کو اپنے دین کی خدمت کا موقع عطا کر دیتا ہے اور اس سے اپنے دین کی خدمت لے لیتا ہے۔"

مولانا ظفر احمد عثمانی کی نظر میں:

مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خواہر زادے، اور اکابر خلفاء میں سے تھے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب موجودہ دور کے زبردست علماء میں سے تھے۔ علوم حدیث پر ان کی نظر اتنی گہری اور وسیع تھی کہ علامہ شبیر احمد عثمانی نے اپنی بلند پایہ تصنیف "فتح الملہم شرح صحیح مسلم" میں مولانا موصوف کی مایہ ناز کتاب "اعلاء السنن" کے جگہ جگہ حوالے دیئے ہیں۔

مولانا عثمانی کی تصنیف، اعلاء السنن، حضرت تھانوی کے حکم سے لکھی گئی، مولانا موصوف پہلی جلد لکھ کر حضرت تھانوی کی خدمت میں لے گئے، حضرت نے دیکھا اور پسند فرمایا، دوسری جلد لکھنے کا حکم دیا، مولانا نے دوسری جلد مکمل کی، اور وہ بھی حضرت تھانوی کی خدمت میں پیش کی، حضرت نے بے حد پسندیدگی کا اظہار کیا، اور اتنا خوش ہوئے کہ جو چادر اوڑھے ہوئے تھے وہ اتار کر مولانا عثمانی کو اڑھادی، اور فرمایا: "علمائے احناف پر، امام ابو حنیفہ کا بارہ سو برس سے قرض چلا آرہا تھا، الحمد للہ آج وہ ادا ہو گیا۔" (۱)

---

(۱) - مولانا ظفر احمد عثمانی - ۱۳۱۰ھ/ ۔۔۔۔ ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء

والد مرحوم کے استاد تھے، مظاہر علوم سہارن پور میں اُن سے مشکوٰۃ، ہدایہ اور دو ایک عربی ادب کی کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل کی،

گزشتہ سال اِنہی دنوں [1] ناچیز راقم نے خواب دیکھا کہ:

"ایک خوبصورت چار منزلہ عمارت ہے، میں سب سے اوپر کی منزل میں گیا، وہاں ایک خوبصورت کشادہ، اور روشن کمرہ ہے، اس میں مسہری بچھی ہے، اس پر مولانا ظفر احمد عثمانی بیٹھے ہیں، اُن کی صورت بالکل علامہ شبیر احمد عثمانی جیسی ہے، اُنہی جیسے کپڑے (کھدر کا سفید کرتہ، اور کھدر کا مغلئی پاجامہ) پہنے ہوئے ہیں، اور بہت صحت مند نظر آرہے ہیں میں مولانا عثمانی کو دیکھکر بہت حیران ہو رہا ہوں کہ اِن کی صورت بالکل علامہ عثمانی جیسی ہوگئی ہے، اسی تحیّر کے عالم میں ایک منزل نیچے اُتر کر تیسری منزل میں آیا، وہاں بھی اسی طرح ایک خوب صورت اور روشن کمرہ ہے، اس میں بھی ویسی ہی مسہری بچھی ہے جیسی اوپر کی منزل میں تھی، اس مسہری پر والد صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، اس کے بعد سلسلۂ خواب منقطع ہوگیا۔"

اگلے روز والد صاحب سے خواب بیان کیا، خواب سُن کر فرمانے لگے:

"دو سال قبل میں ٹنڈو الہ یار گیا تھا، مولانا عثمانی کی خدمت میں حاضر ہوا، کچھ دیر گزری تھی کہ دَورۂ حدیث کی جماعت، بخاری شریف پڑھنے آگئی، مولانا فرمانے لگے: مولوی ادریس! آج تم سبق پڑھاؤ۔ میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی موجودگی میں، میں کیسے پڑھا سکتا ہوں، مولانا نے اپنے مخصوص تحکّم کے سے انداز میں فرمایا "ہمارے بعد تم ہی ہو" اور پھر بطور حکم فرمایا کہ۔ آج تم بخاری کا درس دو، چنانچہ میں نے مولانا کی موجودگی میں ان کی جماعت کو وہیں سے بخاری شریف کا درس دیا، جہاں سے اُس روز مولانا کو دینا تھا، تمہارا یہ خواب اِس واقعہ کی تعبیر معلوم ہوتا ہے۔"

---

[1] والد صاحب کی وفات سے تقریباً چار ماہ قبل، مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں یہ خواب دیکھا تھا۔

"یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد والد صاحب نے فرمایا، شبیر احمد کا مقام اس سے بھی بلند معلوم ہوتا ہے۔"

والد صاحب کا انتقال ہوا تو علماء میں سب سے پہلے مولانا عثمانی کا مکتوب گرامی موصول ہوا، اور خط کے ساتھ عربی میں مرثیہ، مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا:

"۲۸ جولائی کو مولانا محمد ادریس صاحب کی خبر انتقال پُر ملال سن کر سناٹے میں آگیا، اور دیر تک انا للہ وانا الیہ راجعون کا تکرار کرتا رہا، پھر درس بخاری کے بعد خاص دعا کی اس کے بعد گھر گیا، قیلولہ کے لئے لیٹا تو چند اشعار موزوں ہو گئے جو ارسال خدمت ہیں کسی اخبار یا رسالے میں شائع کرادیئے جائیں۔

مولانا مرحوم ایسے جید علمائے باعمل میں سے تھے جن پر ان کے اساتذہ کو فخر ہے مرحوم نے سہارن پور میں مجھ سے مشکاۃ شریف، اور دو ایک عربی ادب کی کتابیں پڑھی تھیں، پھر یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ شارح مشکاۃ ہو گئے، اور تعلیق الصبیح کے نام سے عربی میں مشکاۃ کی ایسی شرح لکھی جو ہمیشہ ان کا نام روشن رکھے گی، اور علماء سے خراج تحسین وصول کرتی رہے گی، ان کی سیرت مصطفیٰ، اور تفسیر قرآن بھی بہت خوب ہے، اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائیں، اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔" (۳۰ جولائی ۷۴ء)

جو عربی مرثیہ لکھا، وہ بھی عجیب وغریب ہے، بعض اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

" دنیا کے لئے تباہی ہو، کہ اس کی نعمتیں ہمیشہ باقی نہیں رہتیں، اور وہ تمام چیزیں جو ہمارے پاس ہیں، فنا ہو جانے والی ہیں۔

میاں ادریس! تم فنا نہیں ہو سکتے کیوں کہ تمھاری یاد، اور ذکر ہمیشہ رہے گا، اور انسان کا ذکر، اور اس کی یاد، اس کی دوسری زندگی ہوتی ہے، میں تو آرزو کرتا تھا کہ تم میرے جانشین ہو گے، حدیث، قرآن اور تفسیر کے درس کے لئے۔

بے شک تم تمام علوم کے سمندر تھے، اور حق یہ ہے کہ تم بڑے عالم ربانی تھے تم تو

بڑی صلاحیتوں والے تھے، صاحبِ تقویٰ تھے، تمہارا ظاہر و باطن ایک تھا۔"

مگر آہ کسے معلوم تھا کہ اپنے عظیم شاگرد کی یاد میں آنسو بہانے والا یہ عالمِ جلیل زیادہ دیر اپنے شاگرد سے جدا نہ رہ سکے گا۔ مولانا عثمانی اپنے شاگردِ رشید سے چار مہینے گیارہ دن بعد جا ملے۔ [۱]

---

[۱] - والدِ محترم کی تاریخِ وفات ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء ہے، اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی تاریخِ وفات ۸ دسمبر ۱۹۷۴ء ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی نظر میں :

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم[۱] کا جو علمی رتبہ تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں، ایک علامہ شبلی نعمانی کے خاص شاگرد اور جانشین تھے، علامہ شبلی نے سیرۃ النبی کا آغاز کیا، دو جلدیں لکھ پائے تھے کہ خالق حقیقی سے جا ملے، بقیہ چار جلدیں سید صاحب نے تالیف کیں۔
شبلی نعمانی کی وفات کے بعد آپ نے حضرت تھانوی سے رجوع کیا۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان تشریف لائے۔ جمہوریہ پاکستان کا دستور، کتاب و سنت کے مطابق بنانے کے لئے تعلیماتِ اسلامی بورڈ کے نام سے ایک مجلس بنائی گئی تھی، سید صاحب اس کے صدر چنے گئے۔ دینی علوم کے ساتھ ساتھ، جدید عصری علوم پر بھی سید صاحب کی وسیع اور گہری نظر تھی۔ مغربی ممالک کی سیاحت بھی کی۔

سید صاحب جب بھی لاہور تشریف لاتے، جامعہ اشرفیہ کے مہمان خانے میں ٹھہرتے، والد صاحب قبلہ کے ساتھ علمی گفتگو رہتی۔ علم کلام پر سید صاحب نے ایک کتاب لکھی، اس کا مسودہ لے کر آئے، کئی روز لاہور قیام رہا۔ مسودہ کے اکثر حصے والد صاحب کو سنائے، والد صاحب نے اس کے بعض حصوں پر تنقید کی، اور فرمایا کہ: سید صاحب! آپ کی یہ

---

[۱] مؤرخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی۔ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء — ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء

تحریر، مسلک اہلِ سنت والجماعت سے ہٹی ہوئی ہے۔" سیّد صاحب اس وقت خاموش رہے، تین چار روز بعد کراچی واپس جانے لگے، تو والد صاحب، اور مولانا خیر محمدؒ جالندھری[۱] سیّد صاحب کو رخصت کرنے سڑک تک آئے (ناچیز راقم بھی موجود تھا) سیّد صاحب جب گاڑی میں سوار ہونے لگے تو مسکرا کر فرمایا: "میں نے علم کلام پر جو مسودہ مرتّب کیا تھا، اب اُسے چھپوانے کا ارادہ ملتوی کر دیا، کچھ اللہ میاں کے ڈر سے، اور کچھ مولوی ادریس کے ڈر سے" اور پھر واقعی سیّد صاحب نے وہ مسودہ طبع نہیں کرایا۔

ایک مرتبہ جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ میں والد صاحب نے تقریر کی، صدارت سیّد صاحب کی تھی، سیّد صاحب نے پوری تقریر بڑے غور سے سُنی، اور بعد میں فرمایا: مولانا! آپ کی تقریر مکمّل تھی، مدلّل تھی، مسلسل تھی۔"

ایک بار فرمانے لگے: "مولانا دل چاہتا ہے آپ کا علم چرالوں۔"

کئی اہلِ علم نے بیان کیا کہ سیّد صاحب سے اگر کوئی تفسیر، یا حدیث کے متعلق سوال کرتا تو فرماتے کہ: "مولوی ادریس صاحب سے رجوع کریں۔"

سید صاحب کے دل میں والد صاحب کی یہ عزت و احترام صرف اس بنا پر تھا، وہ جانتے تھے کہ انھیں قرآن و حدیث کا صحیح علم ہے، ورنہ سیّد صاحب کو بخوبی علم تھا کہ مولانا ادریس صاحب نے ان کے استاد محترم علامہ شبلی نعمانی کا مختلف مسائل میں رد کیا ہے۔

مولانا طفیل احمد جالندھری[۲] کہتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ مشہور عالمِ دین، اور مؤرخِ اسلام علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم سے خلقِ قرآن کے بارے میں بحث فرما رہے تھے، کلامِ الٰہی کے غیر مخلوق اور الفاظ کے مخلوق ہونے پر ایسی مدلّل و مبرہن تقریر کی کہ حضرت سیّد صاحب پر

---

[۱] ۔ مولانا خیر محمد جالندھری م ۔ اکتوبر ۱۹۷۰م ۔ علامہ شبلی نعمانیؒ ۱۹۱۴م

[۲] ۔ مولانا طفیل احمد جالندھری، والد صاحب کے زمانہ دارالعلوم کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔

وجد کی کیفیت طاری ہوگئی، انتہائی بشاشت اور سرور کے عالم میں فرمانے لگے:
"مجھے کسی کا علم چرانے کا کبھی خیال پیدا نہیں ہوا، مگر دل چاہتا ہے کہ مولوی ادریس کا علم چرالوں۔"

حضرت مفتی محمد حسنؒ صاحب کی نظر میں:

جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی، اور حضرت تھانوی کے خلیفۂ خاص، مفتی محمد حسن صاحب مرحوم، عمر میں والد صاحب سے کافی بڑے تھے، پھر علماء میں، اور خاص طور پر حضرت تھانوی کے خلفاء اور متوسلین میں مفتی صاحب کا بہت بڑا رتبہ تھا، اپنی بعض منفرد خصوصیات کی بناء پر وہ سب میں محترم اور ممتاز تھے۔ لیکن ہم نے، بلکہ بہت سوں نے دیکھا کہ مفتی صاحب والد صاحب قبلہ کی کس قدر عزت و تکریم کرتے تھے۔ مفتی صاحب نے والد صاحب کو بھاول پور سے جس محبت اور خلوص سے بلایا، وہ سب حضرات کے علم میں ہے۔

مفتی صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا: مولانا صاحب! آپ کا جامعہ اشرفیہ میں آنا تائید غیبی سے ہوا ہے، پھر اپنے ایک مرید کا خواب بیان کیا: اس نے دیکھا کہ دار العلوم دیوبند میں اکابر و مشائخ جمع ہیں، مشورہ اس امر میں ہو رہا ہے کہ پاکستان بن گیا ہے، وہاں لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے کس کو بھیجا جائے، سب نے طے کیا کہ مولوی ادریس کو بھیجا جائے۔ چنانچہ حضرت مدنی، اور علامہ عثمانی، مولانا کو لے کر روانہ ہوئے۔ حضرت مدنیؒ پاکستان کی سرحد تک پہنچا کر واپس تشریف لے گئے، اور علامہ عثمانی لاہور تک آئے، اور پرانے جامعہ اشرفیہ (نیلہ گنبد)

ملہ۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸م — ۱۳۸۰ / ۱۹۶۱م

کے صحن میں مولانا کو کھڑا کر کے چلے گئے "۔

اسی اثنار میں والدِ محترم نے اپنا خواب بیان کیا: کہ علامہ انور شاہ تشریف فرما ہیں، اور گویا سفرِ آخرت قریب ہے، مجھے اپنے پاس بلایا، اور صحیح بخاری کا نسخہ میرے ہاتھ میں دیا۔ اس کے کچھ روز بعد علامہ شبیر احمد عثمانی کو خواب میں دیکھا کہ انھوں نے بھی بخاری شریف کا نسخہ دیا۔

والد صاحب نے فرمایا: جامعہ اشرفیہ میں بخاری شریف ان دونوں بزرگوں کی توجہ سے پڑھانے کا موقع ملا ہے۔ اور ان خوابوں میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ان دونوں حضرات کے علم کا خلاصہ اور جوہر نکال کر پڑھانا ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے اپنے ضعف اور بیماری کے باوجود درسِ والد صاحب کے درسِ بخاری میں شرکت فرمائی، اور اس قدر اہتمام، اور پابندی فرماتے تھے کہ شرکائے جماعت کے لئے بھی مشکل ہے۔

ناچیز راقم نے بارہا مختلف مجلسوں میں دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب بھی موجود ہیں، اور والد صاحب بھی، مفتی صاحب نے کسی علمی موضوع پر کچھ کہنا شروع کیا اور درمیان میں خاموش ہو گئے، اور فرمانے لگے: "مولانا صاحب کی موجودگی میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں، میرا بولنا زیب نہیں دیتا" اس قسم کے کلمات فرماتے۔ یہ ان کی تواضع اور انکسار کی انتہا تھی، ورنہ ہم نے دیکھا اور سنا ہے کہ حضرت مفتی صاحب، حضرت تھانوی کے علوم و معارف کے حافظ تھے، ایسے ہی مثنوی مولانا روم کے بے شمار اشعار نوکِ زبان تھے۔ تقریر میں، درس میں، مجالس میں، بات بات پر مولانا روم کے اشعار پڑھتے، اور حضرت تھانوی کا حوالہ دیتے کہ انھوں نے اس بات کے جواب میں یہ فرمایا تھا۔ مگر بایں ہمہ والد صاحب کے ساتھ، حضرت مفتی صاحب کا معاملہ ایسا تھا جیسے ایک مبتدی کا منتہی کے ساتھ ہوتا ہے۔

مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کی نظر میں:

۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں قرآن کانفرنس ہوئی، صدارت غالباً علامہ علاء الدین صدیقی کی تھی، مولانا احمد علی لاہوریؒ اور والد محترم مقرر تھے۔ جب حضرت لاہوری جلسہ سے فارغ ہو کر واپس گھر تشریف لے جانے لگے تو آپ کے ساتھ دو صاحب تھے۔ ڈاکٹر مناظر حسین نظر، اور ایک کوئی اور صاحب، یہ دونوں حضرات تانگہ کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے، اور حضرت لاہوری اگلی نشست پر۔

تیسرے صاحب نے پہلے حضرت مدنی کا ذکر شروع کیا، حضرت لاہوری اُن کے بارے میں کلماتِ خیر کہتے رہے۔ پھر ان صاحب نے پوچھنا چاہا کہ "حضرت! مولوی ادریس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔" ڈاکٹر مناظر حسین بیان کرتے ہیں کہ ان صاحب کی زبان سے پورا فقرہ نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ حضرت لاہوری کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا، نشست پر آڑے ہو گئے، اور فرمایا کہ "تمھیں بزرگوں کا نام لینے کی بھی تمیز نہیں۔"

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ - م: ۱۹۶۲ م -

حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ - م: ۱۹۵۷ م

ڈاکٹر مناظر حسین نظر - سابق مدیر ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ایڈمنسٹریٹر مساجد اوقاف، حضرت لاہوریؒ کے خدام خاص میں سے ہیں۔

(حالانکہ حضرت لاہوری، والد صاحب قبلہ سے عمر میں کافی بڑے تھے)

حضرت لاہوری کو اس شخص کے اس اندازِ تخاطب سے اتنی اذیت پہنچی کہ تمام راستے اس سے گفتگو نہیں کی، حالاں کہ اس نے ابھی کوئی بات نہیں کی تھی، مگر نام لینے میں عدمِ احترام کا پہلو تھا، اس لیے ناگواری کا باعث ہوا۔

ہم عصر علماء کی نظر میں

مفتی محمد شفیع صاحب کی نظر میں:

حضرت مفتی صاحب دارالعلوم دیو بند کے ممتاز اساتذہ میں تھے، صدر دارالافتاء کے عہدے پر فائز رہے۔ علم و فضل اور وسعتِ مطالعہ میں آپ کی حیثیت مسلّمہ ہے۔ موجودہ دور میں شاید ہی کسی عالمِ دین نے اتنے مختلف موضوعات پر قرآن و سنّت کی روشنی میں تصنیف و تالیف کا کام کیا ہو، جتنا حضرت مفتی صاحب نے کیا ہے۔

عمر میں مفتی صاحب، والد صاحب قبلہ سے کم و بیش تین برس بڑے ہیں، مگر ہم نے ہمیشہ انھیں والد صاحب کی بے پناہ عزّت و تکریم کرتے دیکھا۔ لاہور تشریف لاتے تو کئی کئی گھنٹے والد صاحب کے پاس آکر گزارتے، یہی حال والد محترم کا بھی تھا، اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ مفتی صاحب کراچی سے تشریف لائے ہوئے ہیں، فوراً بھائی زکی صاحب[۱] کے گھر پہنچ جاتے۔ دراصل ان حضرات کا باہمی تعلق کسی ذاتی غرض اور مصلحت پر مبنی نہیں ہوتا، ان حضرات کی دوستی "الحب فی اللہ" کی تصویر ہوتی ہے۔ اللہ کے لئے ایک دوسرے سے ملتے، اللہ کے لئے ایک دوسرے کی عزّت کرتے ہیں۔

علمی مسائل پر گفتگو ہوتی، تبادلۂ خیالات کرتے، کسی اہم اور مشکل مسئلہ کے متعلق جس کے

---

۱ ۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، صدر دارالعلوم کراچی (خدا تا دیر ان کا سایہ قائم رکھے، اور ان کے علم و فضل سے امّتِ مسلمہ کو فیض یاب کرے)۔

جناب محمد زکی کیفی صاحب مفتی صاحب کے سب سے بڑے فرزند، مالک ادارہ اسلامیات لاہور۔

۲ ۔ یہ حصہ مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۵ء کی شب کو لکھ سویا، ۲ گھنٹے گزرے تھے کہ یہ جاں کاہ خبر ملی کہ بھائی زکی بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

ذہن میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ دوسرے سے اس کا ذکر کرتا، اس کی رائے لینا، اور پھر اس کی تصویب کرتے۔

۱۹۵۳ء میں جب پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف تحریک چلی، اور بعد میں عدالتی تحقیق ہوئی۔ تو دیگر علمار کے ساتھ مفتی صاحب اور والد صاحب کو بھی عدالت میں بیان دینے کے لئے بلایا گیا، مفتی صاحب کراچی سے لاہور تشریف لائے عدالت میں بیان دینے سے پہلے والد صاحب کے پاس تشریف لائے اور دیر تک عدالت میں متوقع سوالات کے متعلق مشورہ کرتے رہے۔

والد صاحب نے پوچھا: "آپ نے مؤمن اور کافر کی کیا تعریف کی ہے"؟

مفتی صاحب نے فرمایا: الکافر من لایؤمن بما جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

کافر وہ ہے جو اس کا انکار کرے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔

اور مؤمن کی تعریف یہ ہے: "المؤمن یؤمن بما جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

مؤمن وہ ہے جو ایمان لائے (سچا جانے اور مانے) اس پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔

والد صاحب قبلہ نے فرمایا: "کافر کی یہ تعریف زیادہ جامع ہے۔ من لم یصدق بما جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جو شخص اس کی تصدیق نہ کرے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں" وہ کافر ہے۔ آپ نے کافر کی جو تعریف کی ہے وہ امام غزالی رحمہ اللہ سے منقول ہے اور مسلمانوں کے سمجھانے کے لئے وہی الفاظ مناسب ہیں، لیکن عدالت میں قانونی الفاظ زیادہ مناسب ہیں، دوسری تعریف امام فخرالدین رازی نے بیان کی ہے۔ اس تعریف سے وہ شخص جو اللہ کی، اس کے رسول کی، اور قیامت کی نہ تصدیق کرتا ہے نہ تکذیب کرتا ہے، وہ بھی کافر ہے اور یہی حقیقت ہے، اور امام غزالی نے جو تعریف بیان کی ہے اس میں ایسے شخص کا حکم موجود نہیں، امام رازی کی بیان کردہ تعریف، قانونی نقطہ نظر سے زیادہ جامع اور مضبوط ہے۔"

حضرت مفتی صاحب نے اس باریک فرق کو بہت پسند فرمایا، اور ہنس کر کہنے لگے:
"یہی وہ علوم ہیں جن کی وجہ سے ہم آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں"
معاصرین میں ایسی محبت، اور خلوص بہت کم دیکھنے میں آیا ہے، جیسا ہم نے مفتی صاحب
والد صاحب، اور قاری طیب صاحب کے درمیان دیکھا۔
والد صاحب قبلہ کی وفات پر مفتی صاحب نے جن تاثرات کا اظہار فرمایا ہے،
ان کے ایک ایک لفظ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا دل کی گہرائی سے نکلا ہے۔ ابتدا ان
الفاظ سے کی:

"رفیق شفیق اخی فی اللہ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث
جامعہ اشرفیہ لاہور، رحمۃ اللہ علیہ اس وقت اُن چند بزرگ ہستیوں میں سے
تھے جو برِ صغیر پاک و ہند میں اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں، جو مدتوں اکابر علماء و
مشائخ کی نظروں میں پلے، ان کی صحبتوں سے مستفید ہو کر آفتاب و ماہتاب
بن کر چمکے، جنھوں نے کتابوں سے زیادہ، استادوں کو پڑھا، آج دُنیا میں ان کی
مثالیں کہاں اور کس طرح پیدا ہوں۔ مولانا محمد ادریس صاحبؒ احقر کی رفاقت
نصف صدی سے زائد کی رفاقت ہے، جو ۸، رجب ۱۳۹۴ھ (۲۸ جولائی
۱۹۷۴ء) بروز یکشنبہ آپ کی وفات حسرت آیات پر ختم ہوئی!"

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے علمی کمالات میں اپنے سبھی معاصرین میں خاص امتیاز
اور تفوق عطا فرمایا تھا، مگر ساتھ ہی بزرگوں کی صحبت نے تواضع، اور فروتنی
کی وہ صفت عطا کر دی تھی جو قدیم علمائے دیوبند کا خاص امتیاز تھا کہ نہ کہیں علم
کے دعوے، نہ دوسروں پر اپنی فوقیت کا کوئی شائبہ، مشہور مقولہ ہے، کہ
معاصرت، مفاخرت کی بنیاد ہوتی ہے، مگر اللہ والوں کی شان ان سب
چیزوں سے بلند ہوتی ہے، حق تعالیٰ نے مولانا موصوف کو ایسا ہی بنایا تھا جس

کے آثار اُن کے تمام اعمال و افعال میں ظاہر ہوتے تھے۔" (۱)

حضرت مفتی صاحب بعض مرتبہ فرماتے: مولانا ادریس، اِس دَور کے ابوذر غفاری ہیں۔

قاری محمد طیّب صاحب کی نظر میں:

حضرت قاری محمد طیب صاحب کا علم و فضل، اور ان کی شہرت، کسی تبصرے سے بالا ہے، حضرت قاری صاحب، والد صاحب قبلہ کے دورۂ حدیث کے ساتھیوں میں ہیں عمر میں کچھ بڑے ہیں، مگر دیو بند میں ہم نے دیکھا کہ قاری صاحب کا تعلق والد صاحب کے ساتھ ایک مہتمم اور مدرس کا نہ تھا، بلکہ دو سگے بھائیوں کا تھا، والد صاحب ۱۹۴۹ء کے وسط تک دار العلوم سے وابستہ رہے۔ قیام دیو بند کے آخری دو، ڈھائی سال کے حالات ناچیز راقم کو خوب اچھی طرح یاد ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حضرت قاری صاحب کا پیغام آتا کہ "آج رات میں آپ کے گھر آؤں گا"۔ رات کو تشریف لے آتے اور کئی کئی گھنٹے والد صاحب کے ساتھ علمی مذاکرات میں مشغول رہتے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی ایسا ہوا کہ قاری صاحب نے والد صاحب کو اپنے ہاں بلوایا ہو،

ہم نے ان کا اخلاق اتنا بلند پایا کہ کسی کے حق میں بھی وہ کبھی "شانِ اہتمام" کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے، پھر والد صاحب کے ساتھ کیسے کرتے، جن سے بڑے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتے، خود گھر پر بے تکلف چلے آتے، اور ہمیشہ "بھائی ادریس" کہتے (۲)، کبھی کسی اور لفظ سے مخاطب نہیں فرماتے تھے۔

والد صاحب کو بھی ہم نے دیکھا کہ قاری صاحب کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے، غائبانہ

---

(۱) بحوالہ مقالہ حضرت مفتی صاحب مطبوعہ ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ص: ۲۱، ۲۲۔ شمارہ شعبان ۱۳۹۴ھ/اکتوبر ۱۹۷۴ء

(۲) حضرت مولانا قاری محمد طیب۔ مہتمم دار العلوم دیو بند۔ نبیرہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ حضرت قاری صاحب کا جو تعزیتی خط آیا، اس میں بھی انھوں نے "بھائی ادریس" ہی لکھا ہے۔

جب بھی ذکر ہوتا، ان کے بارے میں کلماتِ توصیف کہتے، اور خاص طور پر یہ بات ضرور کہتے کہ:
قاری طیب صاحب نہایت ذہین اور نکتہ سنج ہیں، اسرار و حکم میں اپنے دادا حضرت نانوتوی کے بہت اچھے ترجمان ہیں۔"

قاری محمد طیب صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی جو مختصر تاریخ مرتب کی ہے، اس میں ان تمام حضرات کا اجمالی ذکر اور تعارف ہے، جو دارالعلوم سے بطور استاد وابستہ رہے، والد محترم کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"آپ دارالعلوم کے ممتاز فضلاء و علماء میں سے ہیں، حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری کے مخصوص، اور معتمد علیہ تلامذہ میں سے ہیں، احقر کے خاص تعلیمی رفیق، اور دورۂ حدیث کے ساتھی ہیں، اوپر سے ہم نسب بھی ہیں۔ حدیث، فقہ، اور تفسیر میں امتیازی مہارت کے حامل ہیں، قوتِ حافظہ امتیازی ہے، علوم اور کتب کا استحضار بے تام ہے، اونچے درجے کے اربابِ تدریس میں سے ہیں، علوم سے فراغت کے بعد بعض مدارس میں سلسلۂ تدریس سے منسلک رہ کر بالآخر دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے بلائے گئے، اور کتب تفسیر کے ساتھ دورہ کی کتب حدیث، بالخصوص ابوداؤد شریف اکثر و بیشتر آپ ہی کے درس میں رہتی تھی۔

اتباعِ سنت، اور عظمتِ سلف کا خاص شغف ہے، علوم شرعیہ اور مذاہب باطلہ میں بہت سی کتب کے بہترین مصنف ہیں، محققانہ انداز سے بحث کرتے ہیں، جس میں علمی مواد کافی ہوتا ہے۔

علمی تصنیف کے سلسلے میں مشکوٰۃ المصابیح کی شرح تعلیق الصبیح، آپ کا تصنیفی شاہکار ہے، جو پانچ[1] جلدوں میں ہے۔

ممالک اسلامیہ کے سفر کئے ہوئے ہیں۔ اور بیروت جا کر[2] آپ نے خود ہی شرحِ مشکوٰۃ

---

[1] اب آٹھ جلدوں میں مکمل ہو گئی ہے۔
[2] دمشق میں طبع کرائی۔

طبع کرائی۔

سیرتِ مصطفیٰ کے نام سے کئی (۴) جلدوں میں محققانہ سیرت لکھی جس میں آزاد خیال مصنفوں پر علمی انداز سے تنقید کی ہے۔ اور ان کے بہت سے شکوک و شبہات کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔

عربی ادب میں خاص مہارت ہے، عربی اشعار برجستگی سے کہتے ہیں، فارسی میں بھی آپ کی نظمیں ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار کر لی، آپ جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث ہیں، تقریباً ہر جمعہ کو آپ کے وعظ کی مجلس ہوتی ہے جس میں ہزاروں کا اجتماع ہوتا ہے۔

حق گوئی میں حکیمانہ انداز کے ساتھ ید طولیٰ رکھتے ہیں، اور سچی بات بلا خوف لامۃ لائم برملا کہتے ہیں۔ تقویٰ اور خشیۃ اللہ آپ پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ممتاز مشاہیر علم و فضل میں سے ہیں۔" (۱)

مولانا خیر محمد جالندھری مرحوم (۲)، کو بارہا یہ کہتے سنا:

"مولانا کی ایک تقریر سے ہم تو اپنی تین مہینے کی تقریریں تیار کر لیتے ہیں۔"

---

(۱)۔ "تاریخ دار العلوم دیوبند۔ طبع دیوبند ۱۹۶۵ء۔ ص : ۷۷، ۸۰"

(۲)۔ مولانا خیر محمد جالندھری، حضرت تھانوی کے خلفاء میں تھے۔ بانی: مدرسہ عربیہ خیر المدارس ملتان ۴ ، اکتوبر ۱۹۷۰ء

علمائے عرب کی نظر میں

علمائے عرب کی نظر میں

"برِّصغیر پاک و ہند کا کوئی گوشہ یقیناً ایسا نہ ہوگا جہاں والد مرحوم کی کتابیں یا شاگرد نہ پہنچے ہوں بلکہ جہاں تک شاگردوں کا تعلق ہے، ان کا حلقہ تو پاک و ہند سے گزر کر برما، سیلون افغانستان، ایران، ملایا، جنوبی افریقہ، چین اور روسی بخارا و ترکستان تک پھیلا ہوا ہے۔

آپ کی تصنیفات اگرچہ زیادہ تر اُردو میں ہیں، لیکن کئی ضخیم اور بلند پایہ کتابیں عربی میں بھی تالیف کیں، سب سے پہلی عربی اُدب کی معروف کتاب "مقاماتِ حریری" کی عربی شرح لکھی، وہ اہلِ عرب میں تعارف کا ذریعہ بنی، اس سے بڑھ کر مشکاۃ شریف کی شرح "التعلیق الصبیح" عربی میں تالیف کی اور ۱۹۳۵ء میں اس کی ابتدائی چار ضخیم جلدیں دمشق جا کر طبع کرائیں۔ التعلیق الصبیح نہ صرف یہ کہ عربی میں ہے بلکہ شروحِ حدیث میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔

التعلیق الصبیح نے جہاں ایک طرف پاک و ہند کے تمام علماء میں آپ کا علمی مرتبہ اور مقام معیّن کیا، وہاں دمشق، بیروت، قاہرہ، اور سعودی عرب کے علماء نے بھی اس شرح کو استناد کا درجہ دیا۔ اور اس پر طویل تبصرے کئے۔

چودھویں صدی ہجری میں پاک و ہند کے بہت کم علماء سے عرب کے اہلِ علم و فضل اتنا متعارف اور متاثر ہوئے ہیں جتنا والدِ محترم سے ہوئے۔ شرحِ مقاماتِ حریری اور التعلیق الصبیح پر عرب علماء نے جن آراء کا اظہار کیا، ان میں سے دو ایک کے اقتباسات زیرِ ترجمہ کی صورت میں پیش کرنا مناسب ہوں گے، اس سے قارئین کو اندازہ ہو گا کہ ان کی نظر میں موصوف کا کیا علمی مقام تھا۔

شیخ بہجۃ البیطار شام کے جلیل القدر علماء میں سے تھے، دو مرتبہ پاکستان بھی تشریف لائے۔ غالباً دو تین سال قبل انتقال ہو گیا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب لاہور میں بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ منعقد ہوئی تھی اس میں بھی آپ شامی وفد کے رکن تھے۔ لاہور کے دورانِ قیام دو مرتبہ والد صاحب سے ملنے تشریف لائے۔

التعلیق الصبیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ بات باعثِ شکر بھی ہے، اور باعثِ فخر بھی کہ ہندوستان میں ایسے افراد اور ادارے سرگرمِ عمل ہو گئے ہیں جو کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ ﷺ کی خدمت خود قرآن حکیم کی زبان کر رہے ہیں۔

ابھی حال ہی میں میرے ایک عزیز دوست شیخ محمد ادریس الکاندھلوی، جو ہندوستان کے اجل علماء میں سے ہیں، اور دمشق آئے ہوئے ہیں، انھوں نے حدیث کی مشہور کتاب مشکاۃ المصابیح کی شرح التعلیق الصبیح کی دو جلدیں مجھے عنایت کی ہیں، اپنی اس شرح کو وہ دمشق میں طبع کرا رہے ہیں۔

میں نے موصوف کی دی ہوئی دونوں مجلدات کا مطالعہ کیا ہے، مؤلف علام نے احادیث کے اسرار و حکم، لطائف و معارف، اور دقائق نہایت عمدہ اور سہل پیرائے میں بیان کئے ہیں، احادیث کے معانی و مطالب کے بیان میں اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ سلف صالحین کے مسلک سے ذرہ برابر عدول نہ ہو۔

فاضل مؤلف نے نوع بہ نوع فوائد، اور اسرار و نکات کے بیان، اور اخذ و استنباط میں مشکاۃ کی شرح۔ تورپشتی، طیبی، اور لمعات سے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ نیز حکمائے اسلام مثلاً امام غزالی، ابن رشد، امام ابن تیمیہ، اور ابن قیم جوزی، اور شارحین حدیث مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی، بدرالدین عینی، قسطلانی، اور مشاہیر صوفیہ جیسے شیخ محی الدین بن عربی، اور عبدالوہاب شعرانی سے بھی اخذ و استنباط میں مقدور بھر کوشش کی ہے۔

محدثین، متکلمین، فقہاء، اور صوفیہ، سب سے خوشہ چینی سے موصوف کا یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ حقائق سے پردے ہٹائے جائیں، اور لوگ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے منشار اور مراد کو بخوبی سمجھ سکیں۔

زیر نظر شرح کی ایک خوبی یہ ہے کہ قاری مؤلف علام کو اختلافی مسائل میں ادب احترام، اور انصاف کے زیور سے آراستہ پائیں گے۔ مؤلف نے کسی اختلافی مسئلہ میں عدل توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جہاں بھی مختلف ائمہ اور فقہاء کی آراء پر کلام کیا ہے۔ افراط تفریط سے گریز کیا ہے، ہر امام کے رتبہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ صرف دلائل کی مدد سے کسی مسلک کو ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ کتاب طبع ہو رہی ہے، اور اتنی مہلت نہیں ہے کہ میں اپنے عزیز اور فاضل دوست کی کتاب پر پورے بسط و تفصیل کے ساتھ تبصرہ کر سکوں۔"

محمد بہجۃ بن محمد بہاء الدین البیطار

۱۵ رجب ۱۳۵۴ھ دمشق الشام

شام کے ایک معروف و بلند پایہ عالمِ دین شیخ محمد ابن رشید العطار دمشق نے التعلیق الصبیح کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"مشکاۃ المصابیح کو کتب حدیث میں علماء کے نزدیک بہت بلند مرتبہ حاصل ہے مشکاۃ صحاح ستہ اور دیگر سنن کا خلاصہ اور بہترین انتخاب ہے۔ حضرت استاذ الفاضل، انسانِ کامل، جامع العلوم شیخ محمد ادریس الہندی نے اس عظیم کتاب کی شرح لکھی ہیں نے شیخ موصوف کی شرح کو جستہ جستہ مقامات سے دیکھا، شرح میں نوع بہ نوع مضامین، اور معانی و مطالب بیان کئے ہیں، شرح کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں متقدمین کے علوم کا نچوڑ، اور متاخرین کی فکر و تحقیق کا عطر پیش کر دیا گیا ہے۔

متقدمین و متاخرین کے علوم کی یہ شرح اس قدر جامع ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد میری رائے میں مشکاۃ کی دوسری شروح سے آدمی بے نیاز ہو جاتا ہے۔

مؤلفِ علام نے اختلافی مسائل میں امام ہمام حضرت امام ابو حنیفہ قدس اللہ سرہ کے مسلک، اور فقہی رائے کو ترجیح دینے کے لئے مضبوط اور راسخ دلائل پیش کئے ہیں، اسرار و معارف کے بیان و شرح میں علمائے راسخین کے علم سے استفادہ کیا ہے، اور حضرات صوفیائے کرام کے لطائف و معارف سے مضامین کو سنوارا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہند کے اس جلیل القدر جامع العلوم، اور عالی ہمت نوجوان عالم دین نے اپنی اس عظیم اور لاثانی شرح کی طباعت کے لئے ہمارے شہر، اور ہمارے ملک کو منتخب کیا ہماری دعا ہے کہ اس شرح کی تالیف اور طباعت، دونوں مؤلف علام کے لئے آسان

ہوں، اور اہلِ اسلام کے لئے اس کا افادہ زیادہ سے زیادہ عام ہو۔

مجھے مؤلف کے ساتھ متعدد بار بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں ان کی پیشانی پر اخلاص اور قبولیت کی علامات دیکھتا ہوں، وہ یقیناً ایک بڑے عالم ہیں جو یکسوئی اور گوشہ نشینی کو محبوب رکھتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں سے ممتاز ہیں۔ یہ توفیق اور سعادت ان کو مبارک ہو۔ اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کی نیکی اور بھلائی سے بہرہ ور ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین "

محمود بن رشید العطار عفی عنہ

دمشق الشام

۱۳۵۴ھ

توضیح و تشریح

حضرت مولٰنا محمد ادریس کاندھلوی کا سلسلہ سندِ حدیث نقشہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اس کی ضروری تشریح یہ ہے۔

(۱)۔ مولانا کاندھلوی مرحوم نے اپنے والد ماجد مولٰنا حافظ محمد اسماعیل سے انھوں نے علامہ شیخ محمد عابد سندی انصاری مدنی سے، شیخ صالح العمری الفلانی المدنی سے، شیخ محمد العمری الفلانی سے، ابوالوفا احمد بن العجلی یمنی سے، مفتی مکہ قطب الدین سے، ابوالفتوح احمد بن عبداللہ طاؤسی سے، یوسف ہروی سے، محمد بن شار بخت فارسی سے، ابوعثمان یحیٰی سمرقندی سے، ابو عبداللہ محمد بن یوسف فربری سے، امام حدیث محمد اسمٰعیل بخاری سے، مولٰنا کاندھلوی کی یہ سند تمام دنیائے اسلام کی اسناد میں سب سے مختصر اور اعلیٰ سند ہے، امام بخاری اور مولٰنا کاندھلوی کے درمیان صرف گیارہ واسطے ہیں۔

مولٰنا محمد اسماعیل نے دیگر اساتذہ سے بھی حدیث کی سند و اجازت حاصل کی ہے۔ آپ کے ایک استاذ (۲) حضرت مولٰنا محمد ایوب پھلتی قاضی القضاۃ بھوپال ہیں (۳) مولٰنا محمد اسمٰعیل صاحب اور مولٰنا محمد ایوب صاحب نے مولٰنا عبدالقیوم بوڈھانوی پھلتی مفتی ریاست بھوپال سے سند حدیث حاصل کی ہے (۴) مولٰنا محمد اسماعیل نے نیز سید علی بن ظاہر الوتری المدنی سے اجازت حاصل کی ہے۔

(۲)۔ مولٰنا کاندھلوی نے حضرت مولٰنا خلیل احمد مہاجر مدنی سے مظاہر العلوم سہارنپور میں صحیحین سنن اربعہ موطئین اور ابن ماجہ شریف کی اجازت حاصل کی، انھوں نے مولٰنا محمد مظہر نانوتوی سے، انھوں نے شاہ محمد اسحاق سے، اور مولٰنا خلیل احمد صاحب نے شاہ عبدالغنی تلمیذ حضرت شاہ محمد اسحاق سے بھی اجازت حاصل کی اور انھوں نے حضرت شیخ احمد دحلان مفتی شافعیہ مکہ مکرمہ اور حضرت شیخ احمد برزنجی مفتی شافعی مدینہ منورہ سے، ان کے استاذ

سے اجازت حاصل کی اور مولٰینا خلیل احمد نے مولٰینا عبد القیّوم بوڑھانوی پھلتی داماد و تلمیذ حضرت شاہ محمد اسحٰق سے بھی اجازت حاصل کی اور حضرت مولٰینا رشید احمد گنگوہی سے بھی اجازت حاصل کی۔

(۳)۔ مولٰینا محمد ادریس کاندھلوی مولٰینا سید محمد انور شاہ کشمیری سے انھوں نے شیخ الہند مولٰینا محمود الحسن صاحب سے انھوں نے مولٰینا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند سے اور مولٰینا رشید احمد گنگوہی سے اور دونوں بزرگوں نے شاہ عبد الغنی مہاجر مدنی سے۔

(۴)۔ مولٰینا محمود الحسن شیخ الہند، مولانا محمد قاسم صاحب، مولٰینا رشید احمد گنگوہی کے علاوہ شیخ عبد الغنی دہلوی مہاجر مدنی سے اور مولٰینا احمد علی سہارنپوری محشی بخاری اور شیخ محمد مظہر نانوتوی اور شیخ محمد قاری عبد الرحمٰن پانی پتی سے بھی اجازت ہے اور یہ سب اکابر شاہ اسحاق سے سند حاصل کرتے ہیں۔

(۵)۔ حضرت کاندھلوی نے موطئین کی قرات و اجازت حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب دیوبندی عثمانی سے اور انھوں نے مولٰینا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس دار العلوم دیوبند سے، انھوں نے شاہ عبد الغنی دہلوی سے حاصل کی۔

(۶)۔ سنن ابوداؤد کی قرات و اجازت حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے، انھوں نے حضرت مولانا محمود الحسن صاحب سے۔

(۷)۔ اور سنن نسائی کی اجازت و روایت حضرت مولٰینا شبیر احمد عثمانی سے اور انھوں نے حضرت حضرت شیخ الہند مولٰینا محمود الحسن صاحب سے روایت کی ہے۔

اکثر سلسلہ اسناد حضرت شاہ عبد الغنی کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک تک پہنچتا ہے اور ان کی اسناد الیانع الجنی فی اسناد عبد الغنی میں موجود ہیں، اس لئے ان کے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ حضرت نے اپنے تلامذہ کو روایت حدیث کی اجازت بصورت نظم عربی ارقام فرمائی تھی۔ وھو ھذا

صورة الاجازة المنظومة

بسم الله الرحمن الرحيم

ألا بعد حمد الباري المتكرم — وتقديم تسليم لخير مسلم

أجزت لكم عني رواية كل ما — رواه الصحيح للبخاري مسلم

وما في موطا مالك ومحمد — وما في كتاب الترمذي المفخم

وما في صحيح للنسائي مجتبى — وما لأبي داود يعزى وينتمي

وما قد أخذت عن كرام مشايخي — سماعا وإذنا لي وعرضا عليهم

أجزتكمو كيما أنال دعاءكم — وإن كان لا أسوى المجيز بدرهم

ومن فضلكم أرجو مراعاة شرطها — من الضبط والتقوى وحسن التفهم

وأسأله سبحانه أن يحفنا — وإياكمو بالفضل فضل متمم

ويسري حديث المصطفى في قلوبنا — وفي السمع والعينين واللحم والدم

ويحشرنا يوما النشور بفضله — بزمرة أصحاب النبي المكرم

عليه صلوة الله ثم سلامه — ورحمته تترى بدون تصرم

مع الآل والصحب الكرام جميعهم
كواكب رشد للهداية أنجم

۵ جمادی الثانی یوم الخمیس سنہ ۱۳۷۰ھ

اساتذہ

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ والد صاحب نے اپنی تعلیم کی ابتداء مدرسہ امدادیہ خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون سے کی۔ ابتدائی کُتب وہاں پڑھیں، اس کے بعد مدرسہ عربیہ مظاہر علوم سہارن پور میں دینی تعلیم مکمل کی۔ دورۂ حدیث بھی یہیں پڑھا۔ لیکن دارالعلوم دیوبند میں علامہ انور شاہ کاشمیری اور مولانا شبیّر احمد عثمانی کی وجہ سے دورۂ حدیث میں داخلہ لیا، اور ایک برس طالب علم کی حیثیت سے وہاں گزارا۔ اور دارالعلوم میں بھی مکمل دورۂ حدیث پڑھا۔ ذیل میں ان تینوں تعلیمی گہواروں اور مدرسوں کے ان ممتاز اساتذہ کی فہرست دی جاتی ہے جن کے آگے والد صاحب نے زانوئے تلمذ تہ کیا:

مدرسہ امدادیہ تھانہ بھون میں:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی۔

مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی مؤلف تیسیر المنطق۔

مظاھر علوم سہارن پور میں:

حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری

مولانا عبداللطیف صاحب

مولانا ظفر احمد عثمانی

دارالعلوم دیوبند میں:

علامہ محمد انور شاہ کاشمیری۔

علامہ شبیّر احمد عثمانی

مولانا محمد احمد ــ (ابن مولانا محمد قاسم نانوتوی)

مفتی عزیزالرحمٰن

حضرت میاں اصغر حسین
مفتی عزیز الرحمٰن

مذکورہ بالا اساتذہ، وہ نامور ہستیاں ہیں جنھوں نے برِّ صغیر کی علمی، دینی اور سیاسی تحریکوں میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ عثمانی، اور مولانا ظفر احمد کے علمی و مذہبی مقام کے علاوہ تحریک پاکستان میں ان حضرات کا جو حصہ ہے وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

ہم عصر علماء

مفتی محمد شفیع رح (صدر دار العلوم کراچی)
قاری محمد طیّب مدظلہ (مہتمم دار العلوم دیوبند)
علامہ سید سلیمان ندوی رح
مولانا مناظر احسن گیلانی رح
مولانا بدر عالم میرٹھی رح
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
مولانا ابوالخیر مودودی
مولانا محمد زکریا کاندھلوی
مولانا داؤد غزنوی رح
مولانا ابوالحسنات سید احمد قادری رح
قاضی ظہور الحسن سیوہاروی
مولانا عبدالباری ندوی
مولانا اقار اللہ پانی پتی
مولانا اطہر علی (مشرقی پاکستانی)

مولانا عبدالحق (اکوڑہ خٹک)
مولانا غلام غوث ہزاروی
میر واعظ محمد یوسف (کشمیری)
مولانا شمس الحق افغانی

نامور تلامذہ

مولانا محمد یوسف بنوری . صدر مدرسہ عربیہ کراچی۔
مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی
مولانا سعید احمد اکبر آبادی دہلی ڈین علی گڑھ یونیورسٹی۔
مولانا سید محمد میاں دیوبندی
مولانا معراج الحق ۔ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
مولانا عبیداللہ انور ۔ امیر انجمن خدام الدین لاہور
مولینا برہان الدین صدیقی سنبھلی
مولانا طفیل احمد جالندھری
ڈاکٹر رشید احمد جالندھری . ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی
مفتی نذیر احمد کشمیری
مولانا محمد نعیم دیوبندی . استاد دارالعلوم دیوبند
مولوی حکیم انیس احمد صدیقی
قاضی زین العابدین میرٹھی
مولانا سید سرور حسین
مولانا محمد سالم قاسمی استاد دارالعلوم دیوبند
مولانا سید اسعد مدنی " " "
مولانا عبدالرحمن ۔ نائب ناظم جامعہ اشرفیہ

مولانا حکیم حافظ محمد الیاس نانوتوی (کوئٹہ)
مولانا غلام ربانی کشمیری
مولانا حسن جان آصف
مولانا نصیر احمد - استاد دار العلوم دیوبند۔
مولانا شمس الحق جلال آبادی
مولانا انوار الحسن شیر کوٹی
مولانا عبد الدیان کلیم۔ اسسٹنٹ ڈین پشاور یونیورسٹی
مولانا سید جمیل الدین احمد
حافظ محمد یونس (ایم، اے) ریسیرچ فیلو ادارہ تحقیقات اسلامی
مولانا غلام مصطفیٰ ۔ مدرسہ عثمانیہ لاہور
مولانا منظور احمد " "
مولانا مشرف علی تھانوی - استاد جامعہ اشرفیہ لاہور
مولینا سید عبد الخالق گجراتی
مولینا محمد عارف ایم۔اے (ڈبل)
مولینا عبد العلیم قاسمی
مولینا عبد الحلیم صاحب قاسمی
قاری حافظ رحیم بخش پانی پتی
مولینا عبد اللہ صاحب نقشبندیؒ
مولانا محمد مالک کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور
(مولینا حافظ اختر الحق صدیقی دہلی)
قاضی زین العابدین میرٹھی - میرٹھ - بھارت

قاضی سجاد حسین - صدر مدرسہ عربیہ فتح پوری دہلی
مولینا سلیم اللہ خاں جلال آبادی۔ کراچی۔
قاری حسن شاہ، لاہور۔
قاری جلیل الرحمن مہتمم مدرسہ مدینۃ العلوم سرگودھا۔
مولانا حافظ محبوب احمد - علی گڈھ - بھارت
قاری محمد ظریف صاحب سمن آباد لاہور
مولانا عبدالدیان کلیم - پشاور یونیورسٹی
مولینا سید تقویم الحق صاحب - پرنسپل گورنمنٹ کالج کوہاٹ
مولانا شمس الحق جلال آبادی - دارالعلوم کراچی
محمد ارشد صدیق۔ ادارہ تحقیقات اسلامی۔

نشانِ مردِ مومن باتو گویم
چوں مرگ آید تبسّم برلبِ اوست

علالت ۔ وفات

حضرت والد صاحبؒ کی مجموعی زندگی دیکھنے کے بعد ہر شخص بخوبی یہ بات سمجھتا تھا کہ ان کا مقصدِ حیات صرف علم اور علم کی خدمت ہے، درس وتدریس، مطالعہ اور تصنیف وتالیف کے انہماک اور شغف نے ہمیشہ اپنی صحت کے خیال وتوجہ سے دُور رکھا ۔ ہم دیکھتے تھے کہ حیات مبارکہ کے آخری چند سالوں میں جب نقاہت اور کمزوری زائد تھی صبح درس بخاری کی وجہ سے نہایت ہی تعب محسوس کرتے تھے اور انتہائی تعب واضمحلال کی حالت میں کچھ دیر لیٹ جاتے، لیکن تقریباً آدھ گھنٹہ بیس منٹ ہی گزرتے پھر اُٹھ بیٹھتے اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوجاتے ۔ پھر جب دوپہر کا کھانا تناول فرمایا تو دس بیس منٹ استراحت کے بعد اسی طرح مشغول ہوجاتے ۔ حتیٰ کہ ظہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا ۔ اس درجہ محنت، جفاکشی جس کو دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ یہ علمی اشتغال نہیں بلکہ فنا فی العلم کا مقام ہے ۔ تو آخری چند سال ایسی ناقابلِ تحمل محنت کے باعث نہایت ہی کمزوری کے گزرے ۔
لیکن آپ کی زندگی کا آخری سال ۱۹۷۳ء وہ تقریباً تمام کا تمام علالت وبیماری میں گزرا اور ۲ اگست ۱۹۷۳ء کی شب میں بیماری نے اس طرح شدت اختیار کرلی کہ رات کو اچانک ہچکیاں آنی شروع ہوئیں، ڈاکٹر میاں بشیر احمد ریاض کو بلایا گیا، انھوں نے تشخیص کیا کہ جسم، اور خاص

طور پر آنتوں میں پانی کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ تین چار روز کے علاج کے بعد طبیعت ٹھیک ہو گئی لیکن نقاہت بہت بڑھ گئی اور کھانا کھانا دشوار ہو گیا۔ چند روز کے عارضی افاقے کے بعد پھر طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر منیر الحق کی تجویز ہوئی کہ ایکسرے کرایا جائے۔ ایکسرے کرایا گیا۔ اس میں معدے کے نیچے بالکل پتھری کا سا نشان نمایاں ہوا۔ ڈاکٹروں کی رائے ہوئی کہ یہ پتھری ہے مگر اطبار اس کے خلاف تھے۔ کافی روز تک صحیح اور حتمی طور پر پتہ نہ لگا کہ مرض کیا ہے۔ مگر بنیادی طور پر اس بات پر اطبار اور ڈاکٹر متفق تھے کہ معدے میں خرابی ہے، اور جگر نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

کئی ماہ تک ڈاکٹر انور چودھری، اور ڈاکٹر احسان الحق صاحب قریشی کا علاج ہوتا رہا۔ دونوں حضرات نے پوری توجہ اور لگن سے علاج کیا۔ کبھی طبیعت سنبھل جاتی، اور کبھی تکلیف بڑھ جاتی، اسی اثنار میں ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے حکیم محمد شریف جگرانوی کو دکھایا۔ انھوں نے محبت اور خلوص سے علاج کی پیشکش کی، حکیم جگرانوی نوجوان ہونے کے باوجود لاہور کے معروف اور حاذق اطبار میں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی مقبولیت عطا کی ہے۔ حکیم محمد شریف نے علاج شروع کیا، اور ہر دوسرے تیسرے روز خود تشریف لائے، نبض دیکھتے اور تمام حال سنتے، مگر طبیعت کی بالکل غیر یقینی کیفیت رہی۔ کمزوری حد سے بڑھ گئی اور کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا۔ چائے بھی اکثر واپس کر دیتے۔ ڈاکٹر انور چودھری اور ڈاکٹر احسان الحق صاحب نے خون دینے کا مشورہ دیا مگر اس کے لئے والد صاحب نے انکار کر دیا، اور فرمایا میں اس کو جائز نہیں سمجھتا۔ لیکن ڈاکٹر اس پہ مصر رہے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ والد صاحب کو یہ قطعاً نہ بتایا جائے کہ خون چڑھایا جا رہا ہے صرف یہ کہا جائے کہ طاقت کی دوا دے رہے ہیں۔

صوفی عبدالرشید صاحب (مالک مکہ پریس لاہور) نے دو مرتبہ خون دیا، اور ایک ایک ماہ کے وقفے سے دو مرتبہ خون دیا گیا۔ لیکن اس کے اثرات بھی چند روز رہے، اور ظاہر ہے، کیسے رہتے، جب اندرونی نظام خراب ہو چکا تھا۔ معدہ اور جگر دونوں کا عمل ختم ہو چکا تھا تو بیرونی دوائیں اور علاج کب تک سہارا دیتے۔ ڈاکٹروں نے میو ہسپتال میں داخل ہونے کے لئے بہت

اصرار کیا۔ مگر فرمایا: وہاں تو نامحرم عورتیں (نرسیں) ہوتی ہیں، میو ہسپتال کے ڈاکٹر رشید احمد کئی بار خود تشریف لائے، انھوں نے کہا کہ مولانا! میں آپ کے لئے بالکل الگ کمرے کا انتظام کر دوں گا۔ اور پابندی لگا دوں گا کہ کوئی نرس ادھر سے گزرے گی بھی نہیں، مگر والد صاحب آمادہ نہ ہوئے اور یہی فرماتے رہے کہ مرنا تو حق ہے مگر ہسپتال میں پڑ کر کیوں مرا جائے، آدمی گھر ہی میں مر جائے۔ اسی دوران سیالکوٹ جناب حکیم محمد عمر صاحب کاندھلوی (برادر بزرگ مولانا محمد علی الصدیقی) کو بھی بلایا گیا وہ بھی اپنے دور کے انتہائی حاذق طبیب اور نباض ہیں۔ انھوں نے بھی تجویز کیا کہ جگر اور معدہ کا عمل ختم ہو چکا۔

طبِ یونانی

کے متعلق حضرت والد ماجد کے تاثرات حضرت کے شاگرد اور معالجِ خاص حکیم مولوی انیس احمد صدیقی اس طرح بیان کرتے ہیں۔ طبِ یونانی جو کہ اصل اور حقیقت میں طب عربی اور طب اسلامی ہے، حضرت کو اس طب سے خاص تعلق تھا۔ حضرت فرماتے تھے طب میں انسان کے مزاج کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور طب میں اصل مرض کا علاج کیا جاتا ہے اور اس کے عرض یعنی علامات اصل مرض کے زائل ہونے پر خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ حکمائے اسلام کی تحقیقات اور انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات عقل اور فہم میں بے مثال تھے اور حق تعالیٰ نے ان کو وہ کمال عطا فرمایا تھا جو ان ہی کا حصہ تھا۔ بعد کے لوگوں نے جو ایجادات کی ہیں ان میں عقلیات کے بجائے تجربات کا دخل زیادہ ہے۔ اس لئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حکماءِ اسلام عقل اور دانش میں اعلیٰ اور ارفع تھے اور بعد کے لوگ تجربات و مصنوعات میں سبقت لے گئے ہیں۔ لیکن حقیقی فضیلت کا سہرا متقدمین کے سر ہے۔

حضرت کی خواہش تھی کہ طب یونانی کو پاکستان بلکہ تمام اسلامی ملکوں میں فروغ دیا جائے طب یونانی کی اکثر دوائیں شہد و نباتات سے تیار کی جاتی ہیں اور دوسرے طریق علاج کی اکثر دوائیں

روح الخمر (ام الخبائث) کے ذریعہ تیار کی جاتی ہیں۔ طب یونانی میں جڑی بوٹیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ جن کا نفع زیادہ اور نقصان کم ہے۔ لہذا اقتصادی لحاظ سے بھی طب یونانی کے فروغ سے اپنے ملک کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

حضرت کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو طب یونانی کے قرابادین مرکبات عمدہ اجزاء اور پورے اوزان کے ساتھ تیار کرے اور ان کو مناسب قیمت پر ضرورت مند حضرات کو پیش کرے۔ یہ کام دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے بہت مفید ہے۔ حضرت طب عربی کو اسلاف کا قیمتی ورثہ سمجھتے تھے اور اس کی حفاظت اور ترقی کے دل سے خواہاں تھے۔

بہرحال ڈاکٹر انور چودھری، ڈاکٹر احسان الحق، حکیم محمد شریف جگرانوی، حکیم انیس احمد صدیقی یہ سب حضرات انتہائی محبت و عقیدت سے علاج معالجے میں مصروف رہے، اور ہر ممکن ظاہری اسباب اختیار کرتے رہے۔ مگر تقدیر کے آگے بندہ عاجز ہوتا ہے، طبیعت گرتی رہی اور نقاہت اس درجہ بڑھی کہ نماز کے لئے مسجد تک جانا بھی دشوار ہو گیا؛ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں جاتے مگر بہت مشکل سے، گھر سے مسجد کا فاصلہ پچاس ساٹھ قدم ہوگا مگر راستے میں دو تین جگہ بیٹھتے اور پھر مسجد تک پہنچتے۔

۲ اگست ۱۹۷۳ء سے جولائی ۱۹۷۴ء تک کا عرصہ اسی طرح کمزوری اور روز بروز بڑھتی ہوئی علالت کا گزرا۔ باوجود اس کمزوری اور شدید بیماری کے درس بخاری کا سلسلہ منقطع نہیں فرمایا۔ معالجین بھی کافی اصرار کرتے رہے کہ سلسلۂ درس قطعاً بند کر دیں اور جامعہ کے مہتمم مولانا عبیداللہ صاحب بھی بار بار کہتے تھے کہ حضرت اپنی صحت کا خیال فرمائیں۔ دیکھنے والے بھی اس عزم اور ہمت پر حیرت کرتے تھے کہ ایک ایسا کمزور نحیف اور بیمار انسان جس کو چند قدم چلنے کی بھی سکت نہیں درس کی محنت بڑے انبساط اور جذبہ سے برداشت کر رہا ہے۔ مکان سے دارالحدیث کا فاصلہ صرف چند قدم کا ہے، اس فاصلہ کو دو جگہ درمیان میں سانس لے کر قطع فرماتے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ علم کے اس پروانے کو شوق علم اور عشق حدیث رسول نے ان سب باتوں سے بے نیاز بنا دیا تھا۔ آخر

جون میں کمزوری اور شدت اختیار کر گئی، اس عرصہ میں محترم بھائی مولانا محمد مالک پریشان ہو کر ٹنڈو اللہ یار سے آئے اور پھر چلے گئے اور طبیعت بدستور گرتی گئی۔

۱۶ جولائی ۱۹۷۴ء کو شدید دورہ پڑا، ٹنڈو اللہ یار بھائی صاحب مولانا محمد مالک صاحب کو تار دیا گیا، وہ اگلے ہی روز لاہور آگئے، تین چار روز تک تو نا اُمیدی کی سی حالت رہی، اس کے بعد طبیعت کو معمولی سا افاقہ ہوا، مگر جمعرات ۲۵ جولائی کو طبیعت پھر بگڑ گئی۔ ڈاکٹر احسان الحق صاحب آئے انھوں نے گلوکوز دینا شروع کیا، مگر جسم نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

میرے چھوٹے بہنوئی مولوی مشرف علی، والد صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ والد صاحب پر غنودگی کی کیفیت طاری تھی، اسی حالت میں مولوی مشرف میاں سے کہنے لگے: دیکھو دروازے پہ حضرت مجدد الف ثانی، مولانا اشرف علی تھانوی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کھڑے ہیں ان کو بٹھاؤ، مولوی مشرف گھبرا گئے۔ والد صاحب نے آنکھیں کھول کر ان کو پریشان دیکھا تو فرمانے لگے کہ: میں کہہ رہا تھا کہ ان کی کتابیں فلاں فلاں الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں جب وہ دیکھنا چاہ رہا تھا۔ پھر خاموش ہو گئے۔ مولوی مشرف میاں نے گھر والوں سے یہ واقعہ بیان کیا، ہم سب اسی وقت کھٹک گئے کہ شاید اب زیادہ دیر یہ برکت و سعادت ہم لوگوں میں نہ رہے گی۔

اسی اثنا میں بھائی مالک صاحب نے خواب دیکھا کہ والد صاحب نماز پڑھ رہے ہیں، اور قد اتنا اونچا ہے کہ سینہ بھی دروازے سے اُوپر نظر آرہا ہے، اسی طرح ہر کمرے میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ خواب ہی میں بھائی مالک یہ خیال کر رہے ہیں کہ والد صاحب ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اور سب کمروں میں نماز پڑھ کر رخصت ہو رہے ہیں۔

۲۶ جولائی جمعہ کا روز تھا، اس روز بے ہوشی کی سی کیفیت تھی، جمعہ کی نماز کے لئے نہ جا سکے نماز جمعہ کے بعد، ہم سب بھائی، اور مولوی مشرف علی والد صاحب کے پاس بیٹھے تھے کہ اچانک قے ہوئی۔ قے بالکل ہرے رنگ کی تھی۔ شام کو چار بجے ڈاکٹر احسان صاحب آئے، انھوں نے دیکھا، منہ سے کچھ نہیں کہا، مگر چہرے کے تاثرات اور بے پناہ اداسی نے اس بات کی غمازی کر دی

کہ وہ سمجھ گئے ہیں، علم و دانش کا یہ چراغ اب بجھا چاہتا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا، کہ اب اس عالم سے تعلق قطع ہو رہا ہے۔ گو کہ ظاہری طور پر روح کا تعلق ابھی بدن کے ساتھ قائم ہے مگر احساس فکر و توجہ اس عالم سے ہٹ کر عالم آخرت کی طرف ہو گئی ہے۔

آخر وہ اندوہ گیں، اور قیامت خیز آگئی جب آپ اس عالم فانی سے رخصت ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ آخری وقت میں جب ذرا ہوش آتا تو کلمہ طیبہ پڑھتے، اور قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت کرتے۔ انما اشکو بثی و حزنی الی اللہ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلسل ذکر اللہ زبان سے جاری ہے۔ کبھی کبھی شدت غفلت اور کرب سے زبان کی حرکت نہیں محسوس ہوتی تھی مگر چہرہ اور نگاہوں سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی طرف متوجہ ہیں، ظاہری طور پر یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پیغام خداوندی کا انتظار ہے یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں کو حیات دنیوی کے آخری لمحات میں اس پیغام کا شوق و انتظار بڑھ جاتا ہے تو یہی کیفیت رات کے آخری حصہ میں محسوس ہو رہی تھی۔

سفر آخرت

۸ رجب ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء کی پوری رات انہی کیفیات میں گزری۔ تمام رات ہم سب بھائی چارپائی کے گرد جمع رہے اور اس رات پیش آنے والی کیفیات اور کرب و بیچینی کے باعث سب پر انتہائی تفکر اور پریشانی تھی۔ یہاں تک کہ صبح کی نماز کے بعد پانچ بج کر دس منٹ پر داعی رب کو لبیک کہتے ہوئے اپنی جان جاں آفریں کو سپرد کر دی فانا للہ وانا الیہ راجعون کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ گویا اس وقت جبکہ ایک سورج اپنی شعاعوں سے عالم کو روشن کرنے والا ہے علم و فضل کا روحانی آفتاب دنیائے علم اور ارباب علم کی مجلسوں کو اپنی روشن شعاعوں سے محروم بنا کر دنیا سے رحلت کر رہا ہے۔

حضرت والد صاحب کی وفات صرف ہم چند بھائیوں اور عزیزوں ہی کے لئے حزن و ملال کا

واقعہ نہ تھا بلکہ علمی اور روحانی رشتہ سے سب ہی اہلِ علم اس رنج وغم میں برابر کے شریک نظر آئے۔

وفات کی خبر چند ہی لمحوں میں تمام لاہور میں پھیل گئی۔ پھر ریڈیو کے ذریعے سے بھی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس خبر کو نشر کیا جاتا رہا۔

ریڈیو افغانستان اور بھارت نے بھی اس خبر کو نشر کیا جس سے افغانستان اور بھارت میں بھی تمام اہلِ علم پر صدمہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

صبح دس بجے ہی سے جنازہ میں شریک ہونے کے لئے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ لاہور کے علماء و خطباء اور وکلاء کی بڑی تعداد جمع ہو گئی۔ دوسرے شہروں سے بھی اسی طرح آنے والوں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ صبح ۹ بجے ہی کراچی سے مولانا احتشام الحق تھانوی فون پر پیغام تعزیت دیا اور نماز جنازہ کا وقت معلوم کیا۔ پھر بتایا کہ میں تین بجے کے جہاز سے پہنچ رہا ہوں۔ اگرچہ پہلے ریڈیو کے ذریعے یہ خبر دے دی گئی تھی نماز جنازہ ظہر کے بعد ۲ ۱/۲ بجے ہو گی۔ لیکن مولانا احتشام الحق صاحب اور کراچی و سکھر سے آنے والے حضرات کی وجہ سے ایک گھنٹہ مزید تاخیر کا اعلان کیا گیا۔ سیالکوٹ سے مولانا محمد علی صدیقی صدر دارالعلوم الشہابیہ صبح ۹ بجے ہی پہنچ گئے تھے۔ ظہر کے وقت سے کافی پہلے شہر کے لوگ بہت جمع تھے اور جامعہ کی مسجد بھری ہوئی تھی اور صحن میں بھی اسی طرح لوگ جمع تھے۔

برادر محترم مولانا محمد علی صدیقی اور بعض علماء نے ظہر کے وقت مسجد میں جو حضرات تھے ان کے اجتماع اور مسجد میں ایک عجیب قسم کی رونق اور روحانی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا مسجد میں بارہا اجتماعات ہوتے ہیں لیکن یہ کیفیت قلبی اجتماع میں نہیں محسوس ہوئی جو آج محسوس کی گئی۔

میرے محترم بھائی مولانا محمد مالک بھی اسی قسم کا تاثر پہلے ظاہر کر چکے تھے نماز ظہر کے بعد تمام جامعہ ہجوم سے بھرا تھا۔ گرمی کی شدت کے باوجود لوگ گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہے۔ ہر ایک پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ظہر کے بعد پونے تین بجے علم و فضل کے اس پیکر جسدی اعزاء و احباب نے بیقراری کے عالم میں اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ اور اس کمرہ سے باہر لائے جہاں ہر وقت چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر تھا۔ مسودات و تصانیف کی الماریاں ہر طرف لگی ہوئی تھیں۔

خدا کی شان ہے جس ہستی نے اپنی تمام زندگی کتابوں ہی کے درمیان گزاری۔ اس کا جنازہ بھی جامعہ اشرفیہ کے عظیم الشان کتب خانہ (لائبریری) میں آخری دیدار کے لیے رکھا گیا۔ اس وقت جبکہ کتابوں کے درمیان شہید عالم کا جنازہ احاطہ تحریر نہ سمانے والی ایک کیفیت دلوں میں پیدا کر رہا تھا۔ بڑی مشکل کے بعد ہجوم پر قابو پانے کے لیے دروازوں پر لوگوں کو متعین کیا گیا۔ جس وقت کہ کفن کی چادر سے چہرۂ مبارک کھلا ہوا تھا چہرہ پر عجیب وقار اور انوار محسوس ہو رہے تھے دیکھنے میں یہ معلوم ہوتا کہ اس جسد عنصری سے روح جدا ہو چکی ہے۔ چہرہ کی بشاشت اور رونق سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ زندہ کا چہرہ ہے بلکہ اور عجیب تر یہ بات دیکھنے میں آئی کہ طویل علالت اور کمزوری کی وجہ سے زندگی کے آخری دنوں میں چہرہ انتہائی کمزور ہو چکا تھا اور شدتِ ضعف سے رنگت میں بھی فرق آگیا تھا اور آنکھوں کے حلقے بھی اس سے متاثر تھے لیکن اب جبکہ انتقال کو آٹھ نو گھنٹے سے بھی زائد گزر گئے تھے چہرہ پر شگفتگی، رونق اور توانائی زیادہ نظر آ رہی تھی۔

جنازہ مسجد کے سامنے لایا گیا۔ مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی اور کراچی سے آنے والے حضرات پہنچ گئے تھے ساڑھے تین بجے حسب اعلان نماز ہونی تھی۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ کو مولانا احتشام الحق صاحب سے بہت محبت تھی اور مولانا موصوف بھی انتہائی عقیدت و عظمت کے جذبات سے ہمیشہ ملاقات کیا کرتے تھے۔ مولانا موصوف کا یہی جذبہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ اشرفیہ سے رہتا تھا۔ اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی سے بڑی محبت فرمایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ارادہ یہی تھا کہ نماز جنازہ مولانا تھانوی پڑھائیں گے لیکن لاہور کے بہت سے حضرات کا اصرار یہ ہوا کہ میرے محترم بھائی مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی نماز جنازہ پڑھائیں۔ اگرچہ برادر محترم پر صدمہ اور بیقراری کا یہ عالم تھا کہ وہ اس منظر کو یقیناً برداشت نہیں کر سکتے تھے، چار و ناچار ہمت کر کے آگے بڑھے اور نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز ہوتے ہی مجمع بیقراری کے عالم میں جنازہ کو اٹھانے کے لئے ٹوٹ پڑا۔ اور کچھ دیر کے لیے صورت حال قابو سے باہر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے مجمع نے حلقہ بنا کر جنازہ اٹھانے کی صورت

مرتب کی۔

جنازہ کی مسہری کے پاؤں پہ طویل بانس لگائے گئے تاکہ کاندھا دینے والے کاندھا دے سکیں۔ بانسوں کی طویل قطاروں کے باوجود لوگوں کے ٹوٹ پڑنے کا عجیب عالم تھا۔ جنازہ اٹھایا گیا۔ اور وہ شیخ الحدیث جس نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصّہ اس جامعہ کی در و دیوار کو اپنے علم و عرفان کے نور سے منور کرنے اور آباد و شاداب کرنے میں گزارا جس کا دعائیہ یہ شعر جامعہ کے دروازہ پر نصب کردہ بورڈ پر جلی حرفوں میں دنیا کی نظروں کے سامنے ہے۔

اے خدا ایں جامعہ قائم بدار
فیض او جاری بود لیل و نہار

اور اس نے اپنی زندگی کے اس طویل دور کو اس دعا کا مجسمہ عمل بنائے رکھا وہی شیخ آج اپنی اس محبوب درسگاہ سے رخصت ہوتے ہوئے اسی دعا کو اپنے علمی اور روحانی فیوض و برکات کی شکل میں چھوڑ کر جا رہا تھا۔

جنازہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد اس قدر زائد تھی کہ فیروز پور روڈ کی ایک جانب گاڑیوں کی ٹریفک روکنی پڑی، کم از کم بیس پچیس ہزار کا یہ مجمع جنازہ کے ساتھ شادمان کالونی اچھرا کے قبرستان تک رہا۔ جنازہ کے ساتھ یہ مجمع دیکھ کر بے ساختہ زبان سے یہ نکلا تھا۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

جنازہ کی شرکت و مشایعت کرنے والے اہلِ علم اپنی زبانِ حال سے گویا کہہ رہے تھے۔ سخت بے مہری کہ بے ما می روی ــ قبرستان میں جنازہ لیجا کر رکھا گیا۔ تو لوگوں پہ ایک تحیّر و سکوت اور تحسر و صدمہ کا عجیب سماں تھا جس وقت قبر میں اس پیکرِ علم کو اتارا گیا علماء و طلبا نیز عام متعلقین بے قرار تھے کہ پھر ایک جھلک اس نورانی چہرہ کی دیکھ لیں جس کے علم نے لوگوں کے دلوں کو روشن کیا۔ جنازہ کے اتارنے میں ہم بھائیوں کے ساتھ ہمارے عمِ محترم مولانا محمد ایوب اور بہت سے اکابر

علمار شامل تھے۔

جس قبر میں اتارا جا رہا تھا اس میں اسی طرح کی مہک اور خوشبو موجود تھی جو اس چھوٹے کمرہ میں کئی ہفتوں تک باقی رہی جس میں زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔ ہر ایک زبان پہ یہ دعا تھی۔ وسلام علیہ یوم ولد و یوم یموت و یوم یبعث حیا۔

معالجین:

جن اطباء اور ڈاکٹروں نے والد مرحوم کا علاج کیا، ان میں سے کسی نے بھی اس طرح علاج نہیں کیا جس طرح ایک ڈاکٹر اور حکیم کسی مریض کا کرتا ہے۔ ڈاکٹر منیر الحق نے جتنی کوشش اور بھاگ دوڑ کی، اتنی بھائی اور بیٹوں کے لئے مشکل ہے۔ مگر وہ مشیّتِ ایزدی سے ایف، آر، سی، ایس کا کورس کرنے لندن چلے گئے۔ والد صاحب کو بھی ان سے اولاد جیسی محبّت تھی۔ انتہائی علالت اور کمزوری کے باوجود انھیں گاہے گاہے خط لکھتے رہے۔ ڈاکٹر منیر الحق صاحب اس عرصہ میں لندن سے مسلسل معالجین سے رابطہ قائم کئے رہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر احسان صاحب کو ہر خط میں مقتضائے تعلق علاج کی طرف خاص توجہ اور احوال وکیفیات سے مطلع کرنے کے لئے لکھتے رہے اور اس صورتِ حال سے کافی پریشان تھے۔

ڈاکٹر منیر الحق، والد صاحب کے انتقال کے تقریباً چار ماہ بعد واپس آئے۔ واپسی پر بتایا کہ: جون میں حضرت کا خط آیا، اس میں میرے بیوی بچوں کو بھی دعائیں لکھی تھیں اور مجھے بھی بار بار دعائیں دی ہوئی تھیں۔ وہ خط پڑھ کر معاً میرے دل میں یہ خیال آیا کہ بس حضرت نے مجھے یہ آخری خط لکھا ہے، حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ میرے بچے تو لاہور ہی میں ہیں اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں، یہ خط پڑھ کر میں اتنا رویا کہ کئی روز تک کہیں جانے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

والد صاحب بھی ڈاکٹر منیر الحق صاحب سے بہت محبّت کرتے تھے، اکثر نام لے کر ان کے لئے دعا کرتے۔

ڈاکٹر انور چودھری، اور ڈاکٹر احسان الحق قریشی دونوں لاہور کے معروف اور ممتاز ڈاکٹروں میں ہیں، دونوں حضرات میں نیکی، تقویٰ اور خدا ترسی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان دونوں حضرات نے جس محبت سے والد صاحب کا علاج کیا۔ وہ ہم لوگ یقیناً کبھی نہیں بھولیں گے۔ نہ کبھی انھیں بلانے کی ضرورت ہوئی نہ فون کرنے کی، دور دراز فاصلوں سے اپنا مطب چھوڑ کر خود آئے اور دیکھ کر پھر دوائیں تجویز کرتے۔

ڈاکٹر صاحب لندن جانے کے لئے حضرت سے اور رخصت کی اجازت کے لئے ملاقات اور اجازت رخصت کے بعد ڈاکٹر صاحب حضرت کے کمرہ سے باہر آئے تو ڈاکٹر صاحب کی اشکبار آنکھیں برسات کی جھڑی کا منظر پیش کر رہی تھی، ڈاکٹر کیپٹن حامد علی صاحب عیادت کے لئے تشریف لائے کمرہ سے باہر آئے تو ان کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔

یہی کیفیت حکیم محمد شریف جگرانوی کی رہی۔ بالکل اسی طرح آتے جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے لئے آتا ہو۔ جب یہ لوگ دیکھ واپس جاتے، والد صاحب ہم سے ان سب کی تعریف کرتے، اور بسا اوقات ان حضرات کے خلوص اور محبت کا ان کی طبیعت پر اتنا اثر ہوتا کہ بستر پر لیٹے لیٹے ہاتھ اوپر اٹھا کر والہانہ انداز میں ان کے لئے دعا کرتے۔

معالجین نے شدت نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے جب یہ تجویز کیا کہ خون دیا جائے تو خود معالجین کو ایسا خون دینے میں تامل تھا جس کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کیسے آدمی کا ہے، تو اتفاق یہ کہ برادر محترم عبدالرشید صاحب مالک مکہ پریس جو حضرت والد صاحب سے کمال عقیدت اور محبت رکھتے تھے ان کا گروپ مل گیا تو انھوں نے یہ ایثار کیا اور والد صاحب سے مخفی رکھتے ہوئے دو یا تین بار اپنا خون دیا۔ محترم عبدالرشید صاحب اکثر والد صاحب کی خدمت میں آتے رہتے تھے اور والد صاحب بھی بہت ہی محبت اور شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ محبت میں کبھی ان کو درویش کہتے اور کبھی صوفی کہتے تھے۔ اور لفظ صوفی تو ان پر ایسا چسپاں ہوگیا کہ ان کو پریس والے بالعموم صوفی صاحب کہنے لگے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد برادرم عبدالرشید صاحب نے یہ کہا

خدا کی شان ہے کہ مرنے سے پہلے میرے بدن کا ایک حصہ جنت میں پہنچ گیا۔ انھوں نے یہ جملہ اس پر کہا جب کہ میرے محترم بھائی مولانا محمد مالک نے ان سے یہ کہا تھا۔ بھائی رشید اب تو آپ خون کے رشتہ سے ہمارے بھائی بن گئے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ والد صاحب کی عادت تھی کہ جن اعزا اور احباب سے تعلق تھا ان کے واسطے ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے خواہ وہ فرمائش کریں یا نہ کریں، حتیٰ کہ ان کے بچوں کے واسطے بھی دین و دنیا کی سعادت اور خیر و برکت کی دعائیں کیا کرتے تھے۔

حزب الاعظم اور دلائل الخیرات کے جس نسخے سے ورد اور منزلوں کی تلاوت کا سلسلہ تھا اس میں ہمیشہ ایک فہرست کا پرچہ رکھا ہوا رہتا جس میں ایسے تمام اعزا و احباب کے نام لکھے ہوئے رہتے تھے۔ اور جس کسی کے لئے جو خاص دعا مطلوب ہوتی نام کے ساتھ اس کی بھی وضاحت ہوتی تھی۔

نوٹ: یہ مضمون سہواً اپنی جگہ درج نہیں ہوا لہٰذا یہاں اضافہ کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات

حضرت ابھی نوجوان ہی تھے کہ اکابر اساتذہ نے ۱۹۲۲ء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند جیسی درس گاہ کا استاذ مقرر کر دیا۔ آپ کا تقرر شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے اس مقولہ کا عملی نمونہ اور ثبوت تھا۔

بزرگی بعقل است نہ بہ سال

ہم نے دوسری جگہ بیان کر دیا ہے کہ حضرت کو ابتدا ہی سے پڑھانے کے لئے اعلیٰ اور اہم کتابیں سپرد کی گئیں۔ آپ عربی ادب کی مشہور کتاب مقامات حریری کا بے نظیر حاشیہ تالیف فرمایا۔ آپ نے اس زمانے میں ہدایہ فقہ حنفی کی مشہور و معروف کتاب پڑھائی اور جلالین شریف بھی آپ کے زیر درس رہی۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند میں آپ کا اول دور ۱۳۳۵ھ تا ۱۳۴۶ھ تحریر

ہے۔ ص (۱۱۱) ۱۹۲۹ء تک آپ دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی زمانے میں آپ نے دارالعلوم دیوبند کی تاریخی مرکزی درسگاہ نودرہ میں قرآن شریف کا درس شروع فرمایا جو طلباء اور اہلِ علم حضرات میں خاص توجہ کا مرکز بن گیا۔ اعلیٰ اور اوسط درجے کے طلباء بلاناغہ درس میں حاضر ہوتے اور حضرت کے معارف قرآنی سے محظوظ ہوتے، حضرت کو قرآن شریف کی تفسیر سے فطری اور قدرتی دلچسپی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے مقاماتِ حریری کے حاشیہ میں جابجا قرآنی آیات لکھکر یہ بات ثابت کردی کہ طالب علم جو دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کا اصل نصب العین قرآنی علوم کا حاصل کرنا ہے، دوبارہ ۱۹۳۹ء دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور ۱۹۵۰ء تک بطور شیخ التفسیر واستاذ حدیث علمی خدمات انجام دیتے رہے اس مرتبہ آپ نے پھر درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کا درس قرآن نہایت مفید اور کامیاب ثابت ہوا۔ تمام اساتذہ اور اکابرین نے اس کو پسند فرمایا۔ غالباً یہ پہلے درس ہی کا اثر تھا کہ حضرت والد ماجد کے حیدرآباد تشریف لے جانے کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے آپ کو دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کا منصب جلیلہ پیش کیا اور آپ کا تقرر ثانی بطور شیخ التفسیر ہوا۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۷۷)

ماہنامہ الرشید کے دارالعلوم دیوبند نمبر (۸۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے) حضرت کے شاگرد رشید حکیم مولوی انیس احمد صدیقی نے دارالعلوم دیوبند کی تفسیری خدمات کے تحت لکھا ہے درس قرآن میں بے شمار طلباء اور دوسرے حضرات شریف ہونے لگے۔ نودرہ طلباء سے بھر جاتا بلکہ بہت سے اصحاب برآمدہ سے باہر کھڑے ہوتے تھے کسی اور درس اور سبق میں یہ شان نہیں پائی جاتی تھی جو شان اس درس کو حاصل تھی۔

آسان زبان میں بیضاوی شریف کشاف تفسیر کبیر، ابن کثیر، تفسیر مظہری، روح المعانی، تفسیر عزیزی وغیرہ کا خلاصہ اور جوہر وعطر پیش کردیتے تھے، آپ کے درس قرآن شریف کے بعد تفسیر جلالین کا سبق بہت ہی آسان اور معمولی محسوس ہوتا تھا بلکہ صحیح یہ ہے کہ جلالین شریف کے درس میں

جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، درس قرآن کے طلباء اس سے کہیں زیادہ پڑھ لیتے اور سمجھ لیتے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر حضرت نے کئی روز تک درس دیا، آپ نے فرمایا کہ بسم اللہ میں ب استعانت کے لئے ہی ہو سکتی ہے اور مصاحبت والصاق کے لئے بھی لیکن علامہ زمخشری نے کشاف میں ب کو مصاحبت کے لئے قرار دیا ہے کہ علامہ بیضاوی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے بھی ب کو مصاحبت کے لئے قرار دیا ہے۔ فرمایا چونکہ علامہ زمخشری معتزلی ہیں ان کا ب کو مصاحبت کے لئے قرار دینا استعانت سے احتراز کا باعث نظر آتا ہے۔ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ انسان اپنے اعمال وافعال کا خالق ہے۔ اگر ب کو استعانت کے لئے قرار دیا جائے تو اس عقیدہ پر زد پڑتی ہے اور انسان اپنے اعمال وافعال کے خالق کے بجائے کاسب نظر آتا ہے جو اپنے اعمال وافعال کے لئے درگاہ رب العالمین میں اعانت کا طالب ہے اور اس طرح اہلِ سنّت والجماعت کے مسلک حقّہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس لئے علامہ زمخشری نے اپنے عقیدہ اعتزال کی بنا پر ب کو مصاحبت کے لئے قرار دیا۔ اس میں اعتزال کی بو آتی ہے، اس لئے میرے نزدیک ب استعانت کے لئے ہے نہ کہ مصاحبت کے لئے اور بندۂ عاجز بغیر استعانت حق کوئی کام نہیں کر سکتا۔ سورہ فاتحہ میں صاف طور پر ایاک نستعین موجود ہے۔

حضرت نے فرمایا قاضی بیضاوی اپنی تفسیر میں علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف اور علامہ رازی کی تفسیر کبیر سے استفادہ کرتے ہیں اور ان دونوں تفاسیر کے معارف وعلوم کی تلخیص نہایت جامع الفاظ میں پیش کرتے ہیں، لیکن بعض مقامات پر علامہ زمخشری کی فصاحت وبلاغت سے متاثر ہو کر ان کا ایسا قول نقل کر دیتے ہیں جس پر مسلک حقہ اہلِ سنّت والجماعت کے عقائد کے خلاف رائحہ اعتزال موجود ہوتا ہے۔ (دارالعلوم دیوبند نمبر ص ۵۸۳)

حضرت اپنی تفسیر معارف القرآن میں فرماتے ہیں۔

بسم اللہ کے شروع میں جو ب ہے بعض علماء کے نزدیک مصاحبت اور الصاق کیلئے ہے اور بعض علماء کے نزدیک استعانت کے لئے ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے

کہ اس صورت میں ابتدا ہی سے اپنی عبودیت اور عجز و استعانت کا اظہار ہوگا اور اول وہلہ میں اپنی حول وقوت سے تبری کا اعلان ہو جائے گا یعنی اس کی اعانت و توفیق سے شروع کرتے ہیں حاشا اپنی حول وقوت سے نہیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور بارگاہِ الوہیت کا ادب بھی اس ہی کا متقضی ہے کہ وہاں عبودیت اور تذلل کا اظہار ہو اور عامصاحبت نہ ہو تعالیٰ جد ربنا ما اتخذ صاحبۃ اور یہی معنیٰ ایاک نستعین کے مناسب اور قریب ہیں، اور لاحول ولا قوۃ کے مترادف ہو جانے کی وجہ سے کنز من کنوز الجنۃ یعنی جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ کہلانے کے مصداق ہوگا۔ (ج ۱ ص ۶۰۔ مولوی حکیم انیس احمد صدیقی نے بیان کیا)

حضرت اپنے درس قرآن میں بعض معاصرین کی تفاسیر پر تنقید بھی فرماتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کیف تحیی الموتی کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد نے جو تفسیر اختیار کی ہے۔ حضرت نے اس کو غلط قرار دیا اور فرمایا دراصل بعض حضرات اہلِ مغرب سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے مسلمات کا بھی انکار کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر سے احیا رموتی کا معجزہ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے آیت من امن باللہ والیوم الاخر کی جو تفسیر تحریر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے لئے صرف توحید اور معاد پر ایمان لانا کافی ہے۔ گاندھی جی کو اس تفسیر کے پڑھنے سے اپنے ناجی ہونے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ حضرت نے اپنے درس میں ان نظریات کی پوری طرح تردید فرمائی اور دلائل و براہین سے ثابت کیا کہ سلف صالحین سے اہلِ سنت والجماعت کا جو مسلک حقہ منقول و ماثور ہے وہی حق اور صحیح ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں بعض طلبہ جمعیۃ العلماء ہند کی وجہ سے کانگرس سے خوش فہمی رکھتے تھے، اس لئے ان کو حضرت کی تنقید سے تکلیف ہوئی اور انھوں نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مرحوم سے شکایت کی حضرت مدنی مرحوم نے خود مولانا کاندھلوی سے کچھ نہیں فرمایا لیکن حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند سے کہا کہ مولانا ادریس کاندھلوی نے درسِ قرآن میں مولانا ابوالکلام آزاد پر سخت تنقید کی ہے، سیاسی حالات اور ان سے تعلقات کی بنا پر ایسا نہ کیا جائے

تو بہتر ہے۔

حضرت علامہ عثمانی مرحوم نے فرمایا کہ آپ نے مولینا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کے وہ مواقع ملاحظہ فرمائے ہیں جن پر مولینا کاندھلوی نے تنقید کی ہے۔ مولینا مدنی مرحوم نے فرمایا میں نے مطالعہ نہیں کیا۔ علامہ عثمانی مرحوم نے فرمایا میں نے مولینا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کے وہ مواقع دیکھے ہیں جن پر مولینا محمد ادریس کاندھلوی نے اعتراض کیا ہے اور رد کیا ہے، میری رائے میں مولینا محمد ادریس کاندھلوی نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح اور حق ہے۔ اس پر حضرت مدنی مرحوم خاموش ہو گئے۔

درس قرآن کی مزید خصوصیات کے متعلق تحریر کرنا لاحاصل ہے۔ اس لئے کہ الحمدللہ حضرت کی تصانیف معارف القرآن کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور باقی حصے بھی انشاء اللہ عنقریب شائع ہو جائیں گے۔ حضرت کی تفسیر اگرچہ سورہ سباء کے آخر یعنی ۲۲ پارہ تک مکمل ہو سکی ہے، لیکن حضرت نے باقی حصہ کی مشکل آیات اور اہم مقامات کی تفسیر اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے۔ (قلمی یادداشت)

اس کی تکمیل انشاء اللہ برادر بزرگ مولینا محمد مالک جانشین حضرت والد ماجد فرمائیں گے موصوف سے اہل علم و نظر حضرات اور ہم سب کو بہت زیادہ نیک توقعات وابستہ ہیں۔

حضرت کو قرآن حکیم کی تفسیر سے جو خاص دلچسپی اور تعلق تھا۔ اس سلسلہ میں فرمایا کرتے تھے، میری تمنا تو یہ ہے۔ ع

چوں بہ محشر می روم تفسیر قرآں در بغل

چند مکتوبات

بنام حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

بخدمت مبارکہ وطیبہ محب محترم عالم ربانی قاری محمد طیب صاحب

بعد صد سلام و ہدیہ دعاء غائبانہ واشتیاق لقاء محبانہ آنکہ خدا کرے آنمحترم بصد ہزار صحت عافیت وسلامت وکرامت کے ساتھ ہوں ۔ آمین ثم آمین

بہت یاد آتے ہو، کبھی کبھی خواب میں نظر آجاتے ہو جس سے دل کو کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔ اس سال چھ ماہ شدید علالت میں گزرے، صرف بخاری کے وقت میں کچھ ہوش آجاتے تھے جو بخاری کا سبق پڑھا لیتا تھا۔ سبق کے بعد بیٹھنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ اب ماہ شوال سے بحمدہ تعالیٰ بہت افاقہ ہے۔ دو ہفتے ہوئے کہ سبق بھی شروع کرا دیا ہے۔

آنمحترم کی صحت وسلامت کے لیئے دل وجان سے دعا کرتا ہوں تمہارے وجود کو اپنے لیئے ایک ذخیرہ اور سرمایہ سمجھتا ہوں کہ میرے بعد میرا دوست دار العلوم میں میرے لئے قرآن ختم کرا کے دعا کرا دے گا۔ عالم برزخ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ وہاں پہنچ کر ذاتی عمل تو ختم ہو جاتا ہے مگر احباب کے دعوات وختمات اور صدقات سہارا دیتے رہتے ہیں، آخر کب تک رہائی نہ ہو گی، سو سال سے پہلے تو ابھی قیامت آتی نہیں۔

آنمحترم کے لیئے مختلف ذرائع سے اپنی کچھ کتابیں بھجوائی تھیں منجملہ ان کے لندن سے بھی بھجوائی تھیں معلوم نہیں کہ وہ پہنچیں یا نہیں۔

دار العلوم کی طرف سے مطبع قاسمی میں مفتی عزیز الرحمن اور قاری عبد الوحید کی تصحیح سے ایک قرآن چھپا تھا اس کے اگر ایک دو نسخے مل سکیں تو میرے لیئے ضرور بھیجیں۔ نیز دار العلوم کے کتب خانہ میں ایک قرآن تین ترجمہ والا ہے۔ شاہ ولی اللہ، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر جو

مولانا محمد قاسمؒ کی زیر نگرانی اور تصحیح سے چھپا ہے۔ میرے پاس اس قرآن کے دو نسخے ہیں اگر دو تین نسخے اور مل جائیں تو جس قیمت پر بھی ملیں وہ حاصل کر کے کسی طرح میرے لئے ضرور بالضرور بھیجیں عزیزی عزالقدر قاری محمد سالم سلمہٗ کو بہت بہت سلام و دعاء فلاح دارین۔ بھابی صاحبہ کو بہت سلام و دعاء، سلامت و عافیت۔

والسلام محمد ادریس کان اللہ لہٗ
۲۰ ذی قعدۃ الحرام ۱۳۹۳ھ

بنام مولینا محمد طفیل صاحب جالندھری، اوکاڑہ

برادر عزیز سلمکم اللہ تعالیٰ

بعد صد سلام و دعا، آنکہ آں عزیز کا محبت نامہ دمودت شمامہ موصول ہوا موجب صد مسرت بھی ہوا اور موجب صد ندامت بھی کہ یہ ناکارہ ہرگز اس کا اہل نہیں۔ خیر چاہتا ہوں اہل ہوں یا نہ ہوں آں عزیز نے جو کچھ بھی لکھا اس کا منشا سوائے حب فی اللہ کے اور کچھ نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے یہ کہے کہ میں تجھ سے محبت رکھتا ہوں تو اس کے جواب میں یہ دعا دینی چاہیے أَحَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي أَحْبَبْتُمُونِي لِأَجْلِهِ

بنام مولینا محمد طفیل صاحب جالندھری اوکاڑہ

محمد ادریس کان اللہ لہ از لاہور

مسلم ٹاؤن فیروز پور روڈ جامعہ اشرفیہ

برادر مکرم ذی المجد والکرم حفظکم اللہ تعالیٰ

بعد صد سلام و دعاء آنکہ خط موصول ہوا والد صاحب مرحوم کی
وفات سے بہت صدمہ ہوا کہ آنعزیز کیلئے جو دعاؤں کا
ایک عظیم سہارا تھا وہ جاتا رہا - اللہ تعالیٰ والدہ صاحبہ کو زندہ
و سلامت رکھے اور تم سب بھائیوں کو انکی خدمت و اطاعت
کی توفیق دے اور انکی دعوات صالحات کو تمہارے لئے
اور تمہاری اولاد کیلئے دین و دنیا کی رحمتوں اور برکتوں اور نعمتوں کا ذریعہ
بنائے آمین ثم آمین اور تم سب کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے آمین
والد صاحب مرحوم کا جمعہ کے دن وفات پانا یہ من جانب اللہ عینی بشارت ہے

حدیث مین ہے کہ جو جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات مین وفات پاتا ہے
اس پر قبر مین سوال نہین ہوتا - سیوطی فرماتے ہین کہ جمعہ کے دن
وفات ہی اس شخص کو دیتے ہین کہ جسکے متعلق حق تعالی یہ ارادہ فرماتے ہین
کہ اس سے سوال نہین کرینگے۔

بعض علماء ادھر گئے ہین کہ جس شخص نے جمعہ کے دن وفات پائی تو جمعہ کے دن
تو سوال نہین ہوگا مگر جمعہ گذرنے کے بعد سنیچر کے دن اسکے سوال ہوگا
سیوطی فرماتے ہین کہ یہ صحیح نہین - حق تعالی کی رحمت سے جب ایک مرتبہ
سوال ساقط ہوگیا تو اب دوبارہ عود نہین کریگا سقوط کے بعد عود
شان رحمت کے خلاف ہے الله تعالی المرحوم کو اپنی جوار رحمت
مین جگہ دے اور ہمکو استقامت اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے آمین
عزیزی مقبول سلمہ اور ان کی ۔۔۔ کو اور اپنی گھر مین بہت بہت سلام
و دعا کہ فلاح دارین والسلام کئی روز سے طبیعت خراب ہے اسلئے خط نہ لکھا

استثنا ۔۔ جو جمعہ ۔۔ وفات پائے وہ تو اس مین تو ما مصداق ہے ممکن کہ یہ ہر گو مقبول دوست ہر دو فرقہ ۔۔ مقبول دوست

تعزیت

اہلِ علم و دانش کا خراجِ عقیدت

Phone: 29

Maf Onyx & Co.
IMPORTERS OF ONYX
32 NORTHFIELD AVENUE
LONDON W13 9RL
TEL. 01-579 7330

دَارالعُلوم دیوبند (ہند)
DARUL ULOOM, DEOBAND, U. P.

تجویز تعزیت مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند (منعقدہ ۸ رجب ۱۳۹۴ھ)

مجلس شوری کا یہ اجلاس حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کی وفات پر اپنے دلی رنج والم کا اظہار کرتا ہے، مولانا موصوف کو علماء دارالعلوم میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا، وہ ایک جلیل القدر عالم، جید مدرس اور کامیاب مصنف تھے اس کے ساتھ ورع و تقوی میں مولانا موصوف سلف صالح کا نمونہ اور انکی سچی یادگار تھے ایسے باکمال عالم کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ملت کا نقصان عظیم ہے،

مولانا مرحوم ایک طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند میں طبقہ علیا کے مدرس رہے، تفسیر و حدیث کلام وادب اور فقہ انکے مخصوص علوم تھے بالخصوص فن حدیث میں ید طولی حاصل تھا، علم حدیث میں مشکوۃ المصابیح کی شرح التعلیق الصبیح تفسیر میں معارف القرآن اور سیرۃ میں سیرۃ المصطفی انکے علوم تفسیری حدیثی اور تاریخ کارنامے ہیں، مقامات حریری وغیرہ مختلف درسی کتب پر آپ نے حواشی بھی تحریر فرمائے، اسکے علاوہ بھی مولانا کاندھلوی نے مختلف موضوعات پر معرکۃ الاراء کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، بہرحال علمی اور اخلاقی حیثیت سے مولانا موصوف کو جماعت دیوبند میں ایک امتیازی مقام حاصل تھا —

مجلس شوری کا یہ اجلاس بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالی مولانا موصوف کو جنت الفردوس میں مقام رفیع عطا فرمائے اور انہیں اپنی بیکران رحمت سے سرفراز فرمائے، مجلس شوری کے ارکان حضرت مولانا مرحوم کے پس ماندگان کے اس رنج و غم میں شریک ہیں، اور انکے لئے حضرت مولانا کے نقش قدم پر چلنے کی بارگاہ خداوند میں دعا کرتے ہیں —

افسوس ہے کہ ہندو پاک کے مابین رسل و رسائل کا سلسلہ مسدود ہو نیکے باعث ان تاثرات کو حضرت مرحوم کے ورثاء تک پہنچانا دشوار ہے تاہم کسی ذریعہ سے مجلس کے تاثرات غم اونکے ورثہ تک پہونچانے کی سعی کی جائے —

(دفتر مہتمم دارالعلوم دیوبند)

۱۱ رجب ۹۳ھ

سیدنا و مولانا محمد ادریس الکاندہلوی رحمۃ اللہ علیہ

تبا لدنیا لا یدوم نعیمہا — وجمیع ما منہا لدینا فان

ادریس لا تبعد فذکرک خالد — والذکر للانسان عمر ثان

قد کنت ترجو ان تکون خلیفۃ — لدار السنۃ وانوار القرآن

لکن رحلت الی الجنان بعجلۃ — وترکت اہلک فی البکا لزمان

قد کنت بحرا فی العلوم باسرہا — ولانت حقا عارف ربانی

قد کنت بدرا للعباد حبیبا — ولانت نجم راجم الشیطان

خالقہ یورثک الجنان برحمۃ — اکرمہ بالروح والریحان

ثم الصلوۃ علی النبی محمد — خیر الخلائق من بنی عدنان

جبر اللہ العواد

ظفر احمد عثمانی ۲۰ جمادی ۱۳۹۴ھ

PAKISTAN
SUPREME COURT

MR. JUSTICE
HAMOODUR RAHMAN, H. Pk.,
CHIEF JUSTICE OF PAKISTAN

Abbottabad, the
30th July, 1974.

Dear Maulana Mohd. Usman,

I was deeply shocked to learn of the sad demise of your revered father, late Maulana Muhammad Idrees Kandhalvi. He was not only a saintly person but also a great scholar in whom the Council of Islamic Ideology had great aspirations for the fulfilment of its task of the Islamization of the laws of the country. He has written many books on Islamic theology and fiqah which will no doubt glorify Islam and its philosophy for all times to come. He will always be remembered through his works.

I was deeply touched by the affection with which he received me when I visited him last at his residence. I shall value the copies of his works which he so kindly presented to me.

I on behalf of myself and all the members and staff of the Council express our sincere and heartfelt condolences on your bereavement and assure you that we equally share your loss. Please convey our sympathies to the other members of the bereaved family as well.

We all pray to Almighty Allah to grant the departed soul peace in Heaven and courage to those he has left behind to mourn his loss.

Yours equally in grief,

Hamoodur Rahman

(Hamoodur Rahman)

Maulana Mohammad Usman Siddiky,
s/o late Maulana Mohammad
Idrees Kandhalvi, Jama-e-Ashrafia,
Lahore.

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم

"۲۸ جولائی اتوار کے دن مولانا محمد ادریس کے انتقال کی خبر سن کر سناٹے میں آگیا، اور دیر تک انا للہ وانا الیہ راجعون کا تکرار کرتا رہا۔ پھر درسِ بخاری کے بعد ان کے لئے خصوصی دعا کی، قیلولہ کے وقت بھی ان کا خیال رہا۔ اور چند عربی اشعار موزوں ہوگئے جو ارسال کر رہا ہوں"۔

مولانا مرحوم ان جید علماء باعمل میں سے تھے جن پر ان کے اساتذہ کو فخر ہے۔ مولانا نے مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں مجھ سے مشکوٰۃ شریف، اور ایک دو عربی ادب کی کتابیں پڑھی ہیں، مجھے خوشی ہوئی وہ بعد میں شارحِ مشکوٰۃ بن گئے اور عربی زبان میں التعلیق الصبیح کے نام سے مشکوٰۃ کی ایسی شرح لکھی جو رہتی دنیا تک ان کا نام روشن رکھے گی، اور علماء سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہے گی، ان کی سیرۃ مصطفیٰ اور تفسیر قرآن بھی بہت خوب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

مکتوب حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی ؒ از ٹنڈو الہ یار سندھ

مورخہ : ۳۰ جولائی ۱۹۷۴ء

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی

"ایک طویل مدت کے رفیق اخی فی اللہ حضرت مولانا ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا حادثۂ جاں کاہ پیش آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو رہا ہے۔ یہ ناکارہ لاہور کی حاضری اور جنازہ کی شرکت سے تو اپنی بیماری کے سبب معذور و مجبور تھا ہی، اس حادثے نے ایسی کمر توڑی کہ خط لکھنے کی ہمت و طاقت بھی جواب دے گئی۔

مولانا مرحوم کی طویل علالت اور غیر معمولی ضعف کی خبریں عرصہ سے پریشان کر رہی تھیں ہر وقت دھیان لگا رہتا تھا۔ دعا اور تمنا تھی کہ مولانا کو اللہ تعالیٰ عمر طویل عطا فرمائے، اور افادۂ خلق اللہ جو ان کی ذات سے قائم تھا، وہ اور باقی رہے۔ اور کم از کم میری زندگی میں یہ حادثہ پیش نہ آئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مولانا کو سباق غایات بنایا تھا۔ باوجود ہم عصری، اور تقریباً ہم عمری کے وہ ہم سے علمی، عملی، اخلاقی اور تمام کمالات میں سبقت لے گئے تھے میدانِ ہستی کے قطع کرنے میں بھی وہ ہم سے سابق ہو گئے۔

اس عالمی حادثے میں کون کس کی تعزیت کرے، اس کا متعین کرنا آسان نہیں، مولانا مرحوم کا وجود پوری اُمت کے لئے ایک سہارا تھا۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پُر کرنا کس کے بس میں ہے۔؟ حقیقت یہ ہے کہ اس صدمۂ جاں کاہ سے ہر مسلمان بقدر ایمان و علم متاثر ہوا ہے، سب ہی تعزیت کے مستحق ہیں۔

مولانا مرحوم کے بعد اپنی زندگی اور زیادہ تلخ ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی برکات سے آپ کو اور ہم سب کو محروم نہ فرمائیں۔

مکتوب۔ از حضرت مفتی محمد شفیع صاحب۔ کراچی

۱۴ رجب ۱۳۹۴ھ / ۳ اگست ۱۹۷۴ء

حضرت مولٰینا قاری محمد طیّب صاحب مدظلہم العالے

"کل ریڈیو سے یہ ہوش رُبا خبر کان میں پڑی کہ میرے دوستِ صادق، عالم باعمل، نقی ونقی حضرت مولانا محمد ادریس صاحب خدا کو پیارے ہوگئے اور کل تک جنھیں ہم سلمہ اللہ اور دام ظلہ سے مخاطب کیا کرتے تھے، آج انھیں رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ سے یاد کر رہے ہیں۔

اُن کے لیے تو انشاء اللہ دارِ آخرت، دارِ دنیا سے کہیں زیادہ راحت کا باعث ہوگا، رونا تو اپنا ہے کہ اس باکمال شخصیت سے ہم محروم ہوگئے۔

میرے عزیز دائم ہی یتیم نہیں ہوئے، بلکہ ہم سب آج اپنے کو یتیم محسوس کر رہے ہیں۔ ان کا علم وفضل، ان کا عام افادہ، تحریر وتقریر، درس وتصنیف رہ رہ کر دل کو گھلا رہا ہے۔ اور اس وفورِ علم پر سادگی، بےنفسی، مسکنت وتواضع اُن کا حصہ تھا۔ وہ صحیح معنی میں "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماءُ" کے سچے مصداق تھے۔

سارا علمی حلقہ ان کی وجہ سے سوگوار ہے، دارالعلوم میں خبر پہنچتے ہی سب میں غم کی ایک لہر دوڑ گئی۔

آج درس بند کر کے ختم پڑھا گیا اور جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ احقر نے مرحوم کے احوالِ صادقہ اور علوم فائقہ پہ روشنی ڈالی، اور عرض کیا کہ یہ صدمہ پورے دارالعلوم کا بلکہ پوری علمی جماعت کا ہے۔

مولانا ئے مرحوم، دارالعلوم کے ایک قابلِ فخر مدرس تھے، اور وہ آج یہاں ہوتے تو تدریس کے سب سے اونچے مقام پر ہوتے، ان کا تبحر، مسلک میں پختگی ورسوخ، ورع وتقویٰ، وسیع النظری، اور علوم کا استحضار سب کے سامنے ہوتا لیکن انھوں نے علمی لائنوں پر جو کام وہاں کیا، اُسے ہم سب اپنا ہی کام سمجھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ وہاں بھی ان کے درجات بلند فرمائے۔

محمد طیّب

مکتوب ۔ از حضرت قاری محمد طیّب صاحب

۸ رجب ۱۳۹۴ھ/ ۲۹ جولائی ۱۹۷۴ء

حضرت مولینا محمد طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند (یوپی)

عزیز محترم مولانا محمد مالک صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون و دعا ء مقرون ۔ محبت نامہ آج دستی ملا، خوشی ہوئی کہ میرا عریضہ پہنچ گیا ۔ بھائی ادریس صاحب مرحوم کے حادثہ کا برابر دل پر اثر ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کا ایک خزانہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا ۔ مولانا سید فخرالدین صاحبؒ کے وصال کے بعد دارالعلوم کی صدر مدرسی کا قصہ چھڑا ۔ سب کی زبان پر یہ تھا کہ اگر مولانا ادریس صاحب یہاں ہوتے تو انتخاب صدر مدرس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا وہ بنے بنائے صدر مدرس دارالعلوم ہوتے ۔ بہر حال ان کا صدمہ وقتی نہیں ہے جب بھی علم و کمال اور زہد و تقویٰ کا ذکر آئے تو ان کا ذکر آنا قدرتی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اذا ذکراللہ ذکر وا و اذا ذکروا ذکراللہ کے سچے مصداق تھے، حق تعالیٰ انھیں وہاں بلند درجات عطا فرمائے اور ہم جیسے گنہگاروں کے لئے فرط اور اجرو ذخر بنائے ۔ اس سے غیر معمولی خوشی ہوئی کہ آپ نے جامعہ اشرفیہ میں آنا منظور فرمالیا ہے ۔ حقیقتاً آپ اس کے اہل تھے اور الولد سر لابیہ کے سچے مصداق انشاءاللہ تعالیٰ ثابت ہونگے اور خالی شدہ جگہ انشاءاللہ پُر ہو جائے گی ۔ بھائی مرحوم کی رُوح بھی اس سے غیر معمولی خوشی کا اثر لے گی کہ ان کی جگہ پر انہی کا جگر گوشہ پہنچ گیا ہے ۔ حق تعالیٰ مبارک فرمائے اور آپ کو مفتاح للخیر مغلاق للشر ثابت فرمائے بھائیوں کو دعائیں، بچّوں کو بہت بہت دعاء ۔ امید ہے کہ حق آپ سے کام لیں گے ۔ خدا کرے کہ راستے کھل جائیں کہ آپ کے دور تدریس جامعہ کو آنکھوں سے دیکھنا میسّر آجائے ۔ آمین ۔ یہاں سب خیریت ہے، سالم اسلم وغیرہ سلام کہتے ہیں ۔ والسلام ۔

محمد طیّب از دیو بند ۱۷ شعبان ۹۴ھ

صاحبزادہ مولانا محمد سالم نبیرہ قاسم العلوم الخیرات جامعہ دینیات اُردو دیوبند

برادرانِ محترمین مولانا محمد نعمان صاحب، مولانا محمد مالک صاحب و مولانا محمد میاں صاحب

زیدت عنایاتکم۔

بعد سلام مسنون اخلاص مقرون، ایک عریضہ حضرت اقدس مولانا محمد ادریس صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات حسرت آیات کی المناک اطلاع پر بالواسطہ آپ محترمین تک پہنچانے کی سعی کی گئی جس کا نتیجہ تا حال معلوم نہ ہو سکا۔ اب ڈاک بھی کھل گئی ہے اور آج اتفاقاً ایک جانے والا بھی دستیاب ہو گیا اس بے اعادۂ تاثرات الم اس یقینی ذریعہ سے بھر ارسال کئے بغیر طبیعت نہ مانی، اعزہ، احباب اور محسنین کے اس سال میں پندرہ سے زیادہ حوادث وفیات نے دلوں پر جو کوہ الم رکھا ہے اُن میں انمٹ قسم کا الم انگیز تاثر جو کسی وقت بھی قلب و دماغ سے نہیں ہٹتا وہ دو بزرگوں کا ہے، ایک راقم الحروف کی والدہ محترمہ نور اللہ مرقدہا کا اور دوسرا حضرت اقدس مولانا محمد ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا، حضرت مرحوم کے سانحۂ ارتحال کی وحشتناک خبر کے ساتھ اس احساس نے اس اس غم کو مضاعف بنا دیا کہ گزشتہ گیارہ سال کے طویل ترین وقفے میں زیارت و ملاقات کے مواقع بھی وقت و تخت نے مسدود کر دیئے تھے۔

حضرت مولاناؒ کی وفات سے جماعت میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ صرف ایک عالم ہی کے اٹھ جانے کا نہیں بلکہ ایک عالم ایک بے مثال مفسر، ایک بے بدل محدث، ایک بے مثل فقیہہ، ایک بے نظیر متکلم اور ایک بے عدیل جامع کمالات ایسی ہستی کا اٹھ جانا ہے کہ جس میں اللہ رب العزت نے کمالات علم و معرفت کے ساتھ تقویٰ و طہارت، پاکیزگیٔ ظاہر و باطن اور شخصیت و معرفت کی تمام شئون کو یکجا جمع فرما دیا تھا۔ ان کی نظر نظر معرفت تھی اور نفس نفس علم و حکمت، میں نے ہمیشہ ان کو اپنی بساط کے ایک ایسی مغتنم ہستی پایا، دیکھا اور برتا ہے کہ جن کے وجود کو کسی جماعت کے عند اللہ مقبول ہونے کی دلیل کے طور پر بلا خوفِ تردید پیش کیا جا سکتا ہے، ان کے لئے کونسی حق پسند و حق شناس زبان ہو سکتی ہے

کہ جو رحمت و رضوان اور لطف رحمان کی بصمیم قلب دعا گو نہ ہو۔ ایسی برگزیدہ شخصیت کے حق میں دعا گوئی انشاء اللہ دعا گو کے نامہ حسنات میں ایک مقبول اضافہ ثابت ہوگی۔ غفر اللہ لہ و اعلی اللہ مقامہ وانا للہ وانا الیہ راجعون۔

بصمیم قلب دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ سب کو صبر جمیل اور اجر جزیل ارزانی فرمائے، اور اہلِ حق کو ان کے نعم البدل سے نوازے، آمین۔ گو یہ غم عالم تنہا آپ کا نہیں بلکہ ملت کا ہر حق پسند اس پر سوگوار اور مستحقِ تعزیتِ مسنونہ ہے، لیکن آپ بھائیوں کو اللہ نے ان کی نشانی بنایا ہے۔ اس لئے آپ کی خدمات میں تعزیتِ مسنونہ پیش کر کے ایک حق واجب کی ادائیگی ہوتی ہے، وہیں آپ بھائیوں کو خطاب کر کے اپنے قلب کو بھی ایک گونہ تسکین میسر آتی ہے، میری جانب سے خانہ عامرہ کے تمام حضرات کی خدمت میں تعزیتِ مسنونہ پیش فرما دیجائے۔ والسلام۔ محمد سالم قاسمی

احقر خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

مولانا محمد انعام الحسن صاحب کاندھلوی۔

امیر تبلیغی جماعت۔ دہلی۔ (بھارت)

"ریڈیو پاکستان کے نشریے سے اس جاں کاہ حادثہ کی اطلاع ملی کہ حضرت الحاج مولانا محمد ادریس (علیہ الرحمۃ) کا انتقال ہوگیا ہے، یوں تو اس دارِ فانی سے اپنے اپنے وقت پر سبھی کو جانا ہے، مگر بعض حضرات کا جانا، سارے عالم اور پوری اُمت کا نقصان شمار ہوتا ہے، انہی نفوسِ مبارک میں حضرت مولانا علیہ الرحمۃ بھی ہیں۔"

حضرت مولینا شمس الحق صاحب افغانی سابق وزیر معارف شرعیہ ریاست ہائے متحدہ

دبلوچستان و شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند حال صدر شعبہ تفسیر اسلامی یونیورسٹی بھاولپور

بگرامی خدمت جامعہ العلوم العقلیۃ والنقلیۃ صاحبزادہ عبید اللہ صاحب نبوت معارفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خیریت جانبین نصیب آج دن ایک بجے کے ریڈیو سے یہ جانکاہ خبر سنی کہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی وصال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ جل مجدہ ان کو اپنے قرب سے نوازے اور مقام علماء ربانین کا مخصوص درجہ اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائے ختم قرآن کا ایصال ثواب کیا جا رہا ہے۔ اللھم اغفرہ وارحمہ ونور قبرہ

حضرت موصوف جامع عالم باعمل ہونے کے علاوہ چند ممتاز خصوصیات کے حامل تھے۔

(۱) ابتدائے فراغت علوم کے وقت سے لے کر وقت وفات تک میرے اندازے کے مطابق آپ نے تقریباً ساٹھ سال مسلسل علوم دینیہ کا درس دیا (۲) انداز درس عام فہم اور پُر از معلومات تھا۔ (۳) اس دور میں آپ کو کتب دینیہ کا اس درجہ شوق و شغف تھا کہ ان کے معاصر علماء میں اس درجہ کا شوق بہت کم پایا جاتا ہے۔ دیگر علوم کے علاوہ تفسیر ادب عربی حدیث اور علم کلام میں آپ کو خصوصی مہارت حاصل تھی۔ (۴) آپ نے تصانیف کے ذریعہ اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ تقریباً دور حاضر کے ہر دینی فتنہ اور الحاد کے خلاف آپ نے بہترین کتابیں لکھی ہیں جو انشاء اللہ تعالیٰ مقبول عند اللہ ہوئی ہوں گی۔ (۵) آپ کا مخصوص وصف یہ تھا کہ عصری فتنوں غربی الحاد کے شیوع اور سیاسی مصلحت اندیشیوں کے باد صرصر میں بھی آپ جادۂ سلف سے ایک انچ ہٹنے کے لئے تیار نہ تھے اور مزاج تقوی ایسا پایا تھا کہ اگر پوری دنیا غربی و یورپی فتنوں میں خدانخواستہ ڈوب جاتی تو آپ کے سلف صالحین کے صراط مستقیم کی چٹان پر تنہا کھڑے رہتے۔ میری طرف سے مولانا محمد مالک صاحب و دیگر فرزندان صاحبان کو تعزیت اور حضرت مولانا کے حق میں دعائے مغفرت پہنچا دے اور اہل و عیال کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل و اجر جزیل عطا فرما دیں۔

احقر شمس الحق افغانی۔ ترنگ زائی پشاور

حضرت مولینا عبدالحق صاحب بانی و مہتمم دارالعلوم حقانی اکوڑہ خٹک (پشاور)

گرامی قدر مخدومی المحترم حضرت مولانا محمد مالک صاحب زید مجدکم

السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

آج کے اخبارات سے حضرت مولانا مرحوم کے انتقال کا معلوم ہو کر بندہ جملہ متعلقین دارالعلوم کو انتہائی صدمہ ہوا۔ انّا للہ وانا الیہ راجعون" حضرت رحمتہ اللہ کی مفارقت آپ و تمام خاندان کے لئے صدمہ جانکاہ کیا بلکہ ہم خدام و پورے امت مسلمہ کے لئے ایک عظیم المیہ ہے۔ آپ حضرات کے ساتھ جس طرح شفقت پدری فرماتے رہتے تھے اسی طرح ہمیشہ اور ہر موقع پر ہم نا کاروں اور اس دینی مدرسہ کی سرپرستی فرماتے رہے۔ مولانا مرحوم مجسمہ علم تھے اور زہد و تقویٰ میں بھی بے مثال نمونہ رہے، اپنی پوری زندگی اور جدوجہد تصنیف و تالیف اور اشاعتِ دین میں صرف کر دی۔ خوش قسمت ہیں حضرت مولانا مرحوم کہ اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے مگر بدقسمت ہیں ہم گنہگار کہ اپنے ایک عظیم مشفق سرپرست اور علوم و فنون کے ایک گنجینہ سے محروم ہو گئے۔ آپ حضرات و جملہ اعزہ و متوسلین کے لئے صدمہ جانکاہ ہے۔ مگر مصیبت میں اجر عظیم کی بشارتیں بھی آپ کے سامنے ہیں اور ایسے مواقع پر آپ جیسے بزرگوں کے طرزِ عمل عامتہ الناس کے لئے اسوۂ حسنہ بنتا ہے۔ یہاں دارالعلوم میں تمام طلباء اساتذہ نے حضرت مولانا رحمتہ اللہ کے رفع درجات کے لئے قرآن مجید کے ختم کئے۔ دست بدعا ہوں کہ رب العزت ان کو درجاتِ عالیہ سے نواز کر آپ و جملہ برادران و خاندان کو صبر جمیل و اجر جزیل سے نوازے۔

والسّلام

عبدالحق عفر اللہ، مہتمم دارالعلوم حقانی، اکوڑہ خٹک

از حضرت مولینا عبد الحق صاحب مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ

گرامی قدر مخدومی المحترم حضرت مولانا عبید اللہ صاحب و حضرت مولانا عبد الرحمان صاحب

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اخبارات میں حضرت مولانا مرحوم کے انتقال کا معلوم ہو کر بندہ و جملہ متعلقین دار العلوم کو انتہا صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت رحمۃ اللہ کے سایۂ شفقت و عطوفت نہ صرف آپ حضرات پر تھی بلکہ ہم گناہ گاروں کو بھی اپنی سرپرستی اور دعاؤں سے ہمیشہ نوازتے رہے۔ ان کی وفات کا صدمہ سب سے زیادہ ان بچوں اور آپ حضرات کے لئے ہے۔ مگر مصیبت میں اجر عظیم کی بشارتیں بھی آپ کے سامنے ہیں اور ایسے مواقع پر آپ جیسے بزرگوں کے طرز عمل عامۃ الناس کے لئے اسوۂ حسنہ بنتا ہے۔ مولانا مرحوم علم و فضل کے عظیم مینار اور زہد و تقویٰ کے مشعل تھے۔ اپنی پوری زندگی اشاعت دین، درس حدیث اور تصنیف و تالیف میں گزاری اور یہ تمام امور ان کے لئے آخرت سرمایۂ اجر اور افتخار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم حقیروں اور پورے اُمّت مسلمہ پر ان کے انوار و برکات نازل فرمادیں۔ یہاں دار العلوم کے تمام طلباء، اساتذہ و متعلقین نے ان کے رفع درجات کیلئے قرآن مجید کے ختم کئے، دست بدعا ہوں کہ رب العزّت ان کو درجات عالیہ سے نوازے اور آپ حضرات و جملہ متعلقین و متوسلین کو صبر جمیل و اجر جزیل سے نوازیں۔ صاحبزادہ مولانا فضل الرحیم کی خدمت میں سلام۔

والسلام

بندہ عبد الحق غفرلہ، مہتمم دار العلوم حقّانیہ

حضرت مولینا محمد یوسف بنوری مدظلہ

مدیر بنیات لکھتے ہیں :

اس سال کچھ ایسا محسوس ہوا ہے کہ علمی دنیا کے لئے عام الحزن ہے۔ بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں اور عظیم القدر اشخاص سفرِ آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں۔ ابھی جولائی ۱۹۷۴ء جمادی الاول ۱۳۹۴ھ میں عالم اسلام کے مفکرِ عظیم سیاسی رہنما، تجربہ کار، قدیم سیاست دان اور فقہ اسلامی کے مفتی اعظم سید محمد امین الحسینی فلسطینی واصل بحق ہوئے۔ اخبارات کے صفحات پر مرحوم کے حادثہ وفات پر اظہار تاثرات کے سلسلہ کی روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ دورِ حاضر کے ایک متبحر عالم اور جلیل القدر محدث حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئے۔ حضرت مرحوم کی وفات سے بلاشبہ اہلِ علم کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان اور ناقابلِ برداشت خسارہ ہے۔ جس کی مکافات اور تدارک کا کوئی امکان نہیں۔ (ماہنامہ بنیات ستمبر ۱۹۷۴ء)

از حضرت مولینا محمد یحییٰ صاحب صدیقی سابق مدرس دارالعلوم دیوبند، کراچی

عزیزم نعمان میاں سلمہ اللہ تعالےٰ

بعد سلام مسنون۔ کل تمہارے ٹیلیفون سے محترم بھائی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حادثہ وفات کا علم ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون عظیم صدمہ اور قلق ہوا۔ تمہارے لئے اور دوسرے اعزہ واولاد کے لئے عظیم حادثہ اور صدمہ ہے اور اس پر جتنا بھی صدمہ اور رنج وملال ہو حق بجانب ہے لیکن مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ ہر انسان کے لئے یہ منزل مقدر ہے اور وقت مقرر ہے۔ اذا جاء اجلھم لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ اللہ تعالیٰ بھائی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ بھائی صاحب مرحوم کو اپنی عظیم اور لازوال نعمتوں سے نوازے گا۔ مرحوم نے پوری عمر قرآن وحدیث اور دینِ مبین

کی خدمت اور تعلیم و تبلیغ میں صرف کی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ان کی حسنات کے اجر و ثواب میں اضعافاً مضاعفہ اضافہ فرمائے۔ آمین۔

یہ حادثہ نہ صرف تم لوگوں کے لئے بلکہ پورے خاندان کے لئے ایک حادثہ اور صدمہ ہے پورے خاندان کے لئے ان کا وجود اور ان کی ذات باعث برکت تھی۔ بلکہ ان کی رحلت سے تمام مسلمانوں کو ایک بڑا عظیم صدمہ پہنچا ہے اور ان کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے۔ بظاہر اس کے پر ہونے کی امید اللہ تعالیٰ ہی کے فضل خاص سے وابستہ کی جا سکتی ہے وھو علی ما یشاء قدیر۔ میرا یہ عریضہ عزیزم مولانا محمد مالک صاحب، مولانا محمد میاں صاحب، مولوی قاری محمد عثمان مولوی محمد عمران اور مولوی محمد احمد صاحب، نیز محترمہ بھابی صاحبہ کو سلام مسنون کے ساتھ مطالعہ کرادیں۔

دعاگو۔ محمد یحییٰ صدیقی از کراچی ، ۱۹ر جولائی ۱۹۷۴ء

کلچرل اینڈ انفارمیشن سینٹر پیپلز آف بنگلہ دیش ان پاکستان لاہور

مکرمی و محترمی السلام علیکم

ریڈیو کے ذریعہ مولانا ادریس صاحب کے وفات کی خبر سن کے بے حد غم و افسوس ہوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم آپ لوگوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اہلِ بنگال کی طرف سے تعزیت کرتے ہیں۔ براہِ کرم مولانا مرحوم کے عزیز و اقارب اور احباب کی خدمت میں ہمارے احساس کا اظہار کر دیں۔ ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے، خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مغفرت فرمائے ہمیں ان کے نقش قدم پر چل کر خدمت کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔ فقط والسلام آپ کے غم میں شریک

مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی بانی جماعت اسلامی پاکستان

ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

مولینا کاندھلوی اور میں ایک مدت دراز تک حیدر آباد دکن میں مقیم رہے ہیں۔ اور وہیں میری ملاقات ابتدا ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے ان کے آخری ایام تک ان سے ربط و تعلق قائم رہا۔ اور وہ ہمیشہ مجھ سے شفقت و محبت سے پیش آتے تھے دینی علم و فضل اور فہم و بصیرت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں حظ وافر عطا فرمایا تھا۔ اور عربی زبان و ادب میں ان کی مہارت اور وسعت نظر مسلمہ تھی۔ تعلیم و تدریس اور تالیف و تصنیف ان کی زندگی کا اساسی مشغلہ تھا۔ گوشہ نشین اور عزلت گزین ستان تھے۔ تاہم ان کے متعلق یہ خبر معلوم و مشہور ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس اور اس کے سیاسی نظریات کے شدید مخالف تھے اور اپنی مجالس میں کانگرس کے ہمنوا دیو بندی علماء پر تنقید کرتے رہتے تھے۔ اگرچہ وہ خود علماء دیو بند کے اساطین میں شمار ہوتے تھے، پاکستان آنے کے بعد بھی اگرچہ عملی سیاست میں انھیں زیادہ شغف نہیں تھا لیکن ہمارے ملک کو ایک اسلامی ریاست یا لادینی واشتراکی ریاست بنانے والوں کے درمیان جو کشمکش ابتداء سے جاری ہے اس میں مولانا کی ہمدردیاں ہمیشہ اسلامی عناصر کے ساتھ رہی ہیں۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں علماء کا جو اجتماع کراچی میں ہوا تھا اور جس میں اسلامی ریاست کی تاسیس کیلئے بائیس نکات بالاتفاق مرتب کئے گئے تھے، اس اجتماع میں مولینا محمد ادریس مرحوم بھی شامل تھے

محمد ایوب خاں صاحب نے مارشل لگا کر مارچ ۱۹۶۲ء میں جو عائلی قوانین جاری کئے تھے ان پر بھی علماء نے تنقیدی بیان جاری کیا تھا ان میں بھی مولینا کاندھلوی شریک تھے، ان تمام علماء کو فرداً فرداً مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز میں بلا کر ان پر تہدید و تخویف کے حربے آزمائے گئے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے سب کے سب ثابت قدم رہے۔ مولینا مرحوم کو بھی ڈرایا دھمکایا گیا اور کہا گیا آپ سیدھے سادے انسان ہیں آپ کو ناحق ورغلا کر دستخط کرائے گئے ہیں۔ آپ نے بڑی جرات سے جواب دیا کہ نہیں میں ایسا بے وقوف یا بے حس نہیں ہوں، جیسا کہ آپ نے فرض کیا ہے۔ ہم

سب نے خوب سوچ سمجھ کر باہمی مشورہ کے بعد یہ بیان مرتب کیا ہے اور اسے اشاعت کے لئے دیا گیا ہے۔ جب شریعت کے قانون کو مسخ کیا جا رہا ہو تو علماء خاموش نہیں رہ سکتے۔

حضرت مولانا مفتی محمد حسن ان دنوں علیل ہونے کی وجہ سے زیادہ سوچ بچار کے قابل نہ تھے مسودہ تیار ہونے پر انھوں نے دریافت کیا کہ دوسرے علماء کے ساتھ مولانا ادریس نے بھی دستخط کر دیئے ہیں۔ جب جواب اثبات میں دیا گیا تو انھوں نے بھی فوراً دستخط ثبت کر دیئے۔ جماعت اسلامی اور میرے متعلق ہمیشہ حسن ظن کا اظہار فرماتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جب ہم مسلم لیگ سے تعاون کرتے رہے ہیں تو جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون کیوں نہ کریں گے۔ گاہے بگاہے میرے ہاں بھی تشریف لاتے۔ اور اپنی بعض تصانیف جو ساتھ لاتے تھے عنایت فرماتے تھے، میں بھی بعض کتابیں بالخصوص ان کے عربی تراجم ان کی خدمت میں پیش کرتا تھا، کیونکہ انھیں اردو کی بہ نسبت عربی سے زیادہ مناسبت تھی — التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ان کی بلند پایہ تصنیف ہے، عربی اردو میں آپ کی تصانیف کثیر التعداد ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔ (خاکسار ابوالاعلیٰ مودودی)

مولانا مودودی نے یہ خط ظہیر الدین ایم۔اے کو لکھا ہے، موصوف اپنا مقالہ متعلقہ ایم۔اے حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی پر تالیف کیا ہے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

"مولانا مرحوم اپنے علم وفضل، تقویٰ و تدین، اور عدم تصنع کے اعتبار سے سلف کی یادگار تھے۔ درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کے ذریعہ سے خلقِ کثیر آپ سے فیض یاب ہوئی ہے۔ اور انشاء اللہ یہ فیضان مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔

مکتوب:۔ از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، لاہور

۲۸ اگست ۱۹۷۴ء

مولانا محمد احمد فاروقی تھانوی کا دوسرا مکتوب

عزیزم مولوی مشرف علی سلمہٗ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

پرسوں بھائی میاں کا خط ملا تھا جس میں بھائی جی کی حالت نازک ہو رہی ہے کی اطلاع تھی۔ کل صبح ہی میں نے ایک خط بھائی جی کے نام خیریت معلوم کرنے کا خط لکھ کر ڈلوا دیا تھا خط ابھی سکھر کے ڈاک خانہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ مولوی محمد میاں صاحب کا تار مولانا کی وفات حسرتِ آیات کا پہنچ گیا۔ صبح ۱۰½ سے ۴½ تک اور رات کو ۸ ½ سے ۱۱½ بجے تک ٹیلیفون ملانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ گھنٹی بجتی تھی مگر کوئی بھی فون نہیں اٹھاتا تھا، دوپہر کو اور رات کو دونوں دفعہ مجبور ہو کر کینسل کرا دیا گیا، رات ۱۱½ بجے آپریٹر نے تبلایا کہ لاہور میں بارش ہو رہی ہے، اور لائن خراب ہے، کراچی فون کیا تھا معلوم ہوا کہ عائشہ بیگم اور بچے تو مولانا کی زندگی ہی میں پانچ سات روز پہلے چلے گئے تھے اور منے میاں آج صبح ہوائی جہاز سے گئے ہیں ــــ میں بھی تیار بیٹھا تھا، مگر مشکل یہ ہے کہ سعدی میاں کی والدہ کراچی گئی ہوئی ہیں منی کو تنہا چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ گھر میں کوئی عورت دوسری نہیں ہے جو اس کے پاس رہ سکے، اس لئے مجبور ہو رہا ہوں، تمھاری چچی کراچی سے آجائیں تو پھر انشاء اللہ حاضر ہوں گا۔ مولانا کی وفات حسرتِ آیات کا میرے دماغ پر بھی بہت ہی اثر ہے، پوری رات نیند نہیں آئی، کل بھی دوپہر کو نہیں سو سکا، مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ مجھے حضرت والا سے اس قدر قلبی لگاؤ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائیں اور تم سب کو صبر واستقامت عطا فرمائیں: آمین۔ استاذ العلماء علامہ محمد ادریس کاندھلوی ــ تاریخ وفات نکلی ہے۔
۱۹۷۴ء

میری طرف سے بھابی صاحبہ، عائشہ بیگم، صادقہ بیگم، مولانا محمد مالک صاحب، مولانا محمد نعمان صاحب، مولوی محمد عثمان، مولوی محمد عمران، مولانا محمد میاں صاحب، مولوی احمد صاحب اور سب گھر والوں سے تعزیت فرما دیں۔ گھر پر فقط محمد شاہد، سلمیٰ بیگم، اور منی کی تنہائی کی

کی وجہ سے میں اس وقت مجبوراً نہیں آسکا، پانچ سات روز تک جب بھی موقع ہوگا انشاءاللہ ضرور ضرور حاضر ہوں گا۔ فقط والسلام

محمد احمد

از حضرت مولنٰا محمد احمد تھانوی فاروقی

عزیزم مولوی محمد میاں صدیقی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

کل بھائی صاحب قبلہ مفتی جمیل احمد صاحب کا والا نامہ ملا تھا جس میں بھائی جی کی شدید علالت کی اطلاع بھی اسی وقت سے طبیعت بہت پریشان تھی، رات بھر خیال لگا رہا تین بجے تک نیند بھی نہیں آئی تھی۔ صبح ہی ایک خط بھائی جی کے نام اور ایک مفتی صاحب کے نام لکھ کر ڈاک خانے میں ڈلوائے تھے۔ مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ بھائی جی اس دنیا سے کوچ فرما چکے ہیں۔ ابھی ابھی ۱۰½ بجے تمہارا تار ملا جس میں حضرت کی وفات حسرت آیات کی اطلاع تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ خبر کس قسم کی بجلی بن کر مجھ پر گری اور دل و دماغ کو ماؤف کر گئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت تامہ سے سرفراز فرماکر اعلیٰ مقامات عطا فرمائیں اور ان کے علوم و فیوض کی برکات سے قیامت تک تمام عالم اسلام کو منور رکھے۔ آمین۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ پر جب اس قدر اثر ہو رہا ہے تو تم لوگوں پر کیا بیتی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تم سب کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں اور حضرتؒ کا خلف صدق بنائیں۔ آمین میری طرف سے بھابی صاحبہ، کی خدمت میں اور تمام بہن بھائیوں سے تعزیت فرمادیں۔ دل چاہتا ہے کہ پر لگ جائیں اور میں اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ امجد میاں کو لکھ رہا ہوں وہ ایک دو دن میں اگر آگئے تو انشاءاللہ وہیں حاضر ہو کر تمہارے رنج و غم میں شریک ہوں گا۔ بہر حال اس وقت بھی میری روح تمہارے رنج و غم میں برابر کی شریک ہے اللہ تعالیٰ تم سب کو پورے پورے صبر کی توفیق بخشیں اور ان کے نقش و قدم پر چلائیں۔ آمین

۱۰½ بجے سے ۴½ بجے تک چار یا پانچ مرتبہ فون ملانے کی کوشش کی مگر مدرسہ میں کسی نے نہیں اٹھایا۔ اب انشاءاللہ رات کو پھر کوشش کروں گا۔ فقط والسلام

محمد احمد تھانوی

جناب محمد نعمان صاحب راشد منیجر اوقاف دربار حضرت غوث بہاء الدین زکریا
۱۰ جولائی ۱۹۷۴ء قدس اللہ سرہٗ ، ملتان شہر

برادر محترم جناب حضرت مولانا صاحب زید مجدہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ۔ مزاجِ گرامی ۔

آپ کے والد بزرگوار والا منقبت فضیلۃ المشائخ استاذ العلماء کی وفات حسرت آیات کی خبر سُن کر دلی صدمہ ہوا ہے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ اللہ جل شانہٗ حضرت مولانا صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ کو اپنے جوارِ رحمت میں مقام بلند عطا فرمائیں اور صاحبان کو صبر جمیل اور اجرِ جزیل بخشے اور حضرت مرحوم کا قابلِ وصف جانشین بنائے ۔ ما روحٌ و ریحان و جنّۃ النعیم ؕ

حضرت مولانا صاحبؒ ایک جیّد عالم دین ۔ مشفق استاد اور صاحب علم و عرفان بزرگ تھے ان کی ذات والا برکات مجموعہ محامد و محاسن تھی ۔ آپ کے وجود باوجود سے لاکھوں تشنگان کو فیض پہنچ رہا تھا اور برکات روحانی سے مستفید ہو رہے تھے ، ہر متنفس اس شاہراہ زندگی سے گزرنا ہے ۔ یہ دنیا اپنے تمام اسباب سمیت منافی ہے ۔ کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہہ ذوالجلال والاکرام ؕ

میری دعا ہے کہ رب متعال حضرت مرحوم کو اعلیٰ علّیین میں مقام بلند عطا فرمائے ۔ اور آپ صاحبان کو ان کے خصائل و فضائل کا وارث بنائے اور اس علمی خاندان کا چراغ علم و عرفان ہمیشہ ہمیشہ روشن رہے ۔ آمین ثم آمین ۔

جی چاہتا ہے کہ لاہور خود حاضر ہو کر آپ کے شریک غم ہوؤں ۔ مگر پچھلے دنوں نشتر ہسپتال میں ایک بڑا آپریشن کرایا ہے جس کی وجہ سے معذور ہوں ، خدا نے چاہا تو بشرط زندگی ضرور حاضر ہوں گا ۔
میری ایک بار پھر دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم و مغفور کو جنّت الفردوس عطا فرمائے اور آپ صاحبان کو باہمی اخلاص و محبت مرحمت فرمائے ۔ آمین ۔ اور اپنے والد بزرگوار رحمۃ اللہ علیہ

کے نیاز مندوں پر ان کی طرح نظر شفقت فرماتے رہیں۔ محترم جناب برادر بزرگ حضرت مولانا صاحب وجملہ بھائی صاحبان ودیگر متوسلین کرام کی خدمت میں میری طرف سے اظہار تعزیت فرمائیں اور نیاز عرض کریں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد فرمائیں۔ والسلام مع الاکرام

پشاور۔ مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۷۴ء محمد نعمان راشد بھاولپوری

برادرم عزیز جناب حافظ محمد عثمان صاحب

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ۔ کل ریڈیو پر جناب حافظ محمد ادریس صاحب کی وفات ناگہانی کا سن کر از حد رنج ہوا جو بیان نہیں کر سکتا۔ آنحضرت کا میرے ساتھ خصوصاً اور میرے سب گھر والوں کے ساتھ جو مشفقانہ برتاؤ بہت عرصے سے رہا ہے وہ اب کہاں سے میسر ہوگا۔ اسی لئے ہم سب آپ کے اس رنج ودکھ میں شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے آنحضرت کی مغفرت فرما دیں اور آپ سب کو صبر عطا فرما دیں اور بخیر وعافیت رکھیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

آپ کا دعاگو

۲۹۔سی سرکلر روڈ، یونیورسٹی ٹاؤن سلطان محمود خاں

مظاہر العلوم سہارنپور، یو۔پی

اور ہندوستان کے بعض دوسرے مشہور مدارس سے تعزیتی پیغامات موصول ہوئے ہیں۔

جامعہ مدنیہ لاہور دارالعلوم اسلامیہ پرانی انارکلی لاہور

دارالعلوم دینیہ۔ ۱۱۹ ملتان روڈ لاہور جامعہ رحمانیہ شاہدرہ ٹاؤن

مدرسہ شاہ ولی اللہ صدیقی نگر ٹاؤن شپ روڈ لاہور اور بے شمار دوسرے عربی دینی مدرسوں حضرت کاندھلوی کے لئے تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے اور ایصال ثواب کیا گیا۔

مولانا سیّد محمد ایوب خاں بنوری

(شیخ الحدیث دارالعلوم سرحد، پشاور)

حضرت کاندھلوی کی وفات حسرت آیات پر سخت صدمہ پہنچا۔ اور آج پورا ملک اس عظیم صدمہ میں برابر کا شریک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت العالِم موت العالَم، اسی جیسے سانحہ کے لئے کہا گیا ہے۔"

۲ / اگست ۱۹۷۴ء

مولانا محمد ذاکر، رکن قومی اسمبلی پاکستان

(صدر جامعہ محمّدی جھنگ)

"حضرت مولانا محمد ادریس صاحب مرحوم و مغفور کی وفات حسرت آیات سے دلی صدمہ ہوا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ہمارے عظیم البرکت، فقید المثال استاد اعظم (سیّد انور شاہ کشمیریؒ) کے اجلّہ تلامذہ میں سے تھے۔ پاکستان میں ان کا وجود مسعود بے حد غنیمت تھا۔ مرحوم کے انتقال سے مسلمانان پاکستان کو بالعموم، اور جامعہ اشرفیہ کو بالخصوص ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔"

(۳۰/ جولائی ۱۹۷۴ء)

مولانا غلام غوث ہزاروی

(صدر جمعیۃ علمائے اسلام، پاکستان)

"ہمارا زمانہ، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بہت دُور ہو گیا اس لئے وہ برکات، اور وہ سعادت جو قربِ زمانۂ نبوّت سے حاصل ہو سکتی ہے، اس کی اُمید رکھنا ہی غلط ہے۔ لیکن پھر بھی امت میں کیا شریعت، اور کیا طریقت، دونوں کے بڑے بڑے ماہر عالم، اور باخدا بزرگ پیدا ہوئے۔ چار طرق نے تو بڑی شہرت حاصل کی اور دنیا کے ہر حصّے میں ان کا چرچا ہے۔ دینِ اسلام کو علمائے شریعت نے غالب رکھا، اور اس کے چرچے سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہونے دیا۔

مگر ہمارے زمانے میں، خاص کر اس سال میں اللہ والوں کی بہت بڑی کمی ہوئی۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا حضرت مولانا ادریس کاندھلوی فوت ہو گئے۔ یہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ کے شاگردِ خاص تھے۔

میرے ساتھ حسامی، اور مختصر المعانی میں شریک تھے، جو مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے مرحوم و مغفور مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب پڑھاتے تھے۔ مولانا موصوف کی وفات سے طبقۂ علماء میں بڑی کمی ہوئی ہے اور اب تک ان کی جگہ پُر نہیں ہو سکی اور شاید پُر نہ ہو سکے۔"[1]

---

(۱) ہفت روزہ الجمعیۃ راولپنڈی، ۴ اپریل ۱۹۷۵ء - ص: ۱۱

پروفیسر عبد الرشید شیخ ــــــ پروفیسر عربی جامعہ عباسیہ بہاولپور

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

محترمی ومکرمی جناب بھائی نعمان صاحب! السّلام علیکم ورحمتہ اللہ

مزاج گرامی! اتوار کے دن ایک بجے والی ریڈیو خبر کے ذریعے حضرت مولانا مرحوم کی وفات حسرت آیات کی خبر سُن کر بیحد صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پروردگار عالم مرحوم ومغفور جنت الفردوس عطا فرمائے اور آپ کی قبر پر تاابد رحمت اور آمرزش کے پھول برستے رہیں۔ آمین ثم آمین۔ نیز آپ تمام پس ماندگان کو اس صدمہ جانکاہ میں صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ گزشتہ ماہ ۲۸ جون ۷۴ء کو میں بعض دفتری کام کے سلسلہ میں لاہور گیا تھا۔ شدید گرمی تھی اور دفتر کا لایعنی چکر۔ مرحوم کو چونکہ اسلامی کونسل کی ممبری کا شرف عطا ہوا تھا۔ اس لئے یہ پروگرام بنایا تھا کہ اتوار کے دن دفاتر کا چکر نہ ہو گا۔ اس لئے کوٹ لکھپت (ڈبل پھاٹک) سے صبح سویرے نکل کر مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر بذاتِ خود سلام ونیاز کے بعد مبارکباد پیش کروں گا، آپ حضرات بھی سویرے سویرے ضرور ملاقات ہو جائے گی۔ مگر بدقسمتی سے ۲۹ جون ہی کو موٹر سائیکل سے ٹکر ہو گئی، پیشانی پر زخم آگیا، گھٹنوں وغیرہ میں شام تک شدید درد ہو گیا۔ گرمی بلا کی تھی سارا پروگرام اَدھورا چھوڑ کر۔ اتوار آنے سے پہلے ہی گھبرا کر میں بہاولپور واپس آگیا۔

اللہ اکبر، کیا معلوم تھا کہ مولانا اتنا جلد اس دارِ فانی کو خیر باد کہنے والے ہیں۔ آہ...موتُ العَالِمِ مَوْتُ العَالَمِ ظہور بھائی وغیرہ اور بہاولپور کے واقف حضرات بھی یہی پیغامِ تعزیت پیش کر رہے ہیں۔

مولانا مرحوم کی پہلے علالت کی کوئی خبر چونکہ ہم لوگوں کو معلوم نہ تھی، پھر اچانک رحلت فرما جانا۔ بیحد تشویش لاحق ہے۔ اگر صبر وسکون کے بعد کبھی آپ ایک کارڈ کے ذریعے مختصر سے حالات سے نوازیں تو ہم لوگ بیحد ممنون ہوں گے۔ فقط والسّلام مع الاحترام

نیازکیش عبد الرشید شیخ

مولینا مفتی نذیر حسین صاحب مظفر آبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت مولانا محمد امالک صاحب و برادر عزیز مولوی محمد میاں صاحب زید مجدکم

السلام علیکم

ابھی ابھی حضرت مخدوم العلماء راس الاتقیاء استاذی المحترم جناب والائے والد المحترم کے انتقال کی خبر نے محو حیرت و اضطراب میں ڈال دیا۔ یا اللہ یہ کیا ہوگیا کہ علم و عمل کا مجسمہ آفتاب غروب ہوگیا۔ اب چند افراد و اشخاص نہیں بلکہ روحانی و علمی طور سے پورا برصغیر یتیم ہوگیا۔

قرنہا باید کہ تا یک مرد حق بیدار شود   بوسعید اندر قراساں یا اویس اندر دن

جناب والا! مجھ پر اس محشر بپا المناک حادثہ کا جس ناقابل برداشت کیفیت کے ساتھ غیر محیط اور شدید تر اثر پڑا ہے، آسے میں جانوں یا میرے دل و دماغ۔

ما جرائے دل نمی گویم بہ کس   آب چشم ترجمانی می کند

اس وقت یقیناً آپ سب قیامت کی سی ہولناک درد مند اور وحشت اثر قابل رحم کیفیات میں گھرے ہوئے ہوں گے، اس لئے میں مزید اپنے آتش اضطراب سے آپ کے اوقات ناخوش کو ابتر نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا اپنے متعلق اتنا عرض کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔

شمع پہ گزری ہے جو شب تا سحر   مختصر سی ہے ہماری داستان

اُس قدسی و ملکی بزرگ ترین ہستی منبع العلوم والفیوض کا صرف ایک شعر سے تعارف کراتا ہوں۔

روح قدسی سجدہ آرد پیش اں روئے جمال
گر نقاب آب و خاک از روئے حضرت در کشم

عزیزم قاری غلام ربانی صاحب برابر اس رنج و غم میں آپ کے شریک ہیں

نذیر حسین

شیخ الحدیث مولانا ادریس کاندھلوی انتقال کر گئے

إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

نماز جنازہ میں علمار کرام ممتاز سیاسی رہنما اور ہزاروں افراد شریک ہوئے

مولانا کوثر نیازی اور دوسرے رہنماؤں کی طرف سے اظہار تعزیت

لاہور ۲۸ر جولائی (سٹاف رپورٹر سے) بلند پایہ عالم دین اسلامی مشاورتی کونسل کے رکن شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ آج صبح لاہور میں طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے إنا للہ وإنا الیہ راجعون، ان کی نماز جنازہ جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ میں ادا کی گئی جس میں علمار کرام اور ہزاروں دوسرے افراد شریک ہوئے۔

قیام پاکستان سے قبل بھی ان کے نام کا بڑا شہرا تھا، اور اسلام کی تبلیغ کے لئے انھوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور ہزاروں افراد کو مشرف بہ اسلام کیا۔ قیام پاکستان تک اور دار العلوم دیوبند میں شیخ التفسیر رہے۔ اس کے بعد آپ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے اور یہاں آکر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وفات تک آپ جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث رہے آپ کے ہزاروں شاگرد اس وقت پورے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں، انھوں نے اسلام کے بارے میں متعدد کتابیں تحریر کی ہیں جو علم و ہدایت کا ایک خزانہ شمار ہوتی رہیں گی۔ لاہور کے دینی حلقوں اور ہر مکتب فکر کے لوگوں نے ان کی موت کو ایک سانحہ قرار دیا ہے اور اس بزرگ کی شخصیت کی موت کو ایک صدمہ قرار دیا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ مولانا کی عمر ۸۰ سال تھی اور وہ ایک سال سے گردے کی تکلیف میں مبتلا تھے۔

مولانا کوثر نیازی کا پیغام تعزیت

اطلاعات و نشریات اور اوقاف درج کے وفاقی وزیر مولانا کوثر نیازی نے مولانا ادریس کاندھلوی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرحوم ایک باعمل عالم دین اور مرد درویش تھے اور ان کی وفات سے ہم سلف صالحین کی ایک نشانی سے محروم ہو گئے

ہیں، مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ مولانا ادریس کی وفات سے میرا ذاتی نقصان بھی ہوا ہے، کیونکہ میں نے ان سے کسب فیض بھی کیا ہے۔ مولانا ادریس میرے ذاتی اصرار پر اسلامی نظریاتی کونسل میں شامل ہوئے تھے تاہم وہ خود اس کے حق میں نہ تھے، کونسل میں ان کی شمولیت سے اس امید کو تقویت ملی تھی کہ ملکی قوانین کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ بنانے کے لئے قومی امنگیں پوری ہو جائیں گی۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا، مولانا ادریس اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا کوثر نیازی نے مرحوم کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا اور مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے دعا کی۔ (امروز ۳۰ جولائی ۱۹۷۴ء)

ممتاز عالم دین مولانا محمد ادریس کاندھلوی وفات پا گئے

نماز جنازہ ہزاروں عقیدت مند شریک ہوئے

لاہور ۲۸ جولائی۔ برصغیر کے ممتاز عالم دین شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی طویل علالت کے بعد آج صبح جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انھیں ایک عرصے سے گردے کی تکلیف تھی جو آخر کار جان لیوا ثابت ہوئی۔ ان کی عمر ۸۷ سال بتائی گئی ہے۔

مولانا ادریس کاندھلوی کے انتقال کی خبر سنتے ہی ہزاروں افراد ان کا آخری دیدار کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ ان کے جنازہ کو کاندھا دینے کے خواہشمندوں کے بے پناہ ہجوم کے پیش نظر جنازے کے ساتھ بانس باندھ دیئے گئے۔ نماز جنازہ جامعہ اشرفیہ میں پڑھائی گئی جس میں صوبائی دارالحکومت کے علماء اور معتقدین کے علاوہ دوسرے شہروں کے بعض لوگ بھی شریک ہوئے۔ مولانا کو قبرستان شادمان بانیٔ مشرق عنایت اللہ مرحوم کی قبر کے قریب سپرد خاک کر دیا گیا۔

مولانا ادریس کاندھلوی کا شمار برصغیر پاک و ہند کے سرکردہ علماء میں ہوتا تھا ان کا

تعلق دیوبند مکتبِ فکر سے تھا، قیام پاکستان سے قبل وہ دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر مقرر تھے، پاکستان میں تادمِ آخر جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث اور اسلامی مشاورتی کونسل کے رکن تھے۔ مولانا مرحوم نے فقہ اور دیگر دینی مسائل پر بے شمار کتابیں اور رسالے تصنیف کئے ان سے دینی فیض حاصل کرنے والے افراد کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور ان کے شاگرد برصغیر کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد اور اسلامی جمعیت طلبہ کے قائم مقام ناظم اعلیٰ مظہر حسین نے اپنے بیانات میں مولانا ادریس کاندھلوی کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور مرحوم کی دینی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کے رہنماؤں مولانا عبداللہ درخواستی مولانا مفتی محمود، مولانا عبیداللہ انور اور سید نیاز احمد گیلانی نے ایک مشترکہ بیان میں مولانا محمد ادریس کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے، انھوں نے اپنے بیان میں کہا کہ مولانا ایک مسلّم استاد اور عظیم محدث تھے جن کی وفات سے علمی دنیا میں زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔ انھوں نے دعا کی اللہ رب العزت مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اہل خاندان اور متوسلین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے جماعت اسلامی لاہور کے کارکنوں کے ایک اجتماع میں ایک قرارداد کے ذریعے حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی شیخ الحدیث کی وفات کو پوری ملت کا نقصانِ عظیم قرار دیا۔ (مشرق ۲۹ جولائی ۱۹۷۴ء)

ملتِ اسلامی ایک عالمِ باعمل اور مرد درویش سے محروم ہو گئی

مولانا کوثر نیازی کا خراجِ عقیدت

راولپنڈی ۲۸ جولائی۔ پاکستان کے ممتاز عالم اور اسلامی کونسل کے رکن مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی وفات پر وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات اوقاف وحج مولانا کوثر نیازی نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے آج ایک تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ مرحوم صحیح معنوں میں

ایک عالم باعمل اور مرد درویش تھے اور ان وفات سے سلف صالحین کی ایک نشانی ہم سے رخصت ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ میرے لیے یہ ایک ذاتی غم بھی ہے، کیونکہ میں نے قیام لاہور کے دوران مولانا مرحوم سے دینی تعلیم میں کافی عرصے تک کسب فیض کیا ہے اور میرے ہی اصرار پر انھوں نے حال ہی میں اپنی خواہش کے برعکس اسلامی مشاورتی کونسل کی ممبری قبول فرمائی تھی۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سکریٹری دائرۂ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی

" عالِم کی موت ایک عالَم کی موت ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف جیّد عالِم، صاحبِ نظر تھے بلکہ تقویٰ و صدق میں بھی بے عدیل تھے،

اس قحط الرجال میں ایسے اہلِ علم و فضل کی جگہ کون لے سکتا ہے۔ ؟ کون ان کی طرح تشنہ کامانِ علم کی تشنگی دُور کر سکے گا۔ اور کون ان کی طرح حق گوئی اور زہد و تقویٰ کی مثال پیش کر سکے گا۔ ؟

ان کے جانے سے بساطِ علم و فضل اُلٹ گئی، ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔ اب اس محرومی کا مداوا نہ ہو سکے گا۔ ایسے عظیم انسان مرا نہیں کرتے۔ کتاب اور دل کی لوحِ محفوظ میں، اور تاریخ میں ان کا نام تابندہ و درخشندہ رہتا ہے "

(۶ اگست ۱۹۷۴ء)

منظوم خراجِ عقیدت

(۱) ۔ تبّا لدنیا لا یدوم نعیمھا   وجمیع ما فیھا الدنیا فانٍ

دنیا کے لئے بربادی مقدر ہے اسکی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی نہیں ہیں اور جو کچھ دنیا میں ہمارے پاس ہے فنا ہونے والا ہے۔

(۲) ۔ ادرس لا تبعو فذکرک خالدٌ   والذکر للانسان عمرٌ ثانٍ

اور ذکر خیر انسان کے لئے دوسری زندگی ہے

(۳) ۔ قد کنت ارجو ان تکون خلیفۃ   لدارستہ الآثار والقرآن

میں آپ کے متعلق توقع کرتا تھا کہ آپ میرے خلیفہ نائب ہوں گے حدیث شریف اور قرآن مجید کی تدریس کے لئے

(۴) ۔ لکن رحلت الی الجنان بسرعۃ   وترکت اھلک فی البکا لزمانٍ

لیکن آپ جلدی سے جنت الفردوس کی طرف چلے گئے اور اپنے اہل وعیال کو روتا ہوا چھوڑا ایک زمانے تک۔

(۵) ۔ قد کنت بحرا فی العلوم باسرھا   ولانت حقاً عالمٌ ربّانٍ

آپ تمام علوم کے دریا تھے اور حقیقت میں عالم ربّانی تھے۔

(۶) ۔ قد کنت بدرا للغیاھب صاحبا   قد کنت نجما راجم الشیطانٍ

اور آپ چودھویں کے چاند تھے   اور آپ آسمانی ستارہ تھے جس کے ذریعہ شیطان کو مارا جاتا ہے۔

(۷) ۔ قد کنت من اھل الصلاح نعم ومن   اھل التقیٰ فی السر والاعلانٍ

اور آپ اہلِ صلاح وفلاح میں سے تھے ، ہاں آپ اہلِ تقویٰ تھے پوشیدہ اور ظاہری احوال میں

(۸) ۔ فاللہ یورثک الجنان برحمۃٍ   وکرامۃٍ بالعفو والغفرانٍ

اللہ تعالیٰ آپ کو وارث فرمائے گا جنّت الفردوس کا اپنی رحمت سے اور کرم سے اور صفت عفو و معافی، اور بخشش کی وجہ سے۔

(۹)۔ فتکون وارث جنة الفردوس یوم الجزاء بالرّوح والریحان

آپ جنّت الفردوس کے وارث ہوں گے قیامت کے اندر۔

(۱۰) ثم الصلوٰة علی النبی المصطفٰی

پھر درود ہو حضرت پر جو النبی اور پسندیدہ ہیں

خیر الخلائق من بنی عدنان

تمام مخلوق میں سب سے بہتر ہیں اور بنی عدنان سے ہیں

جریح الفواد ظفر احمد عثمانی

۳۰ جولائی ۱۹۷۴ء

حضرت استاذ المحدثین والمفسرین مولینا ظفر احمد عثمانی قدس اللہ سرہ نے اپنے شاگرد رشید کا مرثیہ لکھا اور پھر اس جدائی کے صدمہ کو زیادہ دیر برداشت نہ فرما سکے۔ صرف چند ماہ بعد ۱۹۷۴ء واصل باللہ ہو گئے۔ نور اللہ مرقدہ و قدس اللہ سرہ ومتعنا بعلومہ وفیوضہ۔ ترجمہ حکیم مولوی انیس احمد صدیقی نے کیا ہے۔

بر وفات حسرت آیات

حضرت مولانا محمد ادریس

چید عزرائیل از عالم بچشم انتخاب — جوہر دانائے دوراں رشک شمس و ماہتاب

شد یقیں از رفتنت کیں عالم ہستی سراب — نیست در وے از حقیقت انچہ بدر رویا و خواب

حیف آں فرقت کہ از تقدیر بر ما او فتاد — وائے آں رحلت کہ تو خنداں پذیرفتی شتاب

اے مجسم سیرت اسلاف پاکیزہ صفات — پیکر قرآں و سنّت مرجع خلق و مآب

ترجمان علم انورشہ، زبانِ تھانوی
فکرِ شیخ الہند داری رنگِ شبّیری خطاب

زینت دارالعلوم وفخر درس جامعہ
مخزن علم نبوّت مرجع ہر شیخ وشاب

توکہ رفتی عاشقاں را جملہ بسمل ساختی
از چرا کردی زماں ایں روئے زیبا در حجاب

اے کہ ما بگذاشتہ تنہا بمنزل رفتۂ
سخت بے مہری کہ کردی مجلس ما را خراب

شد یتیم از رحلتت گہوارۂ علم حدیث
اشکبار از فرقتت ہر گوشۂ درس خطاب

شد بہمراہ تو رخصت درس علم وآگہی
از پس تو اے گل رعنا گلستاں شد خراب

کیست آں کو عقدہ ہائے علم ودانش حل کند
کیست آں مردے کہ دارد ہر سوالے را جواب

کیست آں شخصے کہ دارد شفقتے بے انتہا
کیست آں مشفق کند وابستگاں را احتساب

کیست آں ہر لحظہ اش در فکر تفسیر وحدیث
کیست آں مرد کہ باشد زندہ از فکر کتاب

کیست آں شیخے کہ پیدا در دلش شد فکر ما
کیست آنش کو خورد از بہر عالم پیچ وتاب

کیست آں ہمدم کہ از شفقت شنید احوال ما
کیست آں غمخوار بشمارد خطائے ما صواب

کیست آں ناصح کہ باشد کاملاں محتاج او
کیست آں ہادی سبیلش بُد سبیل من اناب

کیست آں شمع کز و عالم منوّر کردہ شد
کیست آں بحرے کز و شد اہل عالم فیضیاب

ہیچ اشکالے کہ آمد پیش تو آساں نشود
شد بروئے تو منظر کردہ سوالے خود جواب

کارہا پنداشتم مشکل بتو مشکل نبود
چونکہ در پیرانہ سالی داشتی عزم شباب

از برائے مغفرت گوید دل ہر مستفیض
رحمتِ حق بر مزار تو ببارد بے حساب

وائے عارف بُود ہنگام سحر عالم خراب
رفت آں مہتاب دیں قبل[*] طلوع آفتاب

۶۸۰ ۵۱ ۴۴۸ ۶۴ ۱۳۲ ۱۱۵ ۴۸۴

۱۹۷۴ء

جریح الفؤاد
مشرف علی تھانوی عارف
مدرس جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن، لاہور

---

[*] طلوع آفتاب سے صرف ۵ منٹ قبل

مرثیہ:

از قلم حضرت مولینا محمد یوسف صاحب بنوری دامت برکاتہم، کراچی

ماذا ارهتطبه الالام والكرب ماذا الذی منه دمع العین منسلب

کیا بات ہے کہ جس کی وجہ بے چینی اور درد پھیلا ہوا ہے کیا چیز ہے کہ آنکھ کے آنسو بہے چلے جارہے ہیں۔

ماذا اتانا به التلفون من خبر یکاد یخسف منه الشمس والشهب

ٹیلیفون نے وہ ہم کو کیا خبر دی ہے کہ جس کے غم سورج اور ستارے گرھن ہو رہے ہیں۔

یاناعیا عالم الدنیا محدثها اصبر عزاء فقد ابکانی المصب

اے دنیا کے عالم اور محدث کی وفات کی خبر دینے والے۔ صبر جمیل کر کیونکہ مجھے تو مصیبت نے رلا دیا ہے۔

لهفی علیك جمال العلم زینة تفضیت نحیا فنحن الیوم ننتحب

ہائے افسوس تجھ پر اے علم کے جمال اور اس کی زینت تو نے وفات پائی اس لئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں۔

تبکیك جامعة نقد الکبیر بها سرزء جلیل فما فی العیس مرتقب

جامعہ اشرفیہ آج تجھے رو رہا ہے کیونکہ اُنہوں نے بڑے عالم کو گم کر دیا ہے۔ بڑی مصیبت ہے آج کسی جوان کا انتظار نہیں ہے۔

من للمدارس والتدریس بعدك بل من للمحاریب فی الاسحار منتدب

مدارس اور تدریس کے لئے آپ کے بعد اب کون ہے بلکہ صبح کے وقت محراب میں عبادت گزار کون ہے۔

من العلوم علوم الدین ینشرھا　　من بعد علیک ھذا الحادث الکتب

اب کون علوم دین کو پھیلائے گا۔ ترے انتقال کے بعد اور اس بڑی مصیبت کے بعد۔

طوبیٰ لقبرک ما ذا ضم من کرم　　ومن علوم ومن زھد ھو العجب

مبارک ہے تری قبر کہ اس میں کرامت و بزرگی، مل گئی اور علوم اور زہد و تقویٰ مل گیا۔
یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔

یلقاک روح وریحات ومغفرۃ　　ھذا النعیم الذی ینسی بہ التعب

تجھ سے خوشی ملے، اور خوشبوؤں اور مغفرت خداوندی یہ وہ نعمت ہے جس سے تھکن دور ہو جاتی ہے

صبرا اولی العلم فالدنیا حقیقتھا　　عند الالہ تعالیٰ اللھو واللعب

اے اہل علم صبر کرو کیونکہ دنیا کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک کھیل کود ہے۔

ثم السلام علی ادریس ان لہ　　فضلا کبیرا رثا لا العلم والادب

پھر خدا کی طرف سے سلامتی ہو ادریس پر کہ وہ بڑی فضیلت کے مالک نہیں اور علم وادب اس کے مرثیہ خواں ہیں۔

واجعلہ فی جنت الفردوس مسکنہ　　یاربنا غیثلک المدرار مرتقب

اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اے ہمارے پروردگار ہم آپ کی طرف سے رحمت کی موصلا دھار بارش کے منتظر ہیں۔

ثم الصلوٰۃ علی خیر الوریٰ ابداً　　مادامت الورق والکتان ینتعب

اور رحمتِ کاملہ نازل فرما ہمیشہ ہمیشہ خیر الوریٰ پر جب اس باغِ عالم میں درختوں کے پتے اور بلبلیں رو رہی ہیں۔

مرثیہ از:-

حضرت مولینا مفتی جمیل احمد صاحب دامت برکاتہم لاہور

انما الانسان فی تخلیقہ بالعالم　　فی بلاء الحسن من اعمالہ والمائم

بے شک انسان دنیا میں امتحان کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں، اس کے اعمال میں حسن ہے یا گناہ ہے۔

خیراوشرفان خیراتولی فنجا　　ان اتی شرا فلا واللہ دھرا ندیم

نیک ہے یا بد اگر نیکی اختیار کرتا ہے تو نجات پاتا ہے، اگر برائی کرتا ہے تو خدا کی قسم ہمیشہ ندامت میں رہتا ہے۔

لکن الاسلام ھذا المخلص فیہ الذی　　فی علوم الدین والاعمال وفق الصدم

لیکن یہ اسلام اس میں خلوص والا ہے جو دین کے علوم اور اعمال میں وحی کے مطابق ہے۔

کان من خدام خدام النبی المصطفیٰ　　بارع الاحبار للاثنین من رسل سمی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاموں کے خادم تھے بڑے علماء میں امتیازی حیثیت رکھنے والے رسولوں کے ہم نام تھے۔

علم الابدان ابتداء ادریسؑ من وحی لہ　　علم الادیان انتہی وحی النبی الخاتم

علم ابدان (طب) کی ابتدا حضرت ادریسؑ نے اپنی وحی سے کی اور علم دین نبی خاتم پر ختم ہو گئے۔

فاضل علامۃ شیخ الحدیث المجتبیٰ　　شیخ تفسیر الکلام المعجز المستحکم

بڑی فضیلت بڑے علم والے حدیث نبوی کے شیخ درس یعنی شیخ الحدیث اور کلام اللہ جو اعجاز اور استحکام والا ہے اس کے شیخ درس یعنی شیخ التفسیر تھے۔

شارح المشکوٰۃ تعلیق صبیح فیضہ　　عم فیضا نا بہ معنی الحدیث الاکرم

مشکوٰۃ شریف کی شرح تعلیق صبیح سے آپ کا فیض عام ہے، حدیث کے معنیٰ و مفہوم کے لئے آپ کی شرح اس کے فیض کا سبب بن گئی۔

للبخاری الصحیح الشرح ابدا مجبا نخبۃ الافکار والابکار للمتعلم

صحیح بخاری شریف کے لئے آپ کی شرح عجیب وغریب منصہ شہود پر لائے ہیں۔ طالب علم کیلئے منتخب آراء اور اچھوتے حقائق واسرار کا ذخیرہ ہے۔

رجح الاحناف فی تحقیق معنی فیھم حیث لایاتیہ اشکال لزعم الزاعم

ان کتابوں میں احادیث کی تفہیم اس طرح کی ہے کہ حنفی مسلک کی ترجیح نمایاں ہو اور کوئی کسی قسم کا اشکال نہ رہے۔

واحد اثبات تاریخ الرسول المجتبیٰ سیرۃ للمصطفیٰ وصف النبی الخاتم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کتاب میں نیچریوں کا رد کیا ہے اور صحیح خدوخال اور احوال بیان کیا ہے۔

جامع تفسیرہ حقائق نکات نادرہ لایضاھیہ التفاسیر التی فی الاعجم

آپ کی تفسیر جامع ہے ایسے چیدہ چیدہ نکات پر اور اسرار ومعارف پر کہ عجمی تفسیروں میں اسکی مثال نہیں ہے۔

سابع الاجزاء للقرآن فی احکامہ مستدلا منہ فی فقہ الامام الاعظم

احکام القرآن جو امام اعظم نعمان بن ثابت ابو حنیفہ کے دلائل پر مشتمل ہے اس کی ساتویں جلد آپ نے تالیف کی ہے۔

فی مائۃ من تالیف الرسائل فیضہ نظما ونثرا بالعربی ادبالاعجمی

سینکڑوں رسائل میں آپ کے مضامین کا فیض جاری ہے، منظوم کلام ہے، نثر میں بھی ہے، عربی اور غیر عربی میں بھی ہے۔

عسقلانی وعینی وقاری وسرا نری عصر بل غزالی لسرمبہم

آپ کا مرتبہ علوم دین میں حافظ ابن حجر عسقلانی علامہ بدرالدین عینی اور ملا علی قاری صدیقی اور امام رازی کی مانند ہے۔ بلکہ اسرار ومعارف میں امام غزالی کی طرح ہیں۔

بوعلی فی علوم العقل ادتفهیمها   نجم الکبری لزیغ مثل عصب صارم

عقلی علوم اور ان کو سمجھانے میں بو علی سینا نجم الدین کبریٰ ہیں۔ باطل کو کاٹنے کے لئے دھار دار تلوار کی مانند ہیں۔

درسه درس لشیخ الهند اواصحابه   مثل انور شاه الاستاذ الجلیل الاکرم

ان کا درس شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے تلامذہ مثلاً مولانا سید محمد انور شاہ ماہر استاذ عظیم الشان اور مکرم کے درس کی طرح تھے۔

ثم فی علم الکلام اختار فی استدلاله   ما اتی تلمیحة تلمیح ذوق القاسم

پھر علم کلام میں جو کتاب تالیف کی ہے اس میں دلائل اس طرح لائے ہیں جن سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم کی جھلک آتی ہے۔

کان للتدریس فی دار العلوم بدیوبند   فی بهاولپور او لاهور اسنی عالم

آپ دارالعلوم میں درس دیتے تھے، بہاولپور اور لاہور جامعہ اشرفیہ کے بڑے درجے کے عالم تھے

کان خطّا باکبیرالشان فی تذکیره   بالنکات الباهتات المفحمات المفحم

آپ وعظ بیان کرنے میں وعظ و نصیحت میں بڑی شان والے تھے، ایسے نکتے بیان کرتے تھے جو خاموش کر دینے والوں کو خاموش کر دیتے تھے۔

لیس یخلو مجلس من طرفة علمیة   نطرب الاسماع والافهام من مستفهم

آپ کی کوئی مجلس علمی لطیفہ سے خالی نہ ہوتی تھی جو سننے والوں دریافت کرنے والوں کو طرب میں ڈال دیتی تھی۔

صدع الاذهان بالحق اجتلا فی قلبه   لم یخف فی الله یوما لومة من لائم

آپ کے دل میں جو بات ہوتی تھی اس سے لوگوں کی عقلیں شق کر دیتے تھے ایک دن بھی اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہیں کیا۔

مورد الالطاف من اشرف علی شیخنا   حیث یاتی فی مفاهیم بحق جازم

ہمارے بزرگ مولانا اشرف علی صاحب کی مہربانیوں کے نازل ہونے کے محل تھے ایسی تفہیم پیش کرتے تھے جو یقینی طور پر حق ہوتی تھی۔

اخذ فیض باطنی من خلیل احمد — شیخ بذل الجہد فی حل لحدیث الاعظم

حضرت مولینا خلیل احمد مہاجر مدنی سے باطنی فیض حاصل کیا جو حدیث کی مشکلات حاصل کرنے والے صاحب بذل المجہود فی شرح ابوداؤد ہیں۔

واصل للرحم وصال الی اللہ الغنی — کان فی استغراق قلب ھائم مستلم

رشتے داروں کا حق کرنے والے اور اللہ غنی تک۔ واصل ہمیشہ دل میں حیران اور سر تسلیم خم کے استغراق میں تھے۔

فات من قوم حیاری الھجر بل فی ارخہ — قیل "موت العالم الوصال موت العالم"

۱۶۲-۴۴۶ - ۱۵۸ - ۴۴۶ - ۱۶۲

سنہ ۱۳۹۴ھ

آپ ایسی قوم سے فوت ہو گئے جو آپ کی جدائی سے ششدر رہے، آپ کی تاریخ وفات کے لئے کہا گیا ہے کہ واصل باللہ عالم کی موت ایک جہان کی موت ہے۔

جذب ارباب عمل کا، جوہر علم کلام
اس مکاں کی سقف میں، دیوار میں، در میں ملا
وہ سکوں ضامن ہے جس کی عظمت خیر القرون
ہم نشیں، علامہ ادریس کے گھر میں ملا

(انور صابری)

نتیجۂ فکر حکیم مولوی انیس احمد صدیقی انیس

ذکی الامۃ شہید العلم

تو ذکی ہستی ولی اللہ[عه] را ہمام شد
آں ذکاوت در علوم دیں ترا انعام شد

تو شہیدِ علم قرآں نیز آثار و سنن
زندہ جاوید گردی تو ز فضل ذوالمنن

زندہ جاوید ہستی تو بہ پسران رشید سعید
باکتب ہا و تلمیذاں بفیضانِ مزید

جانشیں شاہ انور بود دارالعلوم
جامعہ را کرد ئی از درسہا بحر العلوم

شیخ[عه] احمد تا ولی اللہ و ہم اشرف علی
علمہائے ایں اکابر را امیں عارف علی

تربت تو در حقیقت سینہ اہل علوم
بدر کامل ماہ تاباں ہست در بزم نجوم

مرثیہ گویم چرا گویم نہ میرد آں جناب
طالباں را می کنی از علم و دانش فیضیاب

انیس ۱۱ رجب ۱۴ رجب

عه حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی — عه میں نے دوبارہ خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت انتقال کے بعد زندہ ہو گئے ہیں اور جامعہ اشرفیہ میں موجود ہیں۔

عه حضرت مجدد الف ثانی

نالۂ دل

سربراہِ عالماں غائب شدے — آہ استاذِ زماں غائب شدے
ملتِ اسلام را رخنہ رسید — سرگروہ فاضلاں غائب شدے
ایں چہ شد اللہ اکبر ایں چہ شد — آہ آں شیخ زماں غائب شدے
عارف اسرار قرآن و حدیث — واعظِ گوہر فشاں غائب شدے
ساقی جام مے زھد و تقیٰ — حضرت قطب زماں غائب شدے
صاحب تفسیر قرآں من لدن — اوستاذِ نکتہ داں غائب شدے
داخل فردوس شد آں ذی قدر — آں رئیس زاہداں غائب شدے
عندلیب بوستاں خاموش ہست — شاعر شیریں بیاں غائب شدے
محی سنت ماحی بدعات بود — صدرِ صدورِ عالماں غائب شدے
نالۂ دل را بہ کس افشا کنم! — مقتدائے عارفاں غائب شدے
طالباں در ورطۂ حیرت[1] بماند — رہنمائے سالکاں غائب شدے
جامع تفسیر فرقاں بے بدل — ساطع نور قرآں غائب شدے

فیض باطن ہست ساری اے خلیل
گرچہ در چشم عیاں غائب شدے

نتیجہ فکر جناب مولینا خلیل الرحمان صاحب
مدرس دارالعلوم ٹنڈو الہ یار سندھ
۱۹ ر رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ ۱۹۷۴ء

---

[1] طالب کا آخری مقام حیرت ہے

مولانا محمد احمد تھانوی

تاریخ وصال

مولانا الحاج مولوی محمد ادریس رح

حضرت مولانا محمد احمد تھانوی مدظلہم نے حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کی وفات کی نہایت عمدہ تواریخ مرتب کی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔ (ادارہ)

(۱)۔ تاریخ ہدیہ عقیدت محمد احمد ۱۹۷۴ء

(۲)۔ استاذ العلماء علامہ محمد ادریس کاندھلوی ۱۹۷۴ء

(۳)۔ مولانا مولوی محمد ادریس صاحب کاندھلوی نمونہ و یادگار سلف بود ۱۳۹۴ھ

(۴)۔ اَلْاِقْتِبَاسَاتُ الْقُرْآنِیَّہ ۱۳۹۴ھ

(۵)۔ وَالسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا لِلْاَبَدِ ۱۹۷۴ء

(۶)۔ لَقَدْ قَالَ اللّٰہُ جَلَّ حُکْمُہٗ وَسَلَامٌ عَلَیْہِ اَبَدًا یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ۱۹۷۴ء

(۷)۔ وَقَالَ اللّٰہُ جَلَّ وَحْیُہٗ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّہُمْ مَّیِّتُوْنَ ۱۳۹۴ھ

(۸)۔ قَالَ اللّٰہُ جَلَّ وَحْیُہٗ وَالسّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ اَبَدًا ۱۳۰۴ھ

(۹)۔ وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ جَلَّ مَجْدُہٗ فَہُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ ۱۹۷۴ء

(۱۰)۔ کَاَنَّہُمْ لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوْ ضُحٰہَا ۱۹۷۴ء

(۱۱)۔ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ اَبَدًا مَا تَقَدَّمَ ۱۹۷۴ء

(۱۲)۔ قَالَ جَلَّ اِسْمُہٗ لَقّٰہُمْ نَضْرَۃً وَّسُرُوْرًا ۱۹۷۴ء

(۱۳)۔ لَقَالَ اللّٰہُ جَلَّ عِلْمُہٗ وَکَلَامُہٗ وَجَزٰہُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّۃً وَّحَرِیْرًا ۱۳۹۴ھ

(۱۴)۔ وَقَالَ جَلَّ وَحْیُہٗ اِنَّ ہٰذَا کَانَ لَکُمْ جَزَآءً وَّکَانَ سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا ۱۹۷۴ء

(۱۵)۔ وَاُولٰئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ (دَائِمَۃٌ) ۱۳۹۴ھ

(۱۶)۔ وَاجْعَلْہُ رَبِّ رَضِیًّا لَکَ اَبَدًا اَبَدًا ہ ۱۳۹۴ھ

(۱۷)۔ ھُوَکَانَ تَقِیًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَیْہِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ۱۳۹۴ھ

(۱۸)۔ قَالَ اللّٰہُ جَلَّ جَلَالُہٗ لَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۱۹۷۴ء

(۱۹)۔ قَالَ جَلَّ اِسْمُہٗ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ ۱۳۹۴ھ

(۲۰)۔ اَزْ نَتِیْجَۂ فِکْرِ مُحَمَّدْ اَحْمَدْ تھانوی ۱۳۹۴ھ

تاریخ وصال

آٹھویں صبح رجب کو ہو گئے بے پا و سر

درس و ادب فیض و نظر شرف و ظفر

۲۰۰ - ۴ - ۱۰ - ۹۰۰ - ۲۰۰ - ۹۰

۱۳۹۴ھ (انیس احمد صدیقی انیس)

دیگر قطعہ

رجب آٹھویں شیخ رخصت ہوا

عاقبت خیر ہو سال رحلت ہوا

۱۳۹۴ھ (انیس)

اہلِ صحافت کا خراجِ تحسین

روزنامہ نوائے وقت لاہور

مولانا مرحوم کا شمار برصغیر کے سرکردہ علماء میں ہوتا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل وہ دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر مقرر تھے، پاکستان بننے کے بعد وہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور وہاں درس و تدریس بھی دیتے تھے، پھر جامعہ اشرفیہ لاہور میں یہ سلسلہ جاری رہا، وہ اسلامی مشاورتی کونسل کے رکن بھی تھے، انھیں دینی حلقوں میں ایک مسلّم استاذ اور عظیم محدّث مانا جاتا تھا۔

واقعی وہ ایک باعمل عالم اور مرد درویش تھے۔ انھوں نے اسلام کی خدمت اور تبلیغ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ اپنی ستر سالہ زندگی میں انھوں نے فقہ اور دین کے دوسرے مسائل پر متعدد کتابیں تحریر کی ہیں اور ہزاروں افراد کو تعلیم و تدریس کے ذریعے فیض پہنچایا ہے۔ ان کی رحلت سے دینی حلقوں میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے اور تدریس حدیث کے سلسلہ میں ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور ۳۰ جولائی ۱۹۷۴ء)

روزنامہ وفاق لاہور

کے مدیر شہیر جناب مصطفےٰ صادق اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں۔

برصغیر کے ایک عالم دین مولانا محمد ادریس کاندھلوی انتقال فرما گئے۔ اس فانی دنیا سے ہر شخص نے اپنے اپنے وقت مقررہ پر گزرنا ہے، لیکن پاکستان میں عرصہ بعد یہ پہلی مثال ہے کہ تمام حلقوں نے اپنے سیاسی اختلافات اور جماعتی گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر مولانا کاندھلوی کی وفات پر گہرے رنج و غم اور صدمہ کا اظہار کیا ہے، دنیاوی اعتبار سے مولانا مرحوم و مغفور کوئی بڑی مقتدر شخصیت نہ تھے لیکن عالم دین ہونے اور تعلیم و تدریس نے انھیں اتنا بلند مقام اور مرتبہ عطا کر دیا تھا کہ ملک کے ہر حصے کے لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے بے لوث عزت و احترام کے جذبات تھے اور ہر حلقہ نے ان کی وفات کو سانحہ سمجھا۔ (روزنامہ وفاق ۳۰ جولائی ۱۹۷۴ء)

اسلامی جمیعۃ الطلباء پاکستان

کے قائم مقام ناظم اعلیٰ نے مولانا کاندھلوی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے مولانا مرحوم نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس گزاری اور مرتے دم تک انتہائی سادہ اور بے لوث زندگی بسر کرتے رہے۔ آجکل کے نازک حالات میں ایسی عظیم الشان شخصیت کا ہمارے درمیان رہنا عام حالات کی نسبت کہیں زیادہ ضروری تھا۔

مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت میں کسی کو دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے اور ان کی وفات سے پیدا شدہ خلا بہتر طریقے سے پر فرمائے۔

(روزنامہ وفاق ۲۹ جولائی ۱۹۷۴ء)

روزنامہ مشرق لاہور

مولانا کی علمی عظمت اور علوم دین میں ان کا استغراق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بیس جلدوں میں بخاری شریف کی عربی زبان میں تفسیر لکھی ہے اور دس جلدوں میں اس کا خلاصہ اردو زبان میں کیا ہے۔ مشکواۃ شریف کی آٹھ جلدوں میں شرح کی سیرۃ النبی پر ان کی تصنیف چار جلدوں پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ انھوں نے متعدد دوسری تصنیفات بھی چھوڑی ہیں۔ موت نے انھیں قرآن کریم کی تفسیر مکمل کرنے کی مہلت نہ دی لیکن اس کی پندرہ جلدوں میں انھوں نے علم وہدایت کا جو انمول خزانہ بھر دیا ہے اس کو علم و دین تفسیر کا ایک عظیم کارنامہ قرار دیا جائے گا۔

اپنی تمام عظمت و فضیلت کے باوجود مولانا عجز و انکسار کا نمونہ تھے۔ سادگی اور استغنا میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، وہ ایک خاص علمی اور دینی آدمی تھے جنھوں نے ایک گوشہ میں رہ کر اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ لیکن بظاہر ایک فرسودہ سی بات کہ ان

کی موت سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ جسے آسانی سے پر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بات ان پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

(روزنامہ مشرق ۳۰ جولائی ۱۹۷۴ء)

روزنامہ امروز لاہور

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے متعلق لکھتا ہے۔

ساری زندگی اسلامی خدمت میں مصروف رہے، تبلیغ و تدریس میں ان کا انہماک بے مثل اور بے نظیر تھا۔ ان کے تلامذہ سے میں کئی جید علماء نکلے اور جنھوں نے اپنے استاذ مکرم کے تتبع اپنی زندگیاں دین کی ترویج و اشاعت وقف کر دیں، یوں چراغ سے چراغ جلتا رہا اور رشد و ہدایت کا سلسلہ پھیلتا رہا۔ مرحوم کا شمار علمائے حق میں تھا، حدیث و فقہ میں بلند مقام رکھتے تھے اور سند مانے جاتے تھے، ان کا تعلق دیوبندی مکتبِ فکر سے تھا۔

(روزنامہ امروز ۳۰ جون ۱۹۷۴ء)

مولینا ماہر القادری مدیر "فاران" لکھتے ہیں

مولینا محمد ادریس کاندھلویؒ کے دینی اخلاص کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ معمولی معمولی جزئیات میں بھی شریعت کی سختی سے پابندی۔ دینی علوم میں صاحبِ تبحر سنتِ رسول کو جان سے زیادہ عزیز رکھنے والے اہل ذکر بھی اور صاحب حال بھی ان کی موت موت العالم کی مصداق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

(ماہنامہ فاران ستمبر ۱۹۷۴ء)

متحدہ جمہوری محاذ کی مجلس عمل

کے اجلاس میں ممتاز عالم دین مولینا محمد ادریس کاندھلوی کی وفات پر تعزیتی قرارداد پاس کی

جس میں کہا گیا کہ مولینا کاندھلوی کی وفات ایک شدید نقصان ہے۔ مرحوم ایک جید عالم اور متقی بزرگ تھے، ان کی دینی اور علمی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ جس کا پر کرنا ممکن نہیں ہے۔ مرحوم کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لئے دعا بھی کی گئی ہے۔ (وفاق ۲۹ جولائی ۱۹۷۴ء)

جماعت اسلامی پاکستان کے امیر میاں طفیل محمد صاحب اور سیکرٹری جنرل چودھری رحمت الٰہی صاحب برصغیر پاک و ہند کے ممتاز مفسر محدث اور عالم دین مولینا محمد ادریس کاندھلوی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے، اپنے تعزیتی پیغام میں انھوں نے کہا کہ مولینا کاندھلوی نے اپنی پوری زندگی قرآن و حدیث کی درس و تدریس کے لئے وقف کر دی تھی۔ ان کی وفات سے دینی اور علمی حلقوں میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ (روزنامہ وفاق ۲۹ جولائی ۱۹۷۴ء)

مولینا گلزار احمد مظاہری (اتحاد العلماء)

حضرت مولانا کاندھلوی جیسے بزرگ کا وفات پا جانا اگرچہ مرحوم کے لئے قرب جوار الٰہی کا باعث ہے لیکن ہم پسماندگان کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے۔ حضرت کاندھلوی سے تمام مکتب فکر کے علماء عقیدت رکھتے ہیں۔ آپ اتحاد امت کے نشان اور سلف صالحین کا اسوہ تھے۔

گلزار احمد مظاہری

ماہنامہ البلاغ کراچی

کے ایڈیٹر مولینا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں۔

حضرت مولینا محمد ادریس اپنے علم و فضل وسعت مطالعہ زہد و ورع سادگی. قناعت اور تواضع للہیت میں سلف صالحین کی یادگار تھے۔ ان کا وجود مجسم علم تھا۔ اور ذہن ایک مکمل کتب خانہ۔ کتابوں کے ایسے شیدائی دنیا میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی باغ و بہار مجلس علمی لطافت نکات سے معمور تھیں اور ان کی ایک ایک ادا میں علم جھلکتا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں ان کی بیسیوں تحریریں زندہ جاوید ہیں اور برصغیر کا کوئی گوشہ ان کے فیض یافتگان سے خالی نہیں پاکستان میں علم و فضل کے وارثوں میں شمار کیا جائے تو وہ ان دو چار ہستیوں میں سے تھے جن کا نام ہمیشہ سرفہرست رہتا تھا اور اب ان کی وفات کے بعد ایسی ہستیاں شاید اتنی بھی نہ ہوں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکے۔ (ماہنامہ البلاغ اکتوبر ۱۹۷۴ء)

جمعیۃ العلماء اسلام اور مجلس احرار اسلام کے مرکزی اور علاقائی دفاتر میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے اور خراج عقیدت اور ایصال ثواب پیش کیا تنظیم علماء اسلام پاک و کاشیر کے تحت تعزیتی جلسہ ہوا۔ مرکزی انجمن اصلاح البیان کی مجلس نے ایصال ثواب اور پیغام تعزیت دیا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی ہلال احمر لویتھو کلب کے صدر کیپٹن عبدالرحمان اور دوسرے ارکان نے خراج عقیدت پیش کیا اور تعزیت کا پیغام دیا۔ اسی طرح اور بے شمار اسلامی، سیاسی اور سماجی تنظیموں کی طرف سے خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اور حضرت کاندھلوی کی مغفرت اور ترقی درجات کے لئے دعا کی ہے۔

مولانا حافظ محمد نعمان صدیقی پیش نماز جامع مسجد نیلا گنبد لاہور

حضرت والد ماجد مرحوم کی وفات حسرت آیات سب بھائیوں بہنوں اور سب اہل خانہ کے لئے حادثۂ عظیم اور فاجعہ الیم ہے؛ وہاں آپ کے بلا مبالغہ ہزاروں شاگردوں جو آپ کی روحانی اولاد ہیں اور ہزاروں معتقدین، منسلکین اور محبتین جن کے لئے حضرت والد ماجد کا وجود باجود، اور ان کی زیارت و ملاقات دل کی دنیا کے لئے روشنی، طمانیت اور بہار کا سامان تھا، وہ سب ہمارے ساتھ غم و الم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہم لوگوں کو بے شمار تعزیتی خطوط اور وفود کے ذریعے صبر کرنے اور رضا بالقضار کی تلقین کی ہے؛ میں بھی تمام اہل خانہ کی طرف سے سب بھائیوں بزرگوں، دوستوں کو تعزیت کرتا ہوں اس لئے کہ وہ بھی تعزیت کے مستحق ہیں۔ میں اپنے نفس کو پہلے اور دیگر حضرات کو اس کے بعد نصیحت کرتا ہوں کہ حضرت والد ماجد کے انتقال کو عام لوگوں کی موت کی طرح تصوّر نہ کریں۔ اگرچہ حدیث شریف کے مطابق ہر شخص مرنے کے بعد دنیا کی زندگی کے مقابلے میں توی تر زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ الناس نیام اذا ماتوا انتبھو لوگ سو رہے ہیں، جب مر جاتے ہیں تو جاگ جاتے ہیں۔ مقربینِ الٰہی کا معاملہ تو اس سے بہت بلند یا وریٰ الوریٰ ہے۔

حضرت والد ماجد کی کتابوں میں عقائد کی درستی اور اصلاح کے لئے عقائد الاسلام اور سیرت کردار کی اصلاح کے لئے سیرۃ المصطفےٰ ہر سہ حصہ اور آپ کے مواعظ کا مطالعہ کرتے رہیں تاکہ تعلق قائم رہے۔ حضرت کا وصال کے بعد بھی ہم سے تعلق اور رابطہ قائم ہے، نہ صرف اولاد سے بلکہ شاگردوں اور ان کی اولاد پر بھی آپ کی توجہات کا کریمانہ دو مربیانہ موجود، ہمارے دیوبند کے ساتھی مولانا میاں تقویم الحق صاحب گورنمنٹ کالج کوہاٹ نے بیان کیا کہ ان کے صاحبزادے ارشد محمود جو ماشاء اللہ صالح اور سعید ہیں نے خواب میں حضرت کاندھلوی کی زیارت کی اور آپ کی شفقت اور توجہ کو خاص طور پر محسوس کیا آنعزیز حضرت کا جو حلیہ بیان کیا وہ اصل کے بالکل مطابق ہے۔ حالانکہ موصوف نے حضرت کی زیارت نہیں کی تھی۔

محمد نعمان صدیقی

تاثرات

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

موت العالم موت العالم

رفیق شفیق اخی فی اللہ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور رحمۃ اللہ علیہ اس وقت ان چند بزرگ ہستیوں میں سے تھے جو برِ صغیر پاک و ہند میں انگلیوں پر گنی جاتی ہیں، جو مدتوں اکابر علماء و مشائخ کی نظروں میں پلے، ان کی صحبتوں سے مستفید ہو کر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، جنھوں نے کتابوں سے زیادہ استادوں کو پڑھا۔ آج دنیا میں ان کی مثالیں کہاں اور کس طرح پیدا ہوں۔ مولانا محمد ادریس صاحب کے ساتھ احقر کی رفاقت نصف صدی سے زائد کی رفاقت ہے جو، رجب ۱۳۹۴ھ بروز دوشنبہ آپ کی وفات حسرت آیات پر ختم ہوئی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون ط

اس وقت دارالعلوم دیوبند کے اس دور کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا ہے، جب کہ ۱۳۳۷ھ میں ہم چند نوعمروں کو بیک وقت دارالعلوم دیوبند میں خدمت درس و تدریس سپرد کی گئی۔ ان میں مولانا سید بدر عالم صاحب میرٹھی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہو کر ۱۳۳۶ھ میں دوبارہ دورہ حدیث کے لئے حضرت استاد مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری صدر مدرس دارالعلوم دیوبند قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس طرح مکرر دورہ حدیث سے فارغ ہو کر ۱۳۳۷ھ میں خدمت درس و

تدریس پر مامور ہوئے، اس سے ایک سال پہلے ۱۳۳۵ھ میں احقر دورۂ حدیث سے فارغ ہوا تو ۱۳۳۶ھ میں کچھ اسباق سپرد کیے گئے اور ۱۳۳۷ھ میں مستقلاً درس و تدریس کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ ہم تینوں اس وقت کے نوعمر بچے تھے، جن کو اکابر اساتذہ ہی کی خدمت میں رہ کر تعلیمی خدمات انجام دینے کا موقع حق تعالیٰ نے عطا فرمایا۔

اس وقت دارالعلوم دیوبند ائمۂ فن علماء اور اولیاء کا ایک بے مثال گہوارہ تھا۔

ایک طرف نمونۂ سلف قدوۃ المشائخ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ کشمیری صدر مدرس دارالعلوم کا حلقہ درس۔ حافظ ابن حجر اور شیخ الاسلام نووی کے حلقہ درس کی مثال تھی تو دوسری طرف شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کا حلقہ درس امام غزالی اور رازی کی یاد تازہ کرتا تھا۔ ایک طرف شیخ المشائخ کل ہند مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کا حلقہ فتویٰ و درس حدیث و تفسیر اور اس کے ساتھ حلقہ اصلاح و ارشاد اور سالکانِ طریقت کی تربیت کا بے نظیر سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف یادگارِ سلف عالم ربانی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ کا درسِ حدیث و فقہ اور نہایت مفید و عام تصانیف کا سلسلہ تھا، اسی کے ساتھ عام اصلاح خلق کے لئے ارشاد و تربیت کا ایک بڑا حلقہ تھا جس سے ہزارہا بندگانِ خدا کی اصلاح ہوتی تھی اور ان میں دینی انقلاب نمایاں نظر آتا تھا۔

شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور شیخ المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور حضرت مولانا رسول خاں صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اس زمانے کے متوسط مدرسین میں شمار ہوتے تھے۔ رئیس المناظرین حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب اس وقت کے ناظم تعلیمات تھے۔ حجۃ الاسلام بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد احمد صاحب دارالعلوم کے صدر مہتمم تھے اور اس کے ساتھ ہمیشہ سبق پڑھانے کا معمول تھا۔ ہدیہ اولین کا ابتدائی حصہ احقر نے انھیں سے پڑھا تھا۔ نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ تھے جن کے عربی قصائد اور عظیم الشان تصنیف "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" ہر طبقے کے علماء میں قبول عام حاصل کر چکے

ہیں غرض جس طرف دیکھو یہ بزرگانِ سلف کے نمونے پیکرِ علم و عمل ستاروں کی طرح درخشاں نظر آتے تھے، جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ ؎

ایک محفل تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی

کسی شخص پر ان حضرات کی توجہ اور نظرِ عنایت ہوجانا بلاشبہ حق تعالیٰ کی رحمت کا ایک مظہر ہوتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ اس کے فضل سے ان سب بزرگوں کی نظر انتخاب نے ہم نوعمروں کو ان اکابر کی خدمت سے استفادہ کے مواقع فراہم فرمائے۔ ان حضرات نے ہم تینوں میں درس و تدریس کی خدمات کے ساتھ مسائل کی تحقیق اور علمی بحث و مباحثہ اور تصنیف و تالیف کا بھی ذوق پیدا کیا خصوصاً ۱۳۴۰ھ میں قادیانی فتنہ نے سر اٹھایا اور ان لوگوں کو یہ جرأت ہونے لگی کہ علماء کو مناظرہ اور مقابلہ کی دعوت دینے لگے۔ اس نے سنی علماء کو اس فتنہ کی روک تھام کی طرف متوجہ کیا خصوصاً حضرت الاستاد سیّد محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے قلب مبارک میں اس کا اہتمام اس شان سے پیدا ہوا کہ جیسے کوئی مامور من اللہ کسی خاص خدمت پر مامور ہوتا ہے۔ اس وقت درس و تدریس کے بعد حضرت موصوف کے تمام اوقات اسی فتنہ کے انسداد پر خرچ ہونے لگے۔ حضرتؒ نے ہم تینوں نوعمر مدرسوں اس کام پر لگایا کہ عقائدِ اسلامیہ کے خلاف تمام مسائل میں قادیانی دجل و فریب کا پردہ چاک کیا جائے مسئلہ ختم نبوت پر لکھنے کے لئے احقر کو مامور فرمایا اور نزول مسیح علیہ السلام وغیرہ کے مسائل کا کام مولانا سید بدر عالم میرٹھی اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کے سپرد فرمایا۔ سب سے پہلے ہم تینوں میں وجہ ربط و ارتباط یہ سلسلہ بنا احقر نے حضرت استاد کی ہدایات کے مطابق پہلے عربی زبان میں مسئلہ ختم نبوت کی تحقیق پر ایک رسالہ لکھا جس کا نام حضرتؒ استاد نے ہدیۃ المہدیین فی آیۃ خاتم النبیین رکھا۔ اس کو عربی زبان میں لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ عرب بغداد وغیرہ عرب ممالک سے ایسی خبریں آتی تھیں کہ وہاں بھی ان لوگوں نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرکے اس طرح کی تلبیس پھیلائی ہے۔ پھر مزید تفصیل کے ساتھ مسئلہ ختم نبوت کو اردو زبان میں تین حصوں میں لکھا۔ مولانا بدر عالم صاحبؒ نے الکلام الفصیح فی نزول المسیح کے نام سے ایک قابلِ قدر تصنیف فرمائی۔ مولانا محمد ادریسؒ صاحب نے کلمۃ اللہ فی حیاۃ روح اللہ

کے نام سے اس موضوع پر بہترین کتاب لکھی یہ سب کتابیں اسی زمانے میں چھپ کر شائع ہوئیں۔

اسی زمانے میں اکابر دارالعلوم کے ایک وفد نے جس کی قیادت استاد محترم حضرت شاہ صاحب فرما رہے تھے عام مسلمانوں میں قادیانی دجل وفریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ملک کا دورہ کرنا تجویز کیا۔ اس دورہ میں بھی ہم تینوں کو حضرت کا ہم سفر رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

اسی زمانے میں یہ تجویز ہوا کہ سالانہ ایک جلسہ خود قادیان میں منعقد کیا جائے جس میں مرزا کے اوہام باطلہ کی تردید خود ان کے مرکز میں جا کر کی جائے۔ ان جلسوں میں بھی حضرات اکابر کے ارشاد کے مطابق ہم تینوں کو شریک ہونے کا موقع ملا۔

فیروز پور پنجاب میں قادیانیوں نے مناظرہ کا چیلنج کیا تو ان کے مناظرہ کے لیے دارالعلوم کی طرف سے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ کی سرکردگی میں ہم تینوں رفیق سفر رہے۔ خود حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی بھی پہنچ گئے تین روزہ یہ تاریخی مناظرہ جاری رہا۔

حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کی خاص توجہ اور مسلسل کوشش نے چند سال میں ایسا کر دیا تھا کہ علمی اعتبار سے مرزا صاحب اور قادیانیت نے دم توڑ دیا اور یہ لوگ مناظرہ مباہلہ کا نام لینا چھوڑ کر زیر زمین سازشوں میں مشغول ہو گئے۔

اکابر دارالعلوم کی خاص نظر عنایت نے ہم تینوں کو ایسا مخلص رفیق بنا دیا تھا کہ نہ کبھی کوئی معاصرانہ چشمک درمیان میں آئی نہ کوئی شکوہ شکایت۔

۱۳۴۶ھ کے ایک خاص واقعہ میں حضرت شاہ صاحبؒ مع بعض دیگر اکابر واصاغر کے ڈابھیل تشریف لے لئے تو مولانا سید بدر عالم صاحب بھی ساتھ ہی تشریف لے گئے۔ دیوبند میں اب ہم تینوں میں سے احقر اور مولانا محمد ادریس صاحب رہ گئے اور دیوبند میں ہماری یہ رفاقت بناء پاکستان کے وقت تک مسلسل رہی پاکستان بننے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے ہم تینوں کو پاکستان جمع فرمایا۔

اور مجھے یہ بات ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ میرے پاکستان میں مستقل قیام کا سبب مولانا سید بدر عالم صاحب تھے، کیونکہ احقر شروع میں جب پاکستان آیا تو ہجرت کی نیت سے نہیں بلکہ ایک کار دستور پر

اسلامی کے سلسلہ میں انجام دینے کے لئے آیا تھا، اس لئے والدہ محترمہ اور اکثر عیال اس وقت تک دیوبند ہی تھے۔ رمضان ۱۳۶۸ھ میں ہمارا دہ کام پورا ہو گیا تو میرا ارادہ واپس ہندوستان جانے کا تھا۔ یہ ماہ رمضان گرمی کے زمانے کا تھا۔ مولانا بدر عالم صاحب کئی مرتبہ گورا قبرستان کراچی سے میری جائے قیام وکٹوریہ روڈ پر پیدل چل کر اس لئے تشریف لائے کہ مجھے پاکستان میں مستقل قیام کے لئے تاکید کریں کیونکہ ان کی نظر میں اس وقت میرا قیام پاکستان کے لئے ضروری تھا۔ ان کی ایک مخلصانہ ہمدردانہ فہمائش ہی کی بناء پر احقر نے ہندوستان سے ہجرت اور پاکستان کے مستقل قیام کا عزم کر لیا۔

مولانا محمد ادریس صاحب پاکستان تشریف لائے تو پہلے جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے سربراہ کی حیثیت سے بہاولپور میں مقیم ہوئے۔ اس عرصہ میں بھی ملاقاتیں اور خط و کتابت ہوتی رہتی تھی پھر جلد ہی آپ جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث ہو کر تشریف لے آئے اور جامعہ میں درس حدیث کی خدمت انجام دیتے ہوئے عمر گزاری کی آخری ساعات پوری فرما دیں۔ اللهم اغفرله مغفرة ظاهرة باطنة لا تغادر ذنبا۔

قیام جامعہ اشرفیہ کے زمانے میں الحمد للہ بار بار باہمی ملاقات اور مسلسل خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باہمی تعلق روز بروز بڑھ رہا ہے وہ ہر تصنیف مجھے سناتے اور چھپنے کے بعد عطا فرماتے تھے یہی سلسلہ کچھ احقر کی طرف سے جاری رہتا تھا۔ باوجود اس فوقیت کے جو اللہ تعالیٰ نے ہر علم و فن اور عمل اور اخلاق میں ان کو مجھ پر عطا فرمائی تھی اپنی تواضع کی بناء پر فتویٰ میں مجھ پر اعتماد فرماتے تھے اور میری تمام تصانیف کو اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھتے تھے، وفات سے غالباً ایک سال پہلے جب میری تفسیر معارف القرآن مکمل ہوئی اور آخری آٹھویں جلد مولانا موصوف کی خدمت میں بھیجی تو اس پر اپنی انتہائی خوشنودی کا اظہار فرمایا جس کو دار العلوم کے ماہنامہ البلاغ میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک خط میں تحریر فرمایا کہ میں تمہاری ہر تصنیف دو نسخے رکھتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا ہے ومن كل شیء خلقنا زوجين مولانا موصوف کی ہر مجلس اور گفتگو میں علمی چاشنی اور قرآن و حدیث کے جملے برمحل و برموقع ہوا کرتے تھے۔

ایک حج کے موقع میں اتفاقاً احقر بھی حاضر تھا۔ مکہ مکرمہ مدرسہ صولتیہ میں قیام تھا یہاں ہندوستان کے ایک عالم بھی ملاقات کے لئے آئے انھوں نے پاکستان کے سربراہ مملکت کے متعلق کچھ شکایت کی تو برجستہ فرمایا کہ وہ ہندوستان کے ہندو سربراہِ مملکت سے بہرحال بہتر ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم اور اعجبکم کے الفاظ کہتے ہوئے ان کی طرف اشارہ کرکے مزید لطف بڑھا دیا۔ وہ ہندوستانی عالم بھی بے تکلف دوست تھے بہت محظوظ ہوئے میرے لڑکے مولوی محمد تقی سلمہ ایک بار جب لاہور گئے تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بڑی شفقت کے ساتھ بٹھایا اور فرمایا کہ معاصرین میں باہم کچھ چشمک ہوا کرتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم میں اور مفتی صاحب میں کبھی اس کا نام نہیں آیا جب کوئی مفتی صاحب کی تعریف و مدح کرتا ہے تو میں اس کو اپنی ہی تعریف سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ابن حاجب نے کافیہ میں توابع بیان کے تحت صفت کی دو قسمیں لکھی ہیں جن میں ایک قسم صفت متعلق منعوت بھی ہے جیسے زید العالم اخوہ یعنی زید جس کا بھائی عالم ہے۔ اس میں بھائی کے عالم ہونے کو خود زید کی صفت قرار دیا ہے تو میں مفتی صاحب کی صفت کو اپنی صفت کیوں نہ سمجھوں۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھ بے علم اور بے عمل کا تو کہنا ہی کیا مولانا کو اللہ تعالیٰ نے علمی کمالات میں اپنے سبھی معاصرین میں خاص امتیاز اور تفوق عطا فرمایا تھا مگر ساتھ بزرگوں کی صحبت نے تواضع اور فروتنی کی بھی وہ صفت عطا کر دی تھی جو قدیم علماء دیوبند کا خاص امتیاز تھا کہ نہ کبھی علم کے دعوے نہ دوسروں پر اپنی فوقیت کا کہیں کوئی شائبہ۔ مشہور مقولہ ہے کہ معاصرت مفاخرت کی بنیاد ہوتی ہے مگر اللہ والوں کی شان ان سب چیزوں سے بلند ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے مولانا موصوف کو ایسا ہی بنایا تھا جس کے آثار ان کے تمام اعمال و افعال میں ظاہر ہوتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ علمی کمالات بھی جبھی اپنا رنگ لاتے ہیں جب ان کے ساتھ تزکیہ باطن اور تقویٰ و طہارت ہو، مولانا موصوف کو حق تعالیٰ نے جس طرح علمی کمالات میں فائق فرمایا تھا۔ اسی طرح ان باطنی کمالات سے بھی مزین فرمایا تھا۔

مولانا موصوف کے علمی کمالات کا کچھ اندازہ ان کی تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ حدیث کی کتاب مشکوٰۃ شریف پر آپ کی مفصل شرح تو عرصہ دراز سے علماء وطلباء میں خاص مقبولیت حاصل کر چکی ہے، بعد میں حل مشکلات بخاری وغیرہ دوسری تصانیف بھی فن حدیث سے متعلق ہوئی ہیں جو آفتاب آمد دلیل آفتاب کا مصداق ہیں۔ سیرت نبویؐ کے متعلق آپ کی تصنیف سیرۃ المصطفےٰ تین جلدوں میں بہترین تصنیف ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ فرمایا تو معارف القرآن کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس نام کی تفسیر تو مفتی محمد شفیع صاحب کی چھپ رہی ہے تو فرمایا کہ میں اور وہ الگ الگ نہیں۔ اسی طرح میرے رسالے دعاوی مرزا ہی کے نام پر اس موضوع پر دو رسالے تصنیف فرمائے۔

افسوس ہے کہ مولانا کی تفسیر قرآن مکمل نہ ہو سکی۔ اس کی جتنی جلدیں چھپی ہیں وہ بھی اپنی جگہ علماء وطلباء کے لئے بڑا مفید ذخیرہ ہے حق تعالیٰ قبول فرمائیں۔

مولانا کے علمی شغل اور علمی ذوق نے ہمیشہ ان کو دنیا کے سازوسامان سے بے نیاز رکھا تھا۔ ایک روز خود مجھے فرمایا کہ میرے گھر والے کبھی کبھی مجھ سے کہتے ہیں کہ کچھ تو دنیا کا بھی خیال کرو۔ تو میں کہہ دیتا ہوں کہ دنیا نے میرا خیال کیا ہے جو میں اس کے خیال میں مبتلا رہوں۔

دن رات کے علمی اشتغال کا یہ عالم تھا کہ میرے بڑے لڑکے مولوی محمد ذکی سلمہٗ جو لاہور ہی میں رہتے ہیں اور مرض وفات میں تقریباً روزانہ ہی حاضر خدمت ہوتے تھے۔ وفات سے دو تین روز پہلے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ نیم بیہوشی کے عالم میں ضعف ونقاہت بے حد تھی اس حال میں آنکھ کھولی اور محمد ذکی پر نظر پڑی تو پوچھا کہ حدیث کی کتاب مؤطا امام مالک کا اردو ترجمہ وحید الزماں صاحب کا آپ کے پاس موجود ہے یا نہیں۔ محمد ذکی سلمہٗ نے عرض کیا کہ وہ کہیں نہیں چھپا جس قدر چھپا ہے وہ موجود ہے تو فرمایا کہ وہ میرے پاس بھیج دینا اس وقت جب کہ سب طاقتیں جواب دے چکی تھیں۔ اب اس دلدادۂ علم کو کتاب ہی کی تلاش تھی جس کی نظیریں ائمہ سلف ہی کے حالات میں ملتی ہیں۔

مولانا کے علمی عملی کمالات بیان کرنے کے لئے تو ایک ضخیم کتاب چاہئے اور امید ہے کہ مولانا کے

صاحبزادے مولانا محمد مالک صاحب اس کام کو انجام دیں گے۔ یہ سطور اس تفصیل کی متحمل نہیں یہاں تو اس وقتی تاثر اور ناقابل تلافی نقصان کا اظہار ہے جو مولانا کی وفات سے اُمت مرحومہ کو پہنچا ہے، مولانا علمی اور عملی کمالات میں تو مجھ سے بہت فائق اور آگے تھے مگر عمر میں پانچ سال پیچھے، اس لئے ظاہری اسباب کے اعتبار سے یہ اُمید تھی کہ ان کی وفات کا سانحہ میری زندگی میں پیش نہ آئے گا اور یہی تمنا اور دعا تھی مگر بحکم قضاء و قدر میدان ہستی کے قطع کرنے میں بھی وہ ہی مجھ سے سبقت لے گئے۔ انا للہ۔ مولانا کی وفات نے بالکل کمر توڑ دی اور اب اپنی زندگی بھی تلخ ہو گئی۔

ذهب الذين يعاش في اكنافهم

وبقيت منهم كالبعير الاجرد

وہ لوگ چل بسے جن کے سائے میں لوگ زندہ رہا کرتے تھے اور میں ان میں سے ایک خارشتی اونٹ کی طرح باقی رہ گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ اس طرح کے واقعات پر نظمیں اور مرثیے اور تاریخی مسائل تھا، افسوس ہے کہ اب دل و دماغ اس سے بالکل ہی کورا ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ مولانا محمد ادریس صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے اہل و عیال کو صبر جمیل کے ساتھ اپنا تکفل عطا فرمائے۔ صاحبزادوں کو مولانا کی علمی میراث کا سچا جانشین بنائیں۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

بندہ محمد شفیع، خادم دار العلوم کراچی

شہید علم ذکی الامتؒ

از حکیم مولوی انیس احمد صدیقی پھلتی

بانی و ناظم مجلس اشاعت سلام (مسلک شاہ ولی اللہ) لاہور

پھلت اور کاندھلہ دونوں قصبے ضلع مظفر نگر یو پی (ہند) میں واقع ہیں اور مردم خیز ہونے کی وجہ سے مشہور و معروف ہیں۔ دونوں قصبات میں شیوخ صدیقی نژاد آباد ہیں۔ اس لئے آپس میں نسبی اور علمی دونوں قسم کے تعلقات ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اپنے عم محترم شاہ اہل اللہ پھلتیؒ اور خال استاذ مکرم شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کی وجہ سے پھلتی بھی ہیں اور آپ کے تلامذہ میں مولینا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت مولینا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم کے والد ماجد حضرت مولینا حافظ محمد اسماعیل مرحوم نے حضرت مولینا قاضی محمد ایوب صاحب مرحوم پھلتی قاضی بھوپال سے مشکوٰۃ شریف اور دیگر کتب حدیث پڑھی ہیں۔ مولینا کاندھلوی فرماتے تھے کہ قاضی صاحبؒ فقیہ ہونے کے علاوہ علم رویا و تعبیر منام میں ابن سیرین ثانی تھے۔ میرے والد ماجد حضرت مولینا علاء الدین کا تعلق حضرت مولینا محمد اسماعیل صاحبؒ سے بھوپال کے زمانے سے تھا۔

میرے والد ماجدؒ نے حضرت مولینا محمد یحییٰؒ قاضی القضاۃ بھوپال سے تعلیم حاصل کی تھی جو حضرت مولینا قاضی محمد ایوب صاحبؒ قاضی القضاۃ بھوپال کے صاحبزادے تھے۔ اس طرح سے میرے والد ماجد اور مولینا کے والد ماجد کا استاذ خانہ واحد ہے۔

---

[1] الابواب والتراجم ص ۲۳

میرے مادری عزیزوں میں سے جناب مولوی اکرام الحق صاحب کاندھلوی نے بیان کیا کہ حضرت مولینا محمد ادریس کاندھلوی کی ولادت سے قبل آپ کے والد ماجد مرحوم مغفور نے خواب میں دیکھا کہ ان کے گھر میں ایک نُور روشن ہوا ہے اور اس نور کے ظہور سے ہر طرف نور ہی نُور نظر آرہا ہے۔

میں نے موصوف سے عرض کیا کہ آپ عمر میں حضرت سے بڑے نہیں ہیں یہ روایت آپ کو کس طرح پہنچی ہے۔ انھوں نے جواب میں بتایا کہ میں نے یہ خواب بہت عرصہ ہوا اپنے بزرگوں سے کاندھلہ ہی میں سنی ہے۔ اس خواب کی تعبیر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس کے رویائے صادق اور عظیم بشارت ہونے میں آج کسی کو بھی شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت استاذی العلامہ شیخ المحدثین اور مفسرین مولینا محمد ادریس کاندھلوی قدس اللہ سرہٗ سے میرا تعلق بطور شاگرد کے دارالعلوم دیوبند سے ہوا۔ جب آپ دارالعلوم میں شیخ التفسیر تھے میں نے حضرت سے تفسیر اور حدیث دونوں علوم میں جو بہترین اور برترین علوم ہونے کے علاوہ دین کی اساس اور بنیادیں استفادہ کیا ہے، حضرت کے درس میں خاص طریقہ یہ تھا کہ آپ صرف درسی کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ اس موضوع پر دوسری کتابوں اور اہم معلومات کا خلاصہ اور جوہر بیان فرماتے تھے۔ آپ نے تفسیر قرآن تفسیر ابن کثیر اور تفسیر بیضاوی پڑھاتے تھے لیکن آپ روح المعانی، کشاف، تفسیر مظہری وغیرہ کتب تفاسیر اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، ابن عربیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم و معارف کے جواہر پارے پیش کرتے۔ حدیث میں ابوداؤد شریف کا درس آپ سے متعلق تھا۔ لیکن آپ نے ابوداؤد شریف کے درس میں صحاح ستہ کی روح۔ امام بخاری کی فضیلت اور امام اعظم کے مسلک پر ان کی جرح و تنقید کا جواب باصواب امام مسلم کی عظمت اور دوسرے محدثین اور ان کی کتابوں کے متعلق ضروری معلومات بیان فرمادیتے اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ حضرت ایک کتاب کے درس میں پوری صحاح ستہ بلکہ پورے علم حدیث کی کتابوں کا درس دیتے تھے تو میرے اس،

دعوے کی تصدیق کرنے والے آپ کے بیشمار شاگرد آج بھی موجود ہیں اور یہی طریقہ تدریس آپ کے استاذ حضرت علامہ مولینا سیّد محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کا تھا۔

حضرت استاذی دار العلوم میں شیخ التفسیر تھے اور آپ طبعًا کانگریس سے سخت متنفّر تھے۔ حضرت حکیم الامت مولینا تھانوی کی طرح ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے اتحاد کو ملّت اسلامیہ کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ مولینا ابو الکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن پر تنقید فرماتے اور درویش منش ہونے کی وجہ سے پارٹی بازی بھی نہیں کرتے تھے اور جس شخص کو کھانے پینے اور زندگی کی دوسری ضروریات وحوائج کی تکمیل کے لیے وقت نہ ملتا ہو اور ہر وقت کتابوں کے سمندر میں غرق رہتا ہو اس کو پارٹی بازی اور سیاسی توڑ جوڑ کے لئے کب فرصت ہو سکتی ہے۔

جب حضرت حکیم الامت مولینا تھانوی دار العلوم دیوبند کی سرپرستی سے استعفاء دے دیا اور حضرت شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم دار العلوم دیوبند صدارت اہتمام سے علیحدہ ہوئے اور کانگریسی افکار کا تغلب ہوا۔ اس وقت حضرت کاندھلوی قدس اللہ سرہ کے ساتھ بعض حضرات اور کچھ طلباء کا جو رویّہ رہا وہ قابلِ افسوس ہے۔

ایک روز ناچیز نے اس ناخوشگوار زمانے کی یاد آنے پر اظہار تاسف کیا تو حضرت نے فرمایا تاسف کے بجائے تشکر کی ضرورت ہے۔

میرے ساتھ کانگریسی اصحاب نے جو رویّہ اختیار کیا۔ حق تعالیٰ نے اس کے بدلے مجھے جس انعام و اکرام سے نوازا اور جو مجھ پر رحمتیں ہوئیں، یہ اس ہی ابتلاء و آزمائش کے ثمرات ہیں اور جس چیز کے ثمرات اور نتائج پسندیدہ اور محمود ہیں اس کے ذرائع کو نامحمود نہیں کہا جا سکتا بلکہ اُن پر بھی شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے فللّٰہ الحمد علی احسانہ وانعامہ

حضرت کاندھلوی کو حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ اور ان کی اولاد و احفاد سے جو تعلق تھا اور آپ بلاشبہ حضرت شاہ ولی اللہؒ حضرت شاہ عبد العزیزؒ حضرت شاہ اسحٰقؒ حضرت مولینا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت مولینا انور شاہ کشمیریؒ کے علوم

و معارف اور حقائق و دقائق کے حامل و امین اور ترجمان تھے اس لئے ذکی الامت جو خطاب حضرت شاہ ولی اللہ کو عطا ہوا تھا، اس دور میں اس کے سب سے زیادہ مستحق حضرت کاندھلوی تھے، جن لوگوں کو حضرت سے استفادہ کا موقع ملا ہے وہ اس کے شاہد عدل ہیں کہ ذکی الامت کا خطاب، آپ ہی کی شایان شان ہے، حضرت حکیم الامت مولینا تھانوی نے جو الفاظ آپ کے متعلق لکھے ہیں اُن سے بھی ذکی الامت ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس خطاب کا اثر آپ کی حیات میں غالب تھا۔ میں نے جو آپ کے حالات و واقعات قلم بند کئے تھے اس کے مجوزہ ناموں میں ایک نام ذکی الامت بھی تھا۔ لیکن برادر عزیز مولوی محمد میاں صدیقی سلمہ کی اس تالیف کے بعد میری کتاب کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے اپنا مسودہ آنعزیز کو سپرد کردیا، ع سپردم بتو مایہ خویش را۔ اور یہ مایہ بھی درحقیقت ان ہی کا ہے، وہ اس کے ہر طرح مستحق ہیں، جو بات اس میں سے پسند آئی اس کو فاضل مؤلف نے اس کتاب میں شامل کرلیا ہے۔ مولوی محمد میاں صدیقی کو تحریر و بیان میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ آپ نے نہایت اچھے انداز سے اس کتاب کو مدون اور مرتب کیا ہے، زبان سلیس اور شستہ رکھی ہے یہ سب چیزیں قابلِ قدر اور قابلِ تعریف و تحسین ہیں یہ کتاب چودھویں شب کا ماہ تاباں ہے بدر کامل کے سامنے چھوٹے موٹے ستاروں کا گم ہوجانا فطری امر ہے۔ اس لئے مجھے اپنی کتاب کی اشاعت کے بجائے اس کتاب کی اشاعت مرغوب و محبوب ہے۔

شہیدِ علم

میں حضرت کو وفات کے بعد شہید علم سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہ ہم سب تلامذہ اور متعلقین جانتے ہیں کہ حضرت کو علم دین کے علاوہ کسی علم کسی بات دنیا کی کسی چیز سے رغبت نہ تھی اور آپ نے پوری زندگی تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور وعظ و تذکیر میں صرف کی اس لئے آپ یقیناً شہیدِ علم ہیں۔ دوسرے میں نے آپ کو دوبار خواب میں اس طرح

دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے، اور آپ جامعہ اشرفیہ میں اپنے علوم و فیوض سے طلباء و تلامذہ کو مستفیض فرما رہے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی ایک تعبیر یہ ہے کہ برادرم مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی جو حضرت کے خلف الرشید ہیں اور علم و معارف میں حضرت کے جانشین ہیں، وہ بطور شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ میں معروف خدمت ہیں۔ الولد سر لابیہ کے مصداق کامل ہیں۔ دوسری تعبیر یہ ہے کہ حضرت کو اللہ تعالیٰ نے شہیدِ علم کا اعلیٰ درجہ عطا فرمایا ہے اور جس طرح شہید کو حیاتِ ابدی عطا کی جاتی ہے اسی طرح حضرت کو حیاتِ جاودانی عطا فرمائی ہے جس کے اثرات و مظاہر ہمارے سامنے آپ کی بلند تالیف و تصانیف اور ارشادات و فرمودات کی صورت میں موجود ہیں متعنا اللہ بعلومہ و فیوضہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی سعادت اور رب تعالیٰ کا دیدار و وصال رجب المرجب کے مہینے میں حاصل ہوا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ بہت سے اکابر کا وصال اسی ماہِ مبارک میں ہوا ہے، معراج اور وصال کا تعلق تو ہمارے ذہن نارسا میں بھی آتا ہے، اس کے علاوہ جو اس کے اسرار و حکم ہیں وہ حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کا وصال ۸ رجب ۱۳۹۰ھ کو، حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ میں ہوا۔ شاہ محمد موسیٰؒ فرزند گرامی حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کا وصال ۱۲ رجب ۱۲۵۹ھ کو ہوا، حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کا وصال ۶ رجب ۶۳۲ھ میں ہوا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ جن کو خیر التابعین کہا جاتا ہے آپ کا وصال ۵ رجب ۱۱۰ھ میں ہوا۔ حضرت خواجہ سلطان الہند اجمیریؒ کے دادا پیر حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی قدس اللہ سرہٗ کا وصال ۵ رجب ۶۱۲ھ میں ہوا۔ سلسلہ چشتیہ میں حضرت شاہ عضد الدین کا وصال رجب ۱۱۷۲ھ شاہ محمدی اکبر آبادی رجب ۱۲۰۷ھ

شاہ محب اللہ الہ آبادی کا وصال ۱۵ رجب ۱۰۵۸ھ میں ہوا اور شاہ ابو یوسف

چشتی کا وصال چشت میں ۳ رجب ۵۹۹ھ میں ہوا حضرت کاندھلوی بھی طریقت میں چشتی تھے، غالبًا یہ اس ہی نسبت کا اثر ہے۔ پیر مانکی شریف کا انتقال بھی ماہ رجب میں ہوا ہے پیر مانکی صاحب نے تعمیر پاکستان میں حضرت کاندھلوی کی طرح قابلِ قدر کام کیا ہے، دونوں بزرگ تعمیر پاکستان میں شریک ہیں۔ عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیز مجدد اول رضی اللہ عنہ کی وفات ۲۵ رجب ۱۰۱ھ میں ہوئی اور آپ کے ذریعہ علوم اسلامی کی تدوین اور اشاعت کا عظیم الشان کام ہوا۔

یہ چند اکابر ہیں جن کا وصال ماہ رجب میں ہوا ہے، ان کے علاوہ اور بھی یقینًا بے شمار مشائخ اور علما ضرور ہیں جن کا وصال اس مہینے میں ہوا ہے۔ میں نے کوئی استیعاب نہیں کیا ہے بلکہ جن بزرگوں کی تاریخِ وفات آسانی سے معلوم ہو سکی وہ تحریر کر دی ہے۔ میں حضرت کاندھلوی کے احسانات اور عنایات بے غایات کا کیا تذکرہ کروں جو اس ناچیز پر فرماتے رہے۔

مجھے قرآن و حدیث کے جو دو حروف آتے ہیں اور علم دین سے جو شغف ہے وہ حضرت کاندھلوی سے شرف تلمذ کی برکت ہے، میں جس قرآنِ حکیم میں تلاوت کرتا ہوں وہ نسخہ حضرت کا عطا کردہ ہے۔ آپ جب کبھی میرے نام مکتوب گرامی تحریر فرماتے اس میں رقم فرماتے عزیزم حکیم مولوی انیس احمد صدیقی سلمکم اللہ تعالیٰ صد سلام و دعاء بعد ادعیہ وافرہ آپ کی کس کس شفقت اور محبت کا ذکر کروں۔ کئی باتیں جو والد ماجد نہیں کرتے تھے میں وہ چیزیں حضرت سے کرا لیتا تھا۔ میں نے مکان کی تعمیر کے لئے والد ماجدؒ سے بنیاد رکھنے کی خواہش ظاہر کی والد ماجد نے منع فرما دیا۔ حضرت استاذی کاندھلوی صاحب سے عرض کیا۔ آپ نے میری محبت اور تعلق کی وجہ سے قبول فرمالیا اور میرے مکان کی بنیاد رکھی۔ میرے گھر کے ساتھ اپنے بچوں کے لئے زمین خریدی، نیز جامع مسجد صدیقی کی بنیاد رکھی اور اس کی توسیع و تعمیر میں بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار فرمایا، اور وصال کے وقت تک آپ کو اس کی تعمیر و تکمیل کی فکر لگی رہی۔

میرے لئے شیروانی کا کپڑا لائے اور ایک قراقلی کی ٹوپی عطا کی، اپنی تالیف و مطبوعہ ہر کتاب کا نسخہ مرحمت فرماتے، آپ کی کس کس شفقت اور عنایت کا ذکر کروں، مجھے حضرت اپنے بچّوں کی طرح سمجھتے تھے بلکہ بعض چیزوں میں ترجیح دیتے تھے، اگرچہ میں اس کا اہل نہ تھا۔ یہ محض حضرت کاندھلوی کی خاص شفقت تھی۔

اللہ تعالیٰ حضرت کاندھلویؒ کے جنّت الفردوس میں درجے بلند فرمائے اور شہداء و صدّیقین کے زمرہ میں شامل فرمائے اور ہم کو آپ کے علوم و فیوض سے مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ فقط

ناچیز

انیس احمد صدّیقی

۲ رجب المرجب ۱۳۹۶ھ

مولانا بہاؤالحق قاسمی خطیب جامع مسجد ماڈل ٹاؤن لاہور نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور کا انتقال ایک ایسا دینی نقصان جس کی تلافی شاید مدّت تک نہ ہو سکے گی۔

خان بہادر میاں محمد یوسف بی،اے،ایل،ایل،بی (ریٹائرڈ)

ڈپٹی کمشنر (بحالیات) لاہور

پاک وہند کے بہت بڑے عالم باعمل استاد العلما حضرت الحاج مولانا محمد ادریس صاحب رحمتہ اللہ علیہ شیخ الحدیث والتفسیر جامع اشرفیہ لاہور کی وفات حسرت آیات پر جو غم والم کے جذبات واحساسات ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں موجزن ہوئے قلم ان کا خاکہ کھینچنے سے عاجز اور زبان انھیں بیان کرنے سے قاصر ہے

ہیاں رنج وتاسف جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کیلئے ہے نہ دل زباں کے لئے

ریڈیو والوں کے اصرار پر قبرستان ہی میں اسی دن احقر نے بمشکل تمام اپنے جذبات کا اظہا مختصر طور پر کیا تھا جو ریڈیو اسٹیشن سے اسی شام نشر ہوئے۔

حضرت والا ایک بے نظیر عالم دین تھے، ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا ان کا اپنا ذاتی کتب خانہ تھا، جس میں ہزاروں کتب ہائے دین عربی، فارسی و اُردو زبان میں ہر شعبہ دین کے متعلق تھیں۔ یہ سلسلہ اچھی اچھی کتب ہائے دین حاصل کرنے کا تا وصال جاری رہا۔ دمِ آخر سے ایک دو دن قبل بھی ایک کتاب -/800 روپے میں خرید کی۔

حضرت موصوف نے ممالک اسلامیہ کا دورہ کرکے بہت سی کتابیں خریدیں اور خصوصاً دمشق میں دو سال قیام فرما کر کئی کتابیں خود بھی تصنیف فرمائیں اور وہیں چھپوائیں حضرت والا کا

کتب ہائے دین حاصل کرنے کا شوق اس قدر شدید تھا کہ اپنے عقیدت مندوں اور دوستوں کو بھی یہی مذہبی کتابیں لانے کی فرمائش فرماتے، چنانچہ جب احقر دو دفعہ ۱۹۶۰ء و ۱۹۶۷ء میں حج بیت اللہ کے لئے گیا تو ماسوائے ایسی ہی کتابوں کے کوئی دیگر فرمائش نہیں فرمائی۔

حضرت مرحوم نے خود بھی مختلف مضامین پر زائد از یکصد کتابیں تصنیف فرمائیں، اس کے علاوہ قرآن پاک کے بائیس ۲۲ سپاروں کی تفسیر تو مکمل کر لی مگر پھر یہ حسرت لے کر رخصت ہوئے کہ کاش میں باقی آٹھ ۸ پاروں کی تفسیر بھی کر سکتا۔ خدا کرے ان کے بے بہا کتب خانے کا جس میں کافی پرانی قلمی کتابیں بھی ہیں فیض مدام جاری رہے۔

حضرت مرحوم کا معمول تھا کہ حتی الوسع ہر جمعہ کو جامعہ مسجد نیلا گنبد لاہور میں وعظ فرماتے جو ایک علمی و تجارتی مرکز ہے تاکہ نئے دور کے نوجوانوں اور سفر بیت دلدادوں کانوں میں ہفتہ میں کم از کم ایک دن تو حق کی آواز پہنچ جائے "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" چنانچہ نیاز مند حضرتِ والا مرحوم کے وعظ سن کر ہی معتقد ہوا اور اس طرح اور بہت سے انگریزی داں حضرت کی آغوش میں آ گئے۔ حضرت نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ نیاز مند نے زائد بیس سال ماڈل ٹاؤن سے نیلا گنبد آ کر حضرت کے وعظوں میں شرکت کی۔ مولانا موصوف کا وعظ بہت علمی و معلومات سے بھرپور اور سینکڑوں کتابوں کا نچوڑ ہوتا تھا جس میں مختلف کتابوں کے حوالہ جات ہوتے تھے تاکہ سامعین کو ان کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو۔ بہت سے صاحبِ ذوق کاغذ قلم یا ٹیپ ریکارڈ لے کر حاضر ہوتے تھے اور اگلے جمعہ کو وہ وعظ چھپوا کر تقسیم کرتے تھے، یہ سلسلہ کافی عرصہ جاری رہا۔

سامعین میں اکثر و بیشتر یونیورسٹی و کالجوں کے پروفیسر و طلباء، ہائی کورٹ و دیگر عدالتہائے کے وکلاء، جج، مجسٹریٹ، میو ہسپتال کے ڈاکٹر، پنجاب سیکرٹریٹ و کارپوریشن و دیگر محکمہ جات کے افسر معہ عملہ اور انارکلی و ملحقہ تجارتی مراکز کے تجار شامل ہوتے تھے بلکہ لاہور کے دیگر علاقہ جات و دور و دراز مقامات و مضافات گوجرانوالہ، گکھڑ تک کے معتقد حضرات شریک وعظ ہوتے تھے

رمضان شریف میں تو اس قدر مجمع ہوتا تھا کہ ارد گرد کی سڑکیں بند کر کے ان پر نمازیوں اور سامعین کی صفیں دور تک میو ہسپتال کی حد تک پہنچ جاتی تھیں۔

افسوس صد افسوس وہ شمع اب گل ہو گئی اور پروانے بھٹکتے پھرتے ہیں۔

حضرت مرحوم نے سامعین میں ایک نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دی تھی حضرت مرحوم کی ذات والا صفات عجیب خیر و برکت کی تھی۔ در اصل خداوند تعالیٰ نے ان کو اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے پیدا کیا تھا۔ ان کی نیکیوں اور کرم فرمائیوں کے باعث ان کا اسم گرامی رہتی دنیا تک نہایت تشکر و محبّت سے یاد کیا جائے گا۔ حضرت پیری مریدی نہ کرتے تھے ورنہ ہزار ہا ہزار مرید ہوتے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں مقام اعلیٰ عنایت فرمائے اور ہم گنہگاروں کی مغفرت و نجات کا وسیلہ ثابت کرے اور ان کے پسماندگان کو عموماً اور فرزندگان کو خصوصاً ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے اور صبر جمیل عطا فرمائے۔

بہر حال یہ بات نہایت تسلّی بخش ہے کہ حضرت مرحوم کے نیک و لائق فرزند اکبر مولینا الحاج حافظ محمّد مالک صاحب نے اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چل کر دینی علوم کا بدرجہ احسن مطالعہ کیا ہے۔ مجلسِ شوریٰ جامعہ اشرفیہ لاہور نے انھیں حضرت مرحوم کا نہایت موزوں و صحیح جانشین متعیّن فرما کر لاہور کے عوام پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس طرح حضرت مرحوم کی برکات و فیوض بدستور جاری رہیں گے۔ انشاء اللہ

محمّد یوسف انبالوی

c-65 - ماڈل ٹاؤن - لاہور

استاذی المحترم شیخ التفسیر والحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

حافظ محمد یونس ایم اے آفیسر وزارت امور اسلامی، اسلام آباد

خداوند قدوس اپنے کام کے لئے ہمیشہ ایسے مخصوص افراد کو چن لیتا ہے جو اس کے دست عمل بن جاتے ہیں، حضرت مولائی و مرشدی شیخ التفسیر والحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ان علمائے رجال اور آئمہ اسلام میں سے تھے، جن کی تمام زندگی کتاب و سنت کے درس و مطالعہ اور ان کے اسرار و معارف کی نشر و اشاعت میں گزری اور آپ کا جب خاتمہ ہوا تو ملک و ملت کی خدمت اور الحاد و دہریت کے خلاف جہاد پر ہوا۔

مولانا مرحوم دنیائے اسلام کا ایک درخشندہ ستارا تھے، آپ کی بے مثل ذکاوت، بے مثل تقریر، بے مثل تحریر، عجیب و غریب حافظہ، تبحرِ علمی اور آپ کے کمالاتِ علمیہ، ایسے نہیں ہیں کہ کوئی منصف مزاج ان میں تأمل کر سکے۔ آپ کے ارشاداتِ عالیہ اگر ایک طرف پُر مغز ہیں اور مسلک اہلِ سنت کے مطابق محققانہ تو دوسری طرف ضروریات کے موافق ہیں اور حکیمانہ، پڑھتے جایئے اور معاندین اسلام کے پیدا کئے ہوئے شبہات کی جڑ از خود کٹتی چلی جائے گی اور اہلِ باطل کی اختراع کی ہوئی کج راہیاں آپ ہی آپ ہباءً منثورا ہوتی چلی جائیں گی۔ پھر کسی فریق کی دل آزاری بھی نہیں ہے، زبان اور طرز بیان نہ خشک نہ مُغلق نہ مولویانہ بلکہ سلیس، شگفتہ، دل کش اور جا بجا ادیبانہ ہے۔

مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ ۱۹۵۵ء میں دورۂ حدیث شریف کی تکمیل جامعہ اشرفیہ لاہور میں آپ ہی سے کی۔ دورانِ تعلیم جو عنایات مخصوصہ اور توجہات کریمہ پوری جماعت اور خصوصاً مجھ ناچیز پر ہوئیں۔ ان کا ذکر مجھ جیسے بے بضاعت اور کم مایہ شخص کی وسعت

بیان سے باہر ہے، جامعہ سے فراغت کے بعد جب بھی کبھی حاضری کا شرف حاصل ہوا تو مولانا نور اللہ مرقدہٗ نے انتہائی مشفقانہ انداز میں پند و نصائح کے بیش بہا موتی عطا فرمائے۔ مجھے اب بھی جب کبھی وہ مناظر یاد آتے ہیں، تو گھنٹوں ان کی یاد میں محو رہتا ہوں، زبان سے مغفرت کی دعائیں، دل سے بلندیٔ درجات کی دعائیں اور آنکھوں سے عقیدت و احترام کے آنسو نکلتے ہیں، خداوند کریم ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

آپ کے لئے اس سے بڑھ کر صدقہ جاریہ اور سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں آپ کے تلامذہ پوری دنیا میں دین کی تعلیم میں مصروف ہیں۔ آپ کے خلف الرشید مولانا محمد میاں صدیقی جو کہ گوناں گوں خوبیوں کے مالک اور وزارت مذہبی امور پاکستان میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ آپ کی وصال کے بعد ان کی ذات میرے لئے وجہ سکون اور قابلِ قدر ہے، مجھے ان میں مولانا مرحوم کی شخصیت کا عکس نظر آجاتا ہے۔ خداوند کریم انھیں اپنے والد محترم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور دین و دنیا میں اپنے خصوصی انعامات سے نوازے۔ مولانا مرحوم کی زندگی کو منصۂ شہود پر لاکر صدیقی صاحب نے ایک بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے جس سے حضرت کاندھلویؒ کے ارادت مندوں، عقیدت مندوں اور تلامذہ کی آرزوؤں کی تکمیل ہو گئی ہے اور ایک راہنما اصول ہاتھ آگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ان مساعیٔ جمیلہ کو شرف قبولیت بخشے۔ (آمین)

حافظ محمد یونس ایم اے

۲۰ مئی ۱۹۸۵ء

مولوی حافظ محمد داؤد، ایڈووکیٹ، ایبٹ آباد

عزیزم گرامی قدر محمد میاں سلمۂ

السّلام علیکم

ریڈیو کی اہم خبروں میں حضرت مولانا مرحوم کے وصال کی خبر سُن کر انتہائی ملال اور صدمہ ہوا۔ موتِ عالِم موتِ عالَم کے مصداق حضرت شیخ التفسیر کی رحلت کا قلق ہر مسلمان نے جس کو دین سے ذرا سا بھی تعلق ہے، محسوس کیا۔ حضرت والد کا وجود نہ صرف آپ کے لئے ایک نعمت تھا بلکہ اہلِ پاکستان کے لئے آفات و مصائب میں ایک سہارے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اہلِ بصیرت، ان کی برکات کا مشاہدہ کرتے تھے، اس لحاظ سے یہ پوری قوم کے لئے بڑا سانحہ ہے۔

حضرت والد کی زندگی تو دینی خدمت اور ہر لمحہ عبادتِ خداوندی میں گزرتی تھی اس لئے اللہ ربّ العزّت نے انھیں ہر قسم کی عزّت، آرام اور درجات عالیہ سے سرفراز کیا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو، اور سب مسلمانوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور ان کی برکات ہمیشہ آپ کے گھر میں رہیں۔ آمین ۔ والسلام

محمّد داؤد

سول لائنز ایبٹ آباد

۳۰ جولائی ۱۹۶۲ء

جناب جسٹس حمود الرحمان جج ہائی کورٹ و صدر اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان

آپ نے حضرت کاندھلوی کے انتقال پُر ملال پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا ہے، اور اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان کا نقصانِ عظیم قرار دیا ہے۔ (۱)

گورنر پنجاب

۲۹ جولائی۔ گورنر پنجاب نے مولٰنا کاندھلوی کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اور پسماندگان کے نام تعزیت کا پیغام بھیجا ہے۔ (جمہوریت ۳۰)

مرکزی وزیر اوقاف و اسلامی امور کا پیام درج کیا جا چکا ہے جو تقریبًا ہر اخبار میں شائع ہوا ہے۔

وزیر اوقاف و جیل خانہ جات پنجاب

۲۹ جولائی۔ مولٰنا کی وفات سے نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ مولٰنا کاندھلوی ممتاز عالم دین تھے۔ اسلام کی سربلندی کے لئے ان کی عظیم جدوجہد اور بیش بہا قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ (امروز ۳۰ جولائی)

---

(۱)۔ جسٹس صاحب کا اصل خط انگریزی میں ہے۔

برّ کوچک ہند و پاک کے تمام دینی مدارس میں حضرت کاندھلوی کے وصال پر تعزیتی جلسے اور ایصال ثواب ہوا۔ دار العلوم دیوبند (سہارنپور۔ یو پی۔ بہار)

حضرت کاندھلوی کے وصال کی اطلاع صبح پاکستان ریڈیو سے نشر ہوتے ہی تمام دار العلوم میں تعطیل کر دی گئی۔ اراکین۔ عہدیداران۔ مدرسین۔ اساتذہ کرام۔ اسٹاف۔ طلباء سب حضرات نے تعزیتی اجلاس منعقد کیا۔ حضرت کی علمی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اور ایصالِ ثواب کیا گیا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

(روزنامہ مغربی پاکستان میں لطیف شیخ کا مقالہ)

جامعہ اشرفیہ کو دینی درسگاہوں میں ایک منفرد حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس درسگاہ سے ایسے ایسے عالم دین فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں کہ ان کے علم کی روشنی سے زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی کے ایسے ایسے چراغ منور ہوئے جنھوں نے اپنی تابانی سے ایک عالم کو متاثر کیا۔

عقائد میں ثبات، ایمان میں پختگی اور اصول میں استقامت سے ڈٹے رہنے کا جذبہ اس دینی درسگاہ کے عظیم مبلغ۔ کہنہ مشق استاد حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی ذات ستودہ صفات کا اعجاز رہا ہے، گزشتہ روز آپ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تو اپنے ساتھ ایسی یادوں کے سرمایہ کو بھی لے گئے جو ان کے مداحوں، ان کے شاگردوں اور ان کے پیروکاروں کو زندگی کے سنگلاخ سفر میں رلاتی رہیں گی۔

سچ ہے کہ ہم سب کو کسی نہ کسی دن اپنے خالق حقیقی کے فرمان کے مطابق اس جہانِ رنگ و بو سے کوچ کرنا ہے۔ کوئی آگے کوئی پیچھے جانا سب کو ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم رکتا ہے اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے، ایک روایت تھے، ایک تاریخ تھے، ایک داستان تھے ایک شمع محفل تھے، ایسی شمع محفل جن کے پروانے اس کے گل ہونے پر آج بھی اس کے روحانی فیض کی تابانی پر اسی طرح نثار ہیں جس طرح ان کی زندگی میں۔

موصوف دنیائے اسلام کے معتدر عالم اور ایک بلند پایہ محدث تھے، آپ قیام پاکستان سے قبل دارالعلوم کے شیخ التفسیر رہے اور پاکستان میں جامعہ اشرفیہ لاہور کے تاحال شیخ الحدیث تھے۔ آپ کے ہزاروں شاگرد عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں

بھٹو حکومت کا زوال اور مولینا کاندھلویؒ

(از حکیم مولوی انیس احمد صدیقی)

مسٹر بھٹو کی فاسق اور فاجر حکومت سے حضرت کاندھلویؒ کو ایک روز بھی کسی قسم کی خوش فہمی نہیں ہوئی۔ حضرت کاندھلوی نماز پنجگانہ کے علاوہ اوقات مستجاب اور مقاماتِ مستجاب، تہجد اور حرمین شریفین میں بھی اس حکومت کے زوال وفنا اور کتاب سنت کے مطابق خلافت راشدہ کے طریقے پر نظام حکومت قائم ہونے کی دعائیں فرماتے تھے اور یقیناً اس حکومت کے زوال میں حضرت کاندھلوی کی دعاؤں کا بھی خاص حصہ ہے۔

حضرت نے اسلامی مشاورتی کونسل کی ممبری بادل ناخواستہ بعض متعلقین کے عرض کرنے اور اصرار کرنے پر قبول کرلی تھی کہ اسلامی مشاورتی کونسل میں ایک ایسے شخص کا شامل ہونا مفید اور ضروری ہے جس کے علم وفضل کا بلا تفریق اعتراف کیا جاتا ہے اور اس کونسل میں آپ کی وجہ سے زائغین اور زنادقہ کے افکار کی تردید اور استیصال بھی ہوتا رہے گا۔ مولینا کوثر نیازی نے تعزیت کے بیان میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ حضرت کاندھلوی اسلامی مشاورتی کونسل کی رکنیت قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ انھوں نے اپنی دلی خواہش کے خلاف یہ منصب قبول فرمایا تھا۔

حضرت نے کونسل میں اپنا فرض ادا کیا۔ کونسل کے بعض ارکان حکومت کی خیر خواہی میں یہ سفارشات پیش کرنا چاہتے تھے کہ زکوٰۃ کا روپیہ بھی حکومت وصول کرے اور اس فنڈ پر بھی حکومت اجارہ داری قائم کردی جائے۔ حضرت نے فرمایا پہلے حکومت خلافت راشدہ کی منہاج پر قائم کریں، اس کے بعد زکوٰۃ کی وصولی کے لئے بیت المال قائم ہو پھر یہ نیک کام کریں۔ اس وقت عوام پر بے شمار ٹیکس لگے ہیں جن میں اکثر شریعت کے اعتبار سے ناجائز ہیں۔ اس لئے موجودہ صورتِ حال میں زکوٰۃ کی وصولی حکومت کے لئے ہرگز مناسب نہیں۔ حضرت کے اس استدلال

سے دوسرے ارکان بھی صحیح صورتِ حال سمجھ گئے۔ حضرت کاندھلوی کو زیادہ وقت نہیں مل سکا لیکن حضرت کا اسلامی مشاورتی کونسل کے متعلق عام تاثر مایوسانہ تھا۔ اسلامی مشاورتی کونسل کی سفارشات کی حیثیت تجاویز اور سفارشات سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا دائرہ عمل دائرہ اختیار اور اس کی ہیئت قائمہ میں بنیادی اصلاح کی ضرورت تھی۔

بھٹو حکومت کا زوال اگرچہ ملت اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق، عظیم قربانیوں اور مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں ہوا ہے، لیکن اس میں حضرت کاندھلوی کی دعاؤں کے علاوہ آپ کی تقریروں اور تحریروں کا بھی خاص حصہ ہے، مولینا محمد مالک صاحب شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، جانشین صاحبزادہ حضرت کاندھلوی کا طرز عمل وقف کمیٹی کی رکنیت سے انکار، شراب پینے کی سزا پر تنقید شدید اور تحریک کے نہ ملنے میں ریڈیو اور ٹی وی پر تقریر سے انکار، حضرت کاندھلوی کے اتباع اور پیروی کا مظہر ہے۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق صاحب زاد اللہ مجدہ کی جس نے چند تاریخی تقریریں سنی ہیں وہ ان سے اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ آواز قلب مومن کی آواز ہے اور یہ ایسے دل و دماغ کے افکار ہیں جس کی پرورش اسلامی ماحول اور اسلامی معاشرے میں ہوئی ہے اور تربیت میں بزرگوں کی خاص توجہات و عنایات شامل ہیں۔ ۵

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
کہ بخشی جس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

جنرل ضیاء الحق کے اعزا و اقارب میں کئی اصحاب حضرت حکیم الامت مولینا اشرف علی تھانوی سے عقیدت اور نسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے میں یہ دعوی کر سکتا ہوں کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں کتاب و سنت کی تخم ریزی حضرت شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی نے فرمائی اور اس کی آبیاری کے لئے جنرل ضیاء الحق کو ہمت عطا فرمائی اور آپ کی مارشل لا حکومت جاء الحق و زھق الباطل کا مصداق بن گئی، جنرل صاحب پر "مردے از غیب برون آید و کارے بکند" پوری طرح صادق ہے

میں یہاں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت کاندھلویؒ نے بھٹو جیسے شخص کی فاسق وفاجر حکومت کو ختم کرنے کا مشورہ بہت پہلے دے دیا تھا۔ مولنیا اپنی کتاب نظام اسلام میں فرماتے ہیں

امیر سلطنت کی اطاعت اس وقت تک واجب ہے کہ جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کا مطیع اور فرمانبردار اور قانون شریعت کا پابند رہے اور اندرون ملک عدل وانصاف کو قائم رکھے۔ (ص ۴۴)

اگر امیر سلطنت ضروریات دین اور قطعیات اسلام کا انکار کرنے لگے اور صریح کفر پر اتر آئے تو اس کا مقابلہ اعلیٰ ترین جہاد ہے۔ (ص ۴۵)

جو صدر مملکت قانون حکومت کی بالادستی کو تسلیم نہ کرے اور سلطنت کے دستور اور قانون کو واجب العمل نہ سمجھے تو وہ قانوناً لائق معزولی ہے۔ اس طرح اسلامی حکومت کا فرمانروا اگر قانون شریعت کو واجب الاتباع نہ سمجھے تو وہ شرعاً لائق معزولی ہے۔ (ص ۴۹)

اگر امیر مملکت فسق وفجور اور معاصی میں مبتلا ہے، سو وہ معاصی اگر اس کی ذات تک محدود ہوں تو شرعاً اس کے تحمل کی گنجائش ہے اور اگر وہ ان معاصی کا علی الاعلان مرتکب ہو اور دوسروں کو بھی قولاً یا عملاً ان کے ارتکاب پر آمادہ کرتا ہو تو یہ بھی قریب قریب کفر اور ارتداد کا ہے۔ ایسے امیر کا بھی مسلمانوں پر معزول کرنا فرض اور واجب ہے۔ ایسی حالت ناقابل تحمل ہے، اس لئے کہ معاصی کا علی الاعلان ارتکاب دین اسلام کے منہدم کرنے اور بے آبرو بنانے کے مرادف ہے۔ (ص ۴۹ تا ۵۰)

بھٹو صاحب کا لاہور کے جلسہ عام میں شراب پینے کا اقرار۔ اور حالیہ بیان جوانی میں کون عیش نہیں کرتا۔ بھٹو صاحب نے آئین پاکستان کی جو مٹی پلید کی ہے اور عدل وانصاف کا جس طرح جنازہ نکالا ہے اور خاص اپنے رفقار کار۔ جے۔ اے رحیم تاری، ارشاد حنیف رامے وغیرہ کے ساتھ جو بدسلوکی اور ظلم کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے، ڈاکٹر نذیر احمد اور خواجہ رفیق احمد وغیرہ کا قتل اس کے علاوہ ہے۔

حضرت کاندھلویؒ کی تالیف نظام اسلام مع دستور اسلام ایک نہایت مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ علماء اور سیاسی قائدین کو اس کتاب سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہیئے۔ خاص طور پر جب کہ پاکستان میں

نظام مصطفیٰ جاری وساری کرنے کے لئے فضا ہموار ہے۔

اس مضمون کے لکھنے کا محرک یہ واقعہ ہے کہ بھٹو حکومت کے خلاف تحریک میں علماء کا ایک وفد راولپنڈی جا رہا تھا، ناچیز بھی شریک سفر تھا، ایک عالم نے کہا معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جنرل ضیاء الحق دیندار، پابند صوم وصلوات آدمی ہیں اور حضرت تھانوی سے عقیدت ونسبت رکھتے ہیں۔ ایسا شخص بھٹو جیسے بھٹو جیسے فاسق اور فاجر کے زیر اثر کس طرح آگیا۔

دوسرے عالم نے جواب دیا کہ حضرت تھانوی کے یہاں صرف خانقاہی سلسلہ رشد وہدایت ہے وہ فرماتے ہیں۔ ولا تلقوا بایدکم الی التھلکہ خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت کا مطلب غلط ہے اور نہ حضرت تھانوی نے اس قسم کی کوئی بات فرمائی ہے۔ اس کے بعد خود بخود اللہ تعالیٰ نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ جنرل ضیاء الحق وہ ایک مرد مومن اور اسم بامسمیٰ ہیں۔

——— انیس احمد صدیقی

مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان کا مولانا ادریس کاندھلوی مرحوم کو خراج تحسین

لاہور ۵ اگست، مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان کے زیر اہتمام بعد نماز ظہر مورخہ ۴ اگست مسجد بلال پرانی انارکلی لاہور میں مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کے ایصال ثواب کے لئے جلسہ تعزیت منعقد ہوا جس میں مولانا مرحوم کے شاگردوں اور متوسلین نے شرکت کی۔ مولانا مرحوم کے خصوصی شاگرد حکیم انیس احمد صدیقی اور مولانا مشرف علی تھانوی نے موصوف کے علم وفضل اور دینی خدمات پر روشنی ڈالی اور حاضرین کو مولانا کے بعض ایسے واقعات سنائے جن سے ان کے زہد وتقویٰ کا اندازہ ہوتا ہے۔

(امروز لاہور ۷۶-۸-۵)

معذرت اور شکریہ

حضرت والد ماجد اعلی اللہ مقامہ کا یہ تذکرہ جس میں آپ کے احوال۔ علمی آثار اور تاریخ کے خاص واقعات کا ذکر ہے معذرت کے ساتھ پیش کر رہا ہوں اس لئے کہ صاحب تذکرہ کا جو بلند مقام اہلِ علم کے نزدیک ہے یہ تذکرہ اس حیثیت اور درجہ کا نہیں ہے اور نہ ہی اس میں حضرت کے علمی اور تحقیقی کارناموں پر روشنی ڈالی جاسکی ہے۔ آپ نے تفسیر معارف القرآن میں جو معارف اور علوم بیان فرمائے ہیں۔ ان کے مختصر تعارف کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہے اسی طرح علم حدیث اور دوسرے علوم کی عظیم الشان عالمانہ اور محققانہ خدمات کی تفصیل کیلئے دفاتر کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ اگر توفیق عطا کی تو یہ ناچیز اپنے خصوصی رفقار احباب اور بزرگوں کے تعاون سے یہ کام بھی ضرور انجام دے گا۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں جن حضرات نے تعاون فرمایا ان سب کا شکریہ ادا کرنا نہایت ضروری ہے، خاص طور سے برادر مکرم مولٰنا محمد مالک شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ اور مولٰنا محمد طفیل جالندھری (ساکن حال اوکاڑہ) اور حکیم انیس احمد صدیقی کا دل کی گہرائیوں سے شکرگزار ہوں، اگر یہ حضرات میرے ساتھ تعاون نہ فرماتے تو میرے لئے یہ تذکرہ آپ کے سامنے پیش کرنا ممکن نہ تھا۔

والد صاحب کے تلامذہ سے استدعا ہے کہ ان کے پاس درس کے زمانے کی جو تحریریں اور علمی تقریریں جو بھی موجود ہوں وہ مجھے مستعار دے دیں، میں نقل کے بعد مسودات واپس کردوں گا۔ فقط

محمد میاں صدیقی